آج

٦٨

ذکیہ مشہدی — سنیل گنگوپادھیائے — شنکھ گھوش

نِلنجن ہاجرا — زاہد امروز — انیس اشفاق

اخلاق احمد — معظم شیخ — خالد طور

ترتیب:

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ترجمے:

افضال احمد سید

تلنجن باجرا

شائستہ فاخری

۶۸

آج

ترتیب: اجمل کمال

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 68

اکتوبر 2010

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 600 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 70 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

ذکیہ مشہدی

7

ماں

20

بدّو کا ہاتھی

30

فضلو بابا ٹخ ٹخ

39

تھوڑا سا کاغذ

48

منظوروا

59

محمود و ایاز

87

گلی سرمست میں رمضان

96

لپاگو

❁

Scanned with CamScanner

سنیل گنگوپادھیائے

109

کیرتی ناشا کے دو کنارے

شنکھ گھوش

147

یہ دریا اکیلا جسم زرہ بکتر
بلاعنوان مدہوش چیکپے
پانی بھیڑ پتھر جوانی
ایک نیگرو دوست کو خط باؤل

نِلنجن ہاجرا

156

نظمیں

❁

زاہد امروز

163

غیر متوقع بچے کی متوقع موت
تم مسجد کے سائے میں سوکھ جاؤ گے
شہری روشنیوں میں وحشی خواب

Scanned with CamScanner

ڈوبتا سورج اور خالی قبر
رات اور چاند کی سنگت میں
قطب شمالی کا موسم سرما

انیس اشفاق
172
اعراف

اخلاق احمد
191
مارٹن کوارٹرز کا ماسٹر

معظم شیخ
206
بلّو

خالد طور
214
سکائی لیب

Scanned with CamScanner

305

ہاں گگن

320

انتظارِ خواب

Scanned with CamScanner

ذکیہ مشہدی

ماں

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہڈیوں کے آر پار ہو گیا۔

کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، اس پر مہاوٹیں بھی برسنے لگیں۔ پتلی ساڑی کو شانوں کے گرد کس کر لپیٹے ہوئے منّی کو خیال آیا کہ اوسارے میں ٹاپے کے نیچے اس کی چاروں مرغیاں جو دبک کر بیٹھی ہوں گی، ان پر ٹاپے کے سانکوں سے پھوار پڑ رہی ہوگی۔ بیمار پڑ کر مر گئیں تو دوبارہ خریدنا بہت مشکل ہوگا۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے ٹٹر ہٹایا اور باہر آ گئی۔ بارش نے جیسے ہر طرف باریک ململ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ سورج پہلے ہی کئی دن سے نہیں نکلا تھا، اس پر یہ چادر۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔ دن تاریخ مہینے تو ویسے بھی اسے کم ہی یاد رہا کرتے تھے، اب صبح شام بھی بھول چلی تھی کیا؟ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ سورج نکلا بھی ہوتا تو کیا اب تک بیٹھا رہتا! رات تو آ ہی گئی تھی۔ ہاں پہلے ہی پہر ایسی اندھیری اور اداس نہ ہوتی شاید۔ اس نے ٹاپا اٹھا کر مرغیوں کو دبوچا۔ ڈرے سہمے پرندوں نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ بازو میں چاروں مرغیاں اور بغل میں ٹاپا دبا کر وہ مڑ ہی رہی تھی کہ اچانک دور پھوار اور اندھیرے کے دوہرے پردے کے پیچھے سے کوئی ہیولا ابھرتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چنگاری سی بھی چمکی۔ ذرا سی دیر کو اسے لگا، اگیا بیتال ہے۔ لیکن اگیا بیتال ہندو ہوا تو مرگھٹ میں اور مسلمان ہوا تو قبرستان میں، آنکھیں مٹکاتا، لوگوں کو راستہ بھلاتا گھومتا ہے۔ زندوں کی بستی میں اس کا کیا کام! وہاں اپنے اگیا بیتال بہتیرے ہیں۔ منّی ڈری نہیں، اور ڈرتی وہ تھی بھی نہیں۔ رات کے سناٹے میں ہرہر کرتی گنگا کے درمیان پھیلے پڑے

دیئرا[1] کے اس علاقے میں وہ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ اور لوگ رہتے تو تھے لیکن جھونپڑیاں دور دور تھیں؛ درمیان میں کھیت تھے یا سبزیوں کے وسیع و عریض قطعے۔ شام پڑے سیار ہُوا ں ہُوا ں کرتے۔ مرغیوں کے فراق میں لومڑیاں دروازے پر کھسر پسر کرتیں۔ کبھی آنگن میں لگے امرود کے درخت سے سل سل کرتا ہرا ہرا سانپ رسی کی طرح نیچے لٹک آتا اور گردن اٹھا کر اپنی ننھی ننھی، چمکیلی، بس بھری آنکھیں منی کی آنکھوں میں ڈال کر اسے گھورتا، لیکن ڈرانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ وہ پاس پڑی لکڑی اٹھا کر اسے دھمکاتی، ''ارے اب کیا لے جائے گا رے؟ ہرسیا سے زیادہ زہر ہے کیا تجھ میں؟'' منی کے حساب سے اس کا آٹھ سالہ پولیو زدہ لڑکا اور پانچ پانچ سال کی دونوں جڑواں، مریل لڑکیاں سانپ کے کسی کام کے نہ تھے۔ تینوں بچوں کو چوزوں کی طرح پروں تلے دبا کے وہ بڑی طمانیت سے اپنی اور ان کی روزی روٹی کی فکر میں غلطاں گھومتی رہتی۔

صبح چار بجے، تڑکے، جب سورج نکلا بھی نہ ہوتا اور گرمیوں میں سرکتی رات کے ملگجے اندھیرے یا جاڑوں میں کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی گنگا سوئی ہوئی ہوتی، مچھوارے اپنا اپنا جال نکالتے تھے اور ان کی ناویں تڑپتی مچھلیوں سے بھر جایا کرتی تھیں۔ تب اور لوگوں کے ساتھ منی بھی اپنا ٹوکرا لیے پہنچتی اور مچھلیاں بھر کر حساب چکتا کرتے، آٹھ بجتے بجتے پار جانے والی ناؤ پکڑ کر شہر پہنچ جاتی۔ سر پر ٹوکرا اٹھائے محلے محلے مچھلی بیچ کر کوئی دو ڈھائی بجے تک لوٹ آتی۔ راستے سے ضرورت کا سودا سلف بھی اٹھا لیتی۔ کبھی کبھار ایک آدھ مچھلی بچ جایا کرتی تھی۔ منافع ہو نہ ہو، جمع نکل آئے، یہ سوچ کر وہ اکثر بچی ہوئی مچھلی بہت کم داموں میں ہرسیا کو بیچ دیا کرتی تھی۔ گھاٹ سے اترتے ہی ہرسیا کا چائے کا کھوکھا تھا۔ وہ آتے جاتے اسے چھیڑتا، مفت کی چائے آفر کرتا، لیکن مچھلی کے دام اس نے کبھی پورے نہیں لگائے۔ جانتا تھا، مچھلی ٹکنے والی چیز نہیں اور منی جیسے غریب بیوپاری میں نقصان اٹھانے کا بوتا نہیں ہوتا۔ چائے کے کھوکھے کی آڑ میں پکی کے ساتھ تلی مچھلی بیچنے والا وہ ان پڑھ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے بزنس ایگزیکیٹو سے کم سیانا نہ تھا۔

منی ذات کی ملاح نہیں تھی لیکن پچھلے بارہ تیرہ سال سے دیئرا میں اپنی اسی جھونپڑی میں

---

[1] دیئرا کسی دریا کے درمیان ابھر آنے والی خشکی کو کہتے ہیں جو کم و بیش مستقل ہوتی ہے۔ گویا ایک ایسا جزیرہ جو سمندر میں نہ ہو کر دریا میں ہو۔

Scanned with CamScanner

رہنے اور شوہر کے موٹر بوٹ چلانے کے پیشے کی وجہ سے وہ گنگا اور گنگا میں بسی مچھلیوں کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں جانتی تھی۔ پندرھویں برس میں وہ بیاہ کر یہاں آئی تھی۔ اسے گنگا ماں سے پہلے ہی بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ ان کے آنچل میں رہنے کو ملے گا، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اور اب تو روزی روٹی کا ذریعہ بھی گنگا ماں ہی تھی۔ ادھر اس نے بڑی مشکل سے کچھ پیسے بچا کر مرغیاں خریدی تھیں، کہ بچوں کو انڈے کھلا سکے۔ اس کا پہلوٹھی کا لڑکا صرف اس لیے مر گیا تھا کہ اسے دوا کے ساتھ اچھی غذا بھی چاہیے تھی۔ اس کی یاد آتی تو کلیجے میں ہوک اٹھتی۔ شادی کے پہلے سال ہی پیدا ہو گیا تھا۔ زندہ ہوتا تو آج کتنا بڑا اسہارا ہوتا گیارہ بارہ برس کا وہ بیٹا۔

سرد ہوا کے برے نے ہڈیوں میں چھید بنائے۔ منی کو محسوس ہوا جیسے اسے بخار چڑھ رہا ہو لیکن تجسس ٹھنڈ پر حاوی ہو گیا۔ اس سن سن کرتے دیرا میں، جہاں گنگا کو چھو کر آتی یخ بستہ ہواؤں کے بیچ سیار بھی ہواں ہواں بھول کر ماندوں میں دبک گئے تھے، یہ کون تھا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا تھا؟

ایک چنگاری پھر چھوٹی۔ ''منی، او منی!'' قریب آتی روشنی نے اس کا نام لے کر پکارا۔

وہ ہڑ بڑا گئی۔ سردی، بغل میں دبے ٹاپے اور دوسرے بازو میں سمٹی مرغیوں کو یکسر بھول کر وہ باہر نکل آئی اور انھیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

''آپ؟ اس وقت یہاں؟ اندر آ جائیے مالک، بڑی ٹھنڈ ہے۔''

لانبے قد اور دبلے پتلے جسم پر انھوں نے حسبِ دستور دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ ہاں پتلے کرتے کی جگہ گاڑھے کی موٹی پوری آستینوں والی قمیص تھی اور سر پر انگوچھا لپٹا تھا۔ بس یہی ان کی جڑاول تھی (اور گاؤں میں اس سے زیادہ جڑاول بہت سے لوگوں کے پاس نہیں تھی)۔

''اوسارے میں رات کاٹنے کی اجازت چاہیے، منی۔ صبح نکل لوں گا۔'' وہ مسکرائے لیکن آواز میں مسکراہٹ کی نہیں بلکہ بجتے دانتوں کی آہٹ تھی۔

''اندر آ جائیے، مالک۔''

''اندر؟'' وہ ذرا سا ہچکچائے۔

''ہاں، مالک۔ یہاں اوسارے میں تو بڑی ہوا ہے۔''

وہ پیچھے پیچھے چل پڑے تو منی کو محسوس ہوا، اس کے گھر میں فرشتوں کے قدم اترے ہیں یا گنگا

Scanned with CamScanner

ماں ایک انسان کی شکل اختیار کر کے اس کی جھونپڑی میں آن اتری ہیں۔ زہے نصیب۔ اس نے ٹاپا ایک کونے میں رکھ کر مرغیوں کو جلدی جلدی اس کے نیچے دھکیلا اور بوری سے امرود کی خشک ٹہنیاں، پتے اور کچھ اپلے نکالنے لگی۔

''کچھ اور مت کرو، منی۔ بس رات کے لیے چھت چاہیے تھی۔ اب اور نہیں چلا جا رہا تھا۔'' وہ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ انھوں نے کندھے سے لٹکا ہوا جھولا اتارا، ٹارچ اس میں رکھی اور وہیں مٹی کے فرش پر کٹے درخت سے دھپ سے بیٹھ گئے۔

''آپ کچھ مت بولیے۔'' منی کا جی بھر آیا۔ ''ہمارے پاس جو ہے وہی تو دے سکیں گے، نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ،'' اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ وہ خاموش ہو گئے۔

''مالک، کپڑے بھیگ گئے ہیں،'' کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی اس نے کہا۔ اس کی پشت ان کی طرف تھی۔

منی کے پاس کپڑے کہاں ہوں گے جو وہ بدل سکیں، اس لیے انھوں نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ حالانکہ اس وقت خشک کپڑوں، خشک جسم اور ہوا سے محفوظ خشک جگہ سے زیادہ ایسا کچھ نہ تھا جسے جنت کا نام دیا جا سکے۔ (ہر شخص کی جنت اس کی اپنی ہوتی ہے، اور موقع محل کے اعتبار سے ہوتی ہے شاید۔)

''میرے پاس میرے پتی کی ایک دھوتی رکھی ہوئی ہے،'' ان کی خاموشی کا مطلب بھانپ کر اس نے کہا۔

''تب تو ٹھیک ہے۔ صبح تک میرے کپڑے سوکھ گئے تو اسے چھوڑ جاؤں گا،'' انھوں نے رضامندی ظاہر کی۔ منی خوش ہو گئی۔ اس نے گھر کے واحد کمرے کی کارنس پر رکھا ٹین کا بکسا اتارا۔ یہ بکسا اس کا شوہر پٹنہ کے سومواری میلے سے لایا تھا، اور اس میں رکھ کر لایا تھا اس کے لیے لال پھولوں والی ساڑی۔ منی اب لال پھولوں والی ساڑی نہیں پہنتی تھی۔ اسے شوہر کی واحد دھوتی کے ساتھ سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ اسے تو وہی پہنے گی... لنگڑے سے شادی کرنے کی ہمت کرنے والی اس کی بہو۔ وہی اس کی اصل حقدار ہوگی۔

اس نے جلدی سے دھوتی نکالی، مبادا وہ اپنا ارادہ بدل دیں۔ دھوتی انھیں تھما کر وہ پھر اندر چلی

Scanned with CamScanner

گئی۔ گیلے کپڑے اتار کر انھوں نے الگ رکھے۔ خشک دھوتی آدھی باندھ کر، آدھی کو اوپر کے جسم پر اوڑھ لیا۔ اب وہ ایک بودھ بھکشو جیسے نظر آرہے ہوں گے، سوچ کر ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

گاڑھے کی دھوتی نے بڑی راحت پہنچائی۔ گیلے کپڑوں سے نجات پا کر اسے پہننے کا سکھ الفاظ سے پرے تھا۔

''خدا اس نیک دل عورت کا بھلا کرے،'' انھوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔

دعا تو ان کے جھولے میں سب کے لیے تھی، اور محبت بھی، لیکن نہ سب کا پیٹ بھر پاتا، نہ بیماریاں دور ہوتیں؛ نہ منی کے شوہر کی واپسی ہو پاتی جسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی کسی کی اس مخبری پر کہ وہ نیپال سے کتھے کی اسمگلنگ میں شامل ہے۔ واپسی تو بڑی بات، ساڑھے پانچ سال کا طویل وقفہ گزر جانے کے بعد یہ تک پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، ہے بھی یا نہیں ہے۔ منی کبھی بھول سکتی ہے کیا کہ انھوں نے کس طرح سال ڈیڑھ سال تک اس کے شوہر کا پتا لگانے اور اس چھڑوانے کے لیے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا۔ آخر منی نے ہی ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا، ''بھگوان، اب ہم نے صبر کر لیا، آپ بھی چھوڑ دیجیے۔ ہمارے بھاگیہ میں سہاگ ہوگا تو وہ خود آجائیں گے۔ کہیں جو وِدھاتا نے ہمارا سیندور پونچھ دیا ہوگا تو کوئی کیا کرے گا!''

شوہر کی گرفتاری کے پہلے سے ہی اس کا پہلوٹھی کا بیٹا بیمار رہا کرتا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد گھر پر جو مصیبت آئی، اس میں اس کی بیماری کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ تب منی انھیں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے دروازے پر آئے۔ کسی نے انھیں بتایا کہ اس گھر میں ایک بیمار بچہ ہے۔ بچے کو دیکھ کر وہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا بہت ضروری تھا، لیکن ڈاکٹر صرف بدھ کو ملیں گے۔ اس دن جمعہ ہی تھا۔ اس بچے کو دوا کے ساتھ غذا کی بھی سخت ضرورت تھی۔ خالی دوا سے کچھ نہ ہوگا، انھوں نے تاسف سے سوچا تھا۔ انتہائی کمزور ہوتے ہوئے بچے کو گود میں لیے آنسو بہاتی منی ان دنوں دو وقت بھر پیٹ کھانا تک مہیا نہیں کرا پاتی تھی۔ جڑواں بچیاں اس کے پیٹ میں تھیں۔ آٹھواں مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کر پاتی۔ خود اسے بھرپور غذا کی ضرورت تھی لیکن وہ دونوں بچوں، خاص طور پر پہلوٹھی کے بیمار کے لیے پاگل بنی رہتی۔

Scanned with CamScanner

''منی، میں بدھ کو پھر آؤں گا،'' انھوں نے کہا۔ ''تمھارے بچے کو اسپتال لے جانے کی سخت ضرورت ہے۔'' پھر انھوں نے کندھے سے لٹکا جھولا اتارا (وہی جھولا جو ہمیشہ ان کے کندھے سے لٹکا رہتا تھا اور آج بھی لٹکا ہوا تھا)۔

''یہ رکھو،'' جھولے میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے بیٹنچ کے چار انڈے برآمد کیے اور چھ عدد کیلے۔ یہ تحفے گاؤں میں دو الگ الگ لوگوں نے انھیں دیے تھے۔ وہ سب کے سب انھوں نے بچے کو دے دیے۔ یہ نعمتیں دیکھ کر اس کے زرد چہرے اور بجھتی آنکھوں میں جو چمک آئی تھی اسے منی کبھی نہیں بھول سکی۔ جب بھی اس کے جانے کا غم ستاتا، وہ مسرت کی اس چمک کو یاد کرتی تو دکھتے دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑ جاتی۔ اپنی زندگی کے آخری دو دنوں میں اس کا بچہ بہت خوش تھا۔ وہ اس دنیا سے خوش خوش گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں کھانا تھا، وہ بھی اچھا کھانا۔ بدھ کے دن جب وہ اسے لینے آئے تو اس کی راکھ ہوائیں اُڑا چکی تھیں اور ننھا سا اَدھ جلا جسد خاکی گنگا کے پانیوں میں گم ہو چکا تھا۔ لیکن منی نے ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ ''اس نے بڑے چاؤ سے انڈے کھائے۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر ایک کیلا چھوٹے کو بھی دیا۔ سب آپ کی کرپا تھی۔ وہ بھوکا جاتا تو ہم جتنے دن زندہ رہتے، تڑپتے رہتے۔'' اس کے آنسوؤں نے ان کے پیر بھگو دیے۔ ایسی سخت گرفت تھی کہ ان کے لاکھ چھڑانے پر بھی وہ اس وقت تک نہیں اٹھی جب تک اس کا دل ہلکا نہیں ہو گیا۔

تب ہی انھیں منی کے شوہر کے بارے میں پتا چلا تھا۔ کہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سیا سے کسی تکرار کے سبب اس نے اس کے خلاف مخبری کی تھی۔ جھوٹی یا سچی، یہ معلوم ہونا مشکل تھا۔ نیپال سے تیندو کی پتیوں اور کتھے کی اسمگلنگ بہت عام تھی۔ ہو سکتا ہے وہ صرف موٹر بوٹ چلاتا رہا ہو اور اسے مال کا علم نہ رہا ہو، ہو سکتا ہے ملوث رہا ہو۔ جو بھی ہو، وہ ایک بہت ہی چھوٹی مچھلی تھا جسے بڑی مچھلیاں نگل گئی تھیں۔ اس سلسلے میں انھیں کامیابی نہیں مل سکی لیکن منی احسان مند تھی؛ کسی نے اس کے بارے میں سوچا تو، کچھ کیا تو۔ اس کے دوسرے بچے کو پولیو ہو گیا تھا۔ وہی تھے جو اسے اسپتال لے گئے، آپریشن کرایا۔ اسپتال سے اسے لوہے کا جوتا بنوا کر دیا گیا جس کا فریم گھٹنے تک تھا۔ وہ لنگڑاتا اب بھی تھا لیکن پہلے سے بہت اچھا ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ جس طرح چلتا تھا اسے دیکھ کر کسی کریہہ صورت، پھدکنے والے جانور کی یاد آتی تھی۔ منی کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ کئی بار اسے خیال آتا تھا

Scanned with CamScanner

کہ اوپر والے کو اس کا بیٹا لینا ہی تھا تو اس ٹوٹے پھوٹے کو لے لیا ہوتا۔ صحیح سالم چلا گیا، یہ رہ گیا۔ لیکن پھر ان کی کوششوں سے اب وہ اس لائق تھا کہ اپنے سارے کام آسانی سے کر لے۔ جلد ہی وہ اسے کسی دکان میں بٹھانے کی سوچ رہی تھی۔

لڑکا جب اسپتال سے لوٹا تھا، اس وقت بھی منی نے ان کے پیروں پر سر رکھ دیا تھا۔ شرک و کفر اس کی لغت میں نہیں تھے۔ ہوتے بھی تو ان کے معنی اس کے ذخیرے میں نہیں تھے۔ بھگوان خود اتر کر نہیں آتے، کسی انسان کو بھیج کر ہی کام کراتے ہیں۔ وہ جسے بھیجیں وہی ان کا روپ۔

تسلے میں آگ روشن ہو اٹھی تھی۔ وہ اسے ان کے پاس لے آئی۔ پھر ایک بڑے سے ٹیڑھے میڑھے المونیم کے کٹورے میں دو گلاس پانی، گڑ، آنگن میں لگے تلسی کے پودے سے اتاری پتیاں اور دو چار دانے کالی مرچ کے ڈال کر ابلنے کو چڑھا دیے۔ پانی خوب ابل گیا تو اس نے المونیم کے دو گلاسوں میں 'چائے' ڈھالی اور اپنا گلاس لے کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ گنگا کی ریت سے مانجھے گئے المونیم نے پستہ قد مدھم شعلوں کی روشنی میں چاندی کی طرح لشکارا مارا۔

مالک بڑا کارساز ہے۔ منی کی جھونپڑی راستے میں نہ ہوتی تو وہ ٹھنڈ سے اکڑ گئے ہوتے۔ ان کے لیے تو اس وقت پھوس کی صرف ایک چھت کافی تھی۔ خالی پیٹ میں توانائی دیتا گڑ اور ٹھنڈے جسم میں گرماہٹ بھرتی تلسی اور کالی مرچ کی چرپراہٹ — ایک ایک گھونٹ امرت تھا۔

''جا کے سو جاؤ منی۔ رات بہت ہو چکی ہے۔'' انھوں نے نرمی سے کہا۔

''سب لوگ آپ کے بارے میں بہت باتیں کرتے ہیں۔ کبھی من ہوتا تھا، ہم آپ کے پاس بیٹھیں۔''

''معلوم ہے۔ اور لوگ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ بھی معلوم ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''کیا معلوم ہے؟''

''میں سوالوں کے جواب دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی انسان ایسا مل جاتا ہے جو نئے سرے سے سارا کچھ پوچھنے لگتا ہے۔ تم بھی سب پوچھنا چاہتی ہو گی کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، میرا کنبہ کہاں ہے، گزارہ کیسے چلتا ہے، یہاں کیوں رہتا ہوں — ہے نا؟''

منی نے سادہ لوحی سے سر ہلایا۔

Scanned with CamScanner

وہ ہنس پڑے۔ ''چلو، تم بھی سن لو۔ میرے ماں باپ اب نہیں رہے۔ جب میں یہاں آیا تھا، تب تھے۔ بھائی بہن ہیں، دوست احباب ہیں، لیکن میں ان سب کو بہت دور چھوڑ آیا ہوں۔'' انھوں نے قدرے توقف کیا۔ ایک محبوبہ بھی تھی۔ امیدوں کے چراغ روشن کیے، مستقبل کے خواب دیکھتی... میں نے اس کی دنیا تہہ و بالا کر دی۔ اسے بھی چھوڑ آیا۔ لیکن یہ انھوں نے منی سے کہا نہیں اور بات کا سرا پھر پکڑا۔

''وہ سب باری باری مجھے کچھ پیسے بھیجتے رہتے ہیں۔ ان سے میرا گزارہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی مدد کے لیے کچھ بچا لیتا ہوں۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، پھر بھی کبھی بھوکا نہیں سوتا ہوں۔ تم میں سے بھی جن لوگوں کے پاس کچھ ہے اور وہ مجھے دینا چاہتے ہیں تو لینے سے انکار نہیں کرتا۔ کبھی کوئی گوالا ایک لوٹا دودھ تھما دیتا ہے تو کوئی گرہست کلو آدھ کلو سبزی۔''

''وہ تو آپ دوسروں کو بانٹ دیتے ہیں۔''

''جو مجھے ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے یا مجھے درکار نہیں ہوتا، بس وہی۔ اب ابھی تمھاری تلسی کی چائے کی سخت ضرورت تھی۔ وہ میں کسی کے ساتھ نہ بانٹتا!'' انھوں نے بچوں جیسی معصوم اور شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ منی نے سر کھجایا۔ ان کی ضرورت سے زیادہ ان کے پاس کیا ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے! ابھی کوئی آ جائے تو آدھی چائے تو اسے پلا ہی دیں گے۔

''آپ... آپ کا پریوار؟''

''میرا پریوار تم لوگ ہو۔ آس پاس کے چاروں گاؤں میرا پریوار ہیں۔''

''بال بچے پیچھے چھوڑ آئے؟''

''میرا کوئی بال بچہ نہیں۔''

''عورت؟''

''عورت نہیں ہے، اسی لیے بال بچہ بھی نہیں ہے۔ مگر ان گاؤں کے، جہاں میں کام کرتا ہوں، سارے بچے میرے بچے ہیں۔ تمھارے بچے بھی منی۔''

منی کے تینوں بچے گدڑی میں لپٹے گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کا جی بھر آیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ باہر ہوا زیادہ پاگل ہو اٹھی تھی۔ کسی چڑیل کی طرح سیٹیاں بجاتی، ہائیں ہائیں کرتی، گنگنا

Scanned with CamScanner

ماں کی زلفوں میں لہروں کے گھنگھرو ڈالتی، شرارت پر آمادہ ٹھنڈی بخ ہوا۔ ''بڑی ٹھنڈ ہے'' کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس نے پھر آنکھیں اٹھائیں۔

''تو آپ نے بیاہ کیا ہی نہیں؟''

''منی، آج تم اتنے سوال کیوں کر رہی ہو؟''

''آج ہی تو آپ کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا ہے، مالک۔''

''کتنی بار کہا، مجھے مالک کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو'' وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔ ''ہاں، میں نے بیاہ نہیں کیا۔'' جواب دے ہی دیں ورنہ یہ بیوقوف مچھوارن دماغ چاٹتی رہے گی۔ ان کا لہجہ معمول کے مطابق نرم اور پُر سکون تھا۔

تو عورت کا سکھ انھوں نے کبھی نہیں جانا! اور نہ جانے کون کون سے سکھ نہیں جانے، بیوقوف مچھوارن نے سوچا۔ بانس کے ٹٹر کی جھونپڑی میں اکیلے رہتے ہیں۔ ایک پتیلی میں آلو اور چاول ساتھ اُبال لیتے ہیں۔ اپنی تھالی خود مانجھنا، اپنے کپڑے خود دھونا۔ سائیکل کو کھڑکھڑاتے گھومتے پھرتے رہنا۔ اپنے دیس میں ضرور ان کے پاس موٹر ہوگی، صورت سے ہی بڑے گھر کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہاں ... سنا تھا ایک بار اکیلے پڑے بخار میں بھن رہے تھے۔ سنجوگ سے کوئی اُدھر جا نکلا۔ پرلے گاؤں کے مسلمانوں کے یہاں کا لڑکا تھا۔ وہ انھیں اٹھالے گیا۔ سنا ہے، اس سے کہا کہ میں مر جاؤں تو کوئی پرپنچ نہ کرنا۔ جو کپڑے پہنے ہوں، انھیں میں لے جا کے میری جھونپڑی میں گاڑ دینا۔ وہاں ایک کاپی پڑی ملے گی۔ ہو سکے تو اس میں لکھے پتے پر خبر کرا دینا، اور بس۔ کیا اس کے شوہر نے بھی کسی کو اپنا پتا دیا ہوگا؟

شوہر کو یاد کر کے اس کے دل میں ٹیس اٹھی — ایک بے رحم ٹیس۔ وہ جب آتا تو منی کھانا تیار کر کے رکھتی، لپک کر لوٹے میں پانی نکال کر دیتی۔ اس کے سامنے اتنی تنگی نہیں تھی۔ روکھا سوکھا سہی، لیکن دونوں وقت بھر پیٹ مل جایا کرتا تھا۔ پھر رات میں پوال کے بستر میں موٹی چادر تلے کالو ہی سکھ۔ پتا نہیں وہ اب اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں۔ اس کی موت کی اطلاع دینے کے لیے کسی کے پاس شاید کوئی پتا نہ تھا۔ مگر جب اس کے پاس تھا، بہت خوش تھا۔ جب دل میں ٹیس اٹھتی ہے وہ یہ یاد کر کے تسلی دیتی ہے خود کو، کہ اس نے بڑی خوش و خرم زندگی بسر کی۔ منی نے اسے بھرپور سکھ دیا۔ بالکل ایسے

Scanned with CamScanner

ہی جیسے اسے جب بیٹے کی یاد آتی ہے تو وہ اس کی یادوں میں ایک مٹھاس پاتی ہے؛ ایک طمانیت کہ زندگی کے آخری دو ڈھائی دنوں میں اسے کچھ اچھا کھانے کو ملا تھا، پھل ملے تھے۔ ایسا نہ ہوا ہوتا تو اس کی یادیں صرف کلیجہ پھاڑتیں، کلیجے پر کوئی پھاہا نہ رکھتیں۔ وہ آج بھی لوٹ لوٹ کر روتی ہوتی۔

''آپ کا سر سہلا دوں؟ نیند نہیں آ رہی ہے نا؟'' اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خالی گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''تم خود سو جاکے۔ سویرے سویرے مچھلی لانے نکل پڑو گی۔ جاؤ یہاں سے،'' انھوں نے قدرے ڈپٹ کر کہا۔

یہ اب بھی میرے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ منی کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی، پھر کچھ چھپٹیاں تسلے میں ڈال کر اندر جا کر بچوں کے ساتھ گڑی مڑی ہو کر گدڑی میں گھس گئی۔ اپنی کتھری تو اس نے ان پر ڈال دی تھی۔ یہاں ایک گدڑی میں چار نفر ہو گئے تھے۔ بچوں کو ڈھکنے کی کوشش میں وہ خود بار بار کھل جاتی۔

کوئی دو بجے ٹھنڈ کے شدید احساس سے وہ پوری طرح جاگ گئی۔ ہوا کچھ ایسے شائیں شائیں کر رہی تھی جیسے ہزاروں بھتنیاں اپنے گھاگھرے سرسراتی گنگا پر سے گزر رہی ہوں یا پھر کنارے جلتی چتاؤں سے اٹھی ناآسودہ روحیں۔ گنگا ماں کے شور میں بھی کچھ ناراضگی تھی جیسے دوآبے کے میدانوں میں اترنے کے بعد بھی وہ پہاڑی ڈھلانوں سے گزر رہی ہوں — تیز، تند، غضبناک۔ کبھی نہ ڈرنے والی منی اس وقت کچھ خوفزدہ ہو اٹھی — کس چیز سے، یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سانپ امرود کے پتوں میں دبکا خود ہی ڈرا بیٹھا تھا اور اوسارے میں ایک بہت ہی نیک پاکیزہ انسان سویا ہوا تھا۔ پھر اسے کس چیز کا ڈر تھا؟

وہ کچھ بے چین سی، ان کے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی سانسوں کے زیر و بم اور ہلکے خراٹے گہری نیند کے غماز تھے۔ کچھ لمحوں بعد وہ وہیں بیٹھ گئی۔ تسلے کی آگ بجھ کر بہت سی راکھ چھوڑ گئی تھی لیکن راکھ کے اندر انگارے تھے اور راکھ گرم تھی۔ اس نے ایک ٹہنی سے اسے کریدا تو چنگاریاں اڑیں۔

کچھ دیر تک وہ اپنی کثرتِ استعمال سے پتلی پڑتی ساری کے پلّو سے خود کو لپیٹ کر کچھ

Scanned with CamScanner

سوچتی رہی، پھر دھیرے سے ان کے بغل میں سرک آئی۔ سخت محنت سے گٹھا ہوا، اٹھائیس سالہ جوان جسم کمان کی طرح تنا اور پھر چراغ کی طرح لو دینے لگا۔

آدم کے ساتھ حوا کا تخلیق کیا جانا کچھ ایسا بے مقصد تو نہ تھا۔

'مالک، جانے بغیر دنیا مت چھوڑیے گا۔ آتما بھٹکے گی۔ یہ سکھ ... بھوگیے نہ بھوگیے، جان تو لیجیے ایک بار...''

ان کی آنکھ کھل گئی۔ چمکیلی سیاہ آنکھوں والی روہو مچھلی جیسی وہ لانبی، چھریری، گٹھی ہوئی سڈول عورت ان کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑی تھی۔ چاروں طرف گھنٹیاں بج رہی تھیں... ٹن ٹن ٹن ٹن... خطرے کی، مصیبت کی، اور کسی انہونی پیشین گوئی کی، موسیقی سے لبریز لیکن ڈراونی... اور پورا جسم طوفان کی زد میں آئی ناؤ کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔

مہاتما بدھ ویسے تو اہنسا کے پجاری تھے لیکن کوئی کشکول میں گوشت ڈال دیتا تو کھا لیتے۔

لیکن کیا جب مار نے انھیں گمراہ کرنے کے لیے اپنی بیٹیوں کو بھیجا تو وہ انھیں شکست نہیں دے سکے تھے؟ کیا انھوں نے اپنی خواہشوں پر مکمل قابو نہیں پا لیا تھا؟

میں مہاتما نہیں ہوں۔ میں بدھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے عرفان کہاں حاصل ہوا ہے؟ عرفان کی تلاش میں تو میں نکلا بھی نہیں ہوں۔ ہاں، اگر بنی نوع انسان کی خدمت سے عرفان ملتا ہے تو شاید کبھی مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ اور کیا سوچتے تھے کن پھٹے جوگی کہ عورت کا سکھ ویسا ہی ہے جیسا آتما کے پرماتما میں ضم ہونے کا سکھ۔ مرنے سے پہلے ایک بار اگر جان لوں کہ یہ ہوتا کیا ہے تو برا کیا ہے؟ میں نے شراب کا سرور جانا ہے۔ اچھے بھر پیٹ کھانے، گہری نیند، ماں کی گود، عورت کی محبت —— ان سب سے آگاہ ہوں، صرف اس کا جسم ہی نہیں جانتا۔ شاید میں پوری طرح خود پر قابو نہیں پا سکا ہوں ورنہ اس تخ رات میں یہ شعلے نہ بھڑکتے۔ اب تک تو دھکا دے کر اس سل سل کرتی مچھلی کو واپس گنگا میں پھینک دیا ہوتا۔

شعلے پہلے بھی کئی مرتبہ بھڑکے تھے —— آخر وہ انسان ہی تو تھے —— لیکن انھوں نے پھنکار کے پانی سے انھیں بجھا دیا تھا۔ ہر بار کفارے کے لیے انھوں نے تین دن لگاتار روزے رکھے تھے، مسلمانوں کے روزوں سے بھی زیادہ سخت روزے؛ مسلمانوں سے زیادہ سخت یوں کہ روزہ کھول کر

Scanned with CamScanner

بھی وہ بھر پیٹ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کبھی کبھی تو محض اُبلے آلو یا کھیرا ککڑی کھا کے رہ جاتے تھے۔

ابھی حال ہی کی تو بات ہے۔

ان دنوں ڈیرا کے اس پار والے گاؤں کی باری تھی۔ وہ ایک بیمار شخص کو ہسپتال میں دکھا کر واپس گھر پہنچ رہے تھے۔ وہاں کنویں پر گاؤں میں بیاہ کر آئی نئی بہو سُنندا کھڑی تھی۔ پانی نکالنے کے لیے اس نے ایک پیر خوب آگے بڑھا کر جسم کو تان رکھا تھا۔ سنہری، پکے گندم جیسی جلد والے ستھرے، سڈول پیر پر اس کا واحد زیور، چاندی کی پائل بہت ہی بھلی لگ رہی تھی۔ بالٹی کھینچتے ہوئے سنندا کے پورے جسم میں ارتعاش تھا۔ لگتا تھا، ماں باپ کے گھر وہ کنویں سے پانی نکالنے کی عادی نہیں رہی تھی۔ اس کی ساڑی جسم سے سرک سرک گئی تھی۔ گدبدا، قدرے بھاری، گداز جسم بلاؤز میں سے چھلکا چھلکا پڑ رہا تھا۔ ان کی نظریں اس کے خوبصورت پیر پر ذرا کی ذرا رکیں اور پھر سرسر کرتی سیدھی گردن تک پہنچ گئیں۔ سنندا کے جسم کا ارتعاش ان کے اپنے جسم میں منتقل ہو گیا۔ انھوں نے خود پر لعنت بھیجتے ہوئے نظریں ہٹائیں۔ لیکن وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ نظریں جتنی دیر ٹھہری تھیں وہ وقفہ مناسب سے بہت زیادہ تھا اور جو وقفہ گزرا تھا وہ 'صحیح' نہیں تھا۔ وہ نظریں محض خدا کی ایک حسین تخلیق کی ستائش کرتی نظریں نہیں تھیں ... وہ ایک مرد کی نظریں تھیں جو ایک عورت کی ستائش کر رہی تھیں۔ انھوں نے خود پر کفارہ واجب کیا، کیونکہ ان کا ضمیر ان سے جو سوال کر رہا تھا اس کے لیے ان کے پاس خاطر خواہ جواب نہیں تھا۔

مچھلی نے اپنی کالی چمکیلی، کاجل بھری آنکھوں سے انھیں پھر دیکھا۔ ترشنا لے کر دنیا سے مت جاؤ سنیاسی ... جان لو کہ تم کیا نہیں جانتے۔ یہ تسلی بھی کر لو کہ جس نفس کو تم نے قابو میں کیا ہے وہ بڑا بے لگام، منھ زور گھوڑا ہے۔ بعد میں اپنی پیٹھ ٹھوکتے رہنا۔ مگر ایک بار ... صرف اس بار ...

اس لمحے نے مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ان پر حملہ کر بیٹھا، جیسے نیپال میں برف پگھلنے کے بعد طغیانی پر آئی بے بضاعت گنڈک خونخوار ہو کر طاقتور گنگا پر چڑھ دوڑتی ہے اور گنگا اپنی تمام تر غضبناکی کے باوجود کروٹیں بدل بدل کر اسے اپنے اندر ضم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ جو ہوا وہ کیا تھا — وہ ایک برا خواب تھا یا ایک اچھا خواب؟ بڑی دہشت کے ساتھ ان کی عقل و فہم نے بتایا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی، اور

مزید دہشت ناک بات یہ تھی کہ نیند کے جالے صاف ہو جانے کے بعد قلب وذہن پر سرور کی کیفیت طاری ہو رہی تھی، جسم ایک پر کیف درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ روح پر کبھی نہ مٹنے والے نشان پڑ گئے تھے۔ ان کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ ساری ریاضت مٹی میں مل گئی تھی اور انھیں یہ اچھا لگ رہا تھا۔

منی ان سے پہلے اٹھ چکی تھی۔ اس ٹھنڈ میں کنویں سے پانی کھینچ کر وہ نہا چکی تھی اور ان کے لیے مٹی کے چولھے پر چائے چڑھا چکی تھی۔ اس کی ستھری آنکھوں میں کوئی پشیمانی نہیں تھی، گناہ کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بس ایک طمانیت تھی، ایک سکون تھا۔ اس کی محبوب ہستی اس کے دروازے پر آئی تو اس نے اس کے کشکول میں وہ ڈال دیا جو اس کے پاس تھا — نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ۔ اس نے مٹی کی رکابی میں بھوبل میں بھنی شکر قند اور المونیم کے گلاس میں چائے لا کر رکھ دی۔ انھوں نے شکر قند سرکا کر چائے کا گلاس اٹھالیا۔

چائے پی کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

جھونپڑی کے دروازے پر وہ روبرو ہوئے۔

منی نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ''اب کبھی رکنے کو نہیں کہوں گی بھگوان۔ ڈریے گا نہیں۔''

''باقی ساری زندگی صرف ایک وقت کھانا کھا کر آج کی رات کا کفارہ ادا کروں گا۔'' انھوں نے دھیرے سے کہا۔ ''مگر تمھارا شکر گذار رہوں منی ماں... ہمیشہ رہوں گا۔'' انھوں نے اچانک جھک کر اس کے پیر چھو لیے۔ ''رکنے کو کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ علاقہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

وہ ٹھنڈ سے سکڑی، نم، دھواں دیتی تاریک صبح میں تیزی سے گم ہو گئے۔

❋❋

Scanned with CamScanner

ذکیہ مشہدی

ہڈّو کا ہاتھی

ہڈّو نے پیپل کے پتوں کے بڑے بڑے جھنکاڑ رکشے سے اتارے، کثیف کرتے کی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری برآمد کی، احتیاط سے گن کر رکشے والے کا کرایہ ادا کیا، بقیہ رقم واپس رکھی، پھر بڑی محنت سے موٹی موٹی ڈالیاں کھینچ کر انھیں احاطے کے اندر لائے۔

ہاتھی نے کسل مندی سے سونڈ دائیں بائیں جھلائی، پھر قدرے تکلف کے ساتھ بھاری بھر کم پاؤں آگے بڑھائے۔

''ارے بیٹا رک! اس سے قبل کہ لوگ تیرا حصہ کھا جائیں، یہ لے لے۔'' ہڈّو نے بڑی محبت سے ہاتھی کو مخاطب کیا اور کندھے پر لٹکے انگوچھے کے سرے پر بندھی پوٹلی کھولی۔ پوٹلی میں چار عدد دوستی روٹیاں اور کوئی پانچ سات حلوے کی ٹکلیاں؛ ان میں صرف ایک چنے کی تھی اور باقی سوجی یا میدے کی۔

ہاتھی نے قریب آ کر اپنا بھاڑ سا منھ کھول دیا۔ ہڈّو نے چاروں روٹیاں اور حلوہ ایک ساتھ لپیٹ کر اس میں ڈالے تو اونٹ کے منھ میں زیرہ والے محاورے میں ذرا سی ترمیم کر دینے کو جی چاہا۔ ہاتھی نے پھر بھی تاڑ کے پتوں جیسے بڑے بڑے کان جھلے اور املی کے چیوں جیسی ننھی ننھی آنکھوں سے ہڈّو کو انتہائی ممنونیت اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ ہڈّو نہال ہو اٹھے۔ ساتھ ہی ان کے دل میں ایک کچوٹ سی اٹھی۔ بیچارہ ہاتھی! استطاعت ہوتی تو کیا آج اسے وہ ٹوکرا بھر کر حلوہ روٹی نہ کھلاتے! یا پھر میوے والا روٹ اور گڑ کی بھیلیاں۔

Scanned with CamScanner

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے بیوی چلائیں۔

''ارے اس کمبخت کو ڈھائی گھڑی کی آوے! بچے کھا لیتے حلوہ روٹی، جو اس کے پیٹ میں ڈال دیا۔ اس کالے پہاڑ کا کوئی بھلا نہ ہو اور بچے محروم رہ جائیں۔''

''بچے ہیں کہ راون کی فوج؟ اپنا حصہ کھا چکے۔ یہ ہمارا حصہ تھا، ہم جسے چاہیں دیں،'' ہدّو گرجے۔

''ہم جسے چاہیں دیں!'' بیوی نے منھ ٹیڑھا کر کے ان کی نقل کی۔ شاید انھیں کوئی معقول جواب نہیں سوجھا تھا، اس لیے منھ چڑانے پر اکتفا کی۔

''نیک بخت، اوقات میں رہا کر! شوہر کا منھ چڑاتی ہے؟ جہنم میں جائے گی۔ صبح تین چار گھروں سے حصے آئے۔ سب تیرے یہ سپوت اڑا گئے۔ ہم نے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا۔ گئے تھے اسحٰق صاحب کے یہاں۔ ان کی اہلیہ، خدا انھیں جنت نصیب کرے، بولیں، 'سید ہادی حسن، آئے ہو تو فاتحہ تمھیں پڑھ دو۔' ہم نے فاتحہ پڑھی تو اس کا حصہ انھوں نے الگ سے دیا۔''

''اوئی نوج مردوئے! اسحٰق میاں کی بیوی زندہ، جوان جہان، انھیں کہہ رہا ہے، خدا جنت نصیب کرے!'' ہدّو کی بیوی ایسی دہشت زدہ ہوئیں کہ ذرا دیر کو تو ہاتھی کو حلوہ روٹی کھلا دیے جانے کا غصہ بھی بھول گئیں۔

ہدّو نے شانِ بے نیازی سے ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اڑا رہے ہوں۔ ''ارے یہ تو دعا ہے، جاہل عورت۔ زندگی میں ہی دے دینے میں کیا حرج ہے؟ آخر کبھی تو مریں گی اسحٰق میاں کی جورو۔ تم بھی ابھی سے ہمارے لیے دعا مانگا کرو کہ اللہ جنت نصیب کرے۔ بڑے گناہ سمیٹ رہے ہیں۔ اپنے غریب بیچارے ہاتو کو پیٹ بھر کھانا بھی نہ دے پاتے۔''

پھر وہی ہاتھی، بلکہ مارے محبت کے 'ہاتو'، وہ بھی بیچارہ غریب! بیوی کی ایڑی میں لگی اور چوٹی میں بجھی۔ وہ چھنکیں۔

''بیوی بچوں کا پیٹ تو بھر لو پہلے! لٹکے رہتے ہو اس منحوس ہاتھی کی دم میں۔ شب برات کے شب برات فاتحہ خوانی کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔ اور فاتحہ خوانی بھی اب کہاں۔ جب سے تبلیغی جماعت والوں کا زور بڑھا ہے، محلے میں فاتحہ کرانے والے گھر بھی بس دو چار ہی رہ گئے ہیں۔ نہ جلیبے

جلوس میں ہاتھی بلایا جائے نہ تم کچھ کر کے دو۔''

''کیوں کریں ہم کچھ اور؟ دادا پردادا کے وخت سے یہی فیلبانی کرتے آرہے ہیں۔ اور فاتحہ کیا ہم کسی لالچ میں کرتے ہیں؟ ارے لوگوں میں عزت ہے، سید ہیں ہم اور راجہ کے فیلبان ہیں۔ کبھی کبھار لوگ فاتحہ کے لیے کہہ دیتے ہیں۔'' بکتے جھکتے بدّو ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔

''تمھارے دادا پردادا کو بھی کچھ اور نہیں ملا تھا کرنے کے لیے! بھلا بتاؤ، سادات اور فیلبانی!'' بیوی نے پھر جل کر منھ مارا۔ ''خیر، خود جو بھی کیا، تمھیں کچھ اور ہنر سکھا جاتے۔ ہم تو کہیں، اب بھی اللہ مارے بوڑھے بھوت کو وہیں پٹخ آؤ اس موئے راجہ کے ... اور کوئی ایسا کام سنبھالو کہ گھر میں چار پیسے جڑیں۔''

ہاتھی کی شان میں کسی قسم کی گستاخی بدّو کو سخت ناپسند تھی بلکہ تقریباً ناقابلِ برداشت۔ ہاتھی ان کے اجتماعی لاشعور کا ایک حصہ تھے۔ ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ سلطنت جونپور کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے۔ شاہی کے وقتوں میں یہ ایک بڑا معزز عہدہ تھا۔ بدّو کے ذہن کے نہاں خانوں میں ہاتھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ گھومتے پھرتے تھے۔ وہ ان سب کو گومتی کے پانیوں میں نہلاتے، ان کے لیے میوہ اور گڑ بھرے روٹ تیار کراتے، گنوں کی پھاندیاں اترواتے اور پیار سے ان کے سوپ جیسے کانوں میں محبت بھرے نرم و شیریں الفاظ اتارتے کہ اڑیل سے اڑیل ہاتھی بھی پالتو کتے کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا۔

یہ ہاتھی کے اٹھ کھڑے ہونے کا بھی ایک الگ قصہ تھا۔

چودھویں صدی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ لوگ باگ دہلی کے تاج سے کرکٹ کھیل رہے تھے (اگرچہ کرکٹ اس وقت رائج نہیں تھا)۔ کمزور مرکز پا کر جو جہاں گورنر مقرر کیا گیا تھا، فرمانروا بن بیٹھا تھا، یا کم از کم بن بیٹھنے کے پھیر میں تھا۔ سلطنت جونپور بھی کئی اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی طرح معرضِ وجود میں آگئی۔ بانی تھے سلطان الشرق ملک سرور خواجہ جہاں، جو فیروز شاہ کے وقت میں ہی مشرقی علاقوں کے گورنر بنائے گئے تھے اور باوجود اس کے کہ خواجہ سرا تھے، نہایت لائق و فائق انسان تھے۔ صرف پانچ برس کے دورِ حکومت میں (کہ قضا و قدر نے اس سے زیادہ مہلت نہیں دی)

Scanned with CamScanner

جونپور کو دارالسرور بنا گئے۔ آگے چل کر شاہجہاں نے اسے 'شیرازِ ہند' کے لقب سے نوازا۔

اس وقت قلعۂ فیروز شاہی میں ہاتھی گھوڑوں کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ کوچ کا نقارہ بجنے پر فوجیں کوچ کیا کرتی تھیں: دمادم، دمادم۔ شفاف سڑک پر صبح خاکروب جھاڑو لگاتے اور شام کو بہشتی مشکوں سے چھڑکاؤ کرتے۔ سوندھی سوندھی خوشبو اڑتی تو عالموں کی ٹولیاں نکلتیں، خراماں خراماں۔ ڈھال گر ٹولہ میں لوہار ڈھالیں بنانے میں مصروف ہوتے اور درسگاہوں میں طالب علم اپنے ذہن کو جلا بخشتے۔ درسگاہوں نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ایک صدی بعد شیر شاہ جیسا مدبر، ذہین اور رعایا پرور بادشاہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا۔ (ڈھال گر ٹولے میں اب غریب مسلمان بیڑی بناتے ہیں اور ٹی بی میں مبتلا ہو کر قبل از وقت مر جایا کرتے ہیں۔ جونپور کے کسی مدرسے میں اب کوئی شیر شاہ پڑھنے نہیں آتا۔)

دہلی میں طوائف الملوکی کے اس دور میں جناب امیر تیمور صاحبقراں نے بھی اپنی ترچھی آنکھیں ہندوستان کی طرف پھیریں۔ بڑے بڑے شہر، بشمول دہلی، اجاڑ ہوئے، جیسے کوئی نہایت منحوس الّو بول گیا ہو۔ صاحب علم و اوصاف لوگ عزت اور جان و مال کی حفاظت کے لیے بھاگ بھاگ کر نسبتاً پرامن علاقوں میں اکٹھا ہوئے، جن میں جونپور بھی تھا جو دارالسرور کے بعد دارالامان بھی قرار دیا گیا تھا۔ ان ہی دنوں علی گڑھ سے ہجرت کر کے، جو اس وقت 'کول' کے خوبصورت نام سے جانا جاتا تھا، ایک باریش بزرگ ایک مسیں بھیگتے نوجوان کے ساتھ، جو اُن کا پوتا تھا، ہاتھی پر سوار، جونپور سے تین میل دور موضع فیروز شاہ پور میں وارد ہوئے۔ (جونپور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد یہ موضع ان کے کاغذات میں 'فروشی پور' درج ہوا، جسے بعد میں عوام نے 'پڑوسی پور' بنا دیا۔) یہ بزرگ ان مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے بھٹنیر کے قلعے کے باہر ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر تیموری سپاہ سے جنگ کی تھی اور شکست یقینی جان کر زن و بچہ قتل کر کے 'جوہر' کی رسم ادا کی تھی۔ زندگی باقی تھی، خود بھی بچ گئے اور یہ پوتا بھی جوان کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ میں شریک تھا۔

سید، عالم دین اور نہایت پاکباز ہونے کے سبب بزرگ جونپور میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ اس وقت سلطنت کا فاؤنڈیشن اسٹون نصب کر کے خواجہ جہاں راہی ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ منھ بولا بیٹا مبارک شاہ تخت پر تھا۔ بزرگ کو مبارک شاہ نے ایک قطعہ اراضی دیا جس پر انھوں نے مدرسہ قائم

Scanned with CamScanner

کیا۔ کچھ عرصے بعد ان کا ہاتھی مر گیا تو سلطان نے ہاتھی بھی عنایت کیا۔ اطراف کا ایک بچ گوتی راجپوت بزرگ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسلام قبول کیا اور اپنی بیٹی ان کے پوتے کے نکاح میں دی۔ بزرگ 'ہاتھی والے سید صاحب' مشہور ہو گئے، اس لیے کہ فیروز شاہ پور سے جونپور آتے تو ہاتھی پر سوار ہو کر ہی آیا کرتے۔ جونپور اب شرقی سلطنت کا صدر مقام تھا۔

سید صاحب کا ہاتھی ایک دن جونپور میں اڑ گیا۔ اٹالہ چوک پر بیٹھا تو بس بیٹھے بیٹھے گھنٹوں کان جھلتا رہا، اٹھنے کا نام نہ لے۔ لاکھ مہاوت نے آنکس کے ٹہوکے دیے، پچکارا، سارا فن آزما لیا لیکن زمین جنبد، آسمان جنبد، نہ جنبد فیل سید۔ تب ان کے پوتے کے پانچ سالہ بیٹے نے، جس کی ماں نسلاً راجپوتنی اور مذہباً مسلمان تھی اور جو پردادا کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر سیر کرنے چلا آیا تھا، ہاتھی کے گلے میں ننھے ننھے ہاتھ ڈال کے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ہاتھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ قصہ کچھ ایسا زبان زدِ خاص و عام ہوا کہ لڑکا بڑا ہوا تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اس کے پردادا کی زمینوں میں اضافہ کر کے اسے فیل خانے کا مہتمم مقرر کیا۔ سید ہادی حسن عرف ہدّو میاں کے کرم خوردہ شجرے میں فیل خانے کے مہتمم اور پڑوسی پور کے زمیندار سید سنجر حسین کا نام بالکل صاف لکھا نظر آتا ہے۔

ہاتھی کے پیٹ میں اتنا سارا حلوہ اور اصلی گھی لگی دوتی روٹیاں اپنی آنکھوں کے سامنے جاتے دیکھ کر ہدّو کی اہلیہ کے کلیجے میں دھواں اٹھا تھا اور اب تک اٹھے جا رہا تھا۔ خالی برتن کھڑ کھڑ کا کر وہ مسلسل اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہدّو پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر انھوں نے پیر پٹخے۔ ''اب ہم خود جائیں گے پڑوسی پور اور اس کلموہے اللہ مارے ہاتھی کو چھوڑ آئیں گے وہاں۔ کوس کوس کے تھک گئے، مرا بھی نہیں۔ اب جائے وہاں سفیدے کے درخت روندے۔ اس موئے راجہ کے سفیدوں کو کیڑے لگیں، سوکھا مار جائے!''

یہ 'سفیدے کے درختوں' کا بھی ایک قصہ تھا۔

ہدّو کی بیوی کو سفیدے کے درختوں سے سخت چڑ تھی، جس میں وہ حق بجانب تھیں۔ ان کی زندگی کے منظر نامے پر سفیدے کے درخت لکھے جانے سے پہلے زندگی اتنی بے ہنگم اور تاریک نہیں تھی۔ پڑوسی پور کے زمیندار بھیرو سنگھ کے یہاں ایک خستہ حویلی، کچھ زمینیں اور ایک عدد ہاتھی، خاتمۂ زمینداری کے خاصے عرصے بعد تک برقرار تھے۔ 'راجہ صاحب' کا لقب بھی برقرار تھا جو بیوقوف رعیت

نے انگریزوں کے زمانے میں ان کے بزرگوں کے ہاتھ زمینداری آنے پر انھیں عنایت کیا تھا۔ اس وقت حویلی نہایت حسین اور بارونق ہوا کرتی تھی۔ ڈیوڑھی پر تین تین ہاتھی جھولتے تھے جن پر آٹھ ملازم مقرر تھے۔ ان کی خاص مہاوت کی سفارش پر ایک نواں ملازم مقرر کیا گیا۔ یہ ہدّو کے پردادا کے والد تھے۔

سید سنجر حسین، مہتمم فیل خانہ شاہی اور محض تین ہاتھیوں پر مشتمل معمولی سے فیل خانے کے ایک معمولی ملازم کے درمیان گومتی میں بہت سارا پانی بہہ چکا تھا!

راجہ صاحب نے اپنے بچپن کے دوست گیا کے نواب احمد علی خاں سے خاصا سبق سیکھا تھا۔ ان کے ہاں ہاتھی کے ساتھ رولز رائس بھی تھی۔ بچپن میں نواب صاحب کے لیے انگریز گورنس ہوا کرتی تھی۔ محل میں پچاس سے تین اوپر کمرے تھے لیکن وہ مرے تو ان کا گھر ایک کوٹھری پر مشتمل رہ گیا تھا۔ ہاتھی اور رولز رائس، محل سمیت، نہ جانے کن لوگوں کی جیبوں میں سما گئے تھے۔ انگریز گورنس کی جگہ ایک چندھی بڑی بی تھیں جو پرانے وقتوں کے احسانات نبھانے کے لیے دو وقت روٹی ڈال جایا کرتی تھیں۔ سبزی بعض اوقات کافی نہیں ہوتی تھی۔ نواب صاحب ایسے میں چائے سے روٹی کھا لیا کرتے یا صرف اچار پر اکتفا کیا کرتے۔

راجہ صاحب نے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ دو تو امریکہ میں جا بسے اور ایک باہر سے فلم سازی کی تربیت لے کر بمبئی میں مقیم ہوا۔ اشتہاری فلمیں بنانے والا یہ نوجوان اپنے پیشے میں کافی کامیاب ہوا اور چند سال پہلے گاؤں آیا تو ضد کر کے باپ کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔ شکستہ حویلی کی گرتی دیواریں پوری طرح گروا کر ملحق زمین سے اسے ملا دیا اور وہاں سفیدے کے درخت لگوا دیے کہ یہ نہایت منفعت بخش سودا ہے۔ شاگرد پیشہ کی دو کوٹھریاں رہنے دیں۔ ان میں اپنی پسند اور بھروسے کے مطابق دو جوان صحت مند کارندے مقرر کیے۔ باقی لوگوں کو، ہدّو اور ہاتھی سمیت، نکال باہر کیا۔ راجہ صاحب کو ہاتھی سے بے حد لگاؤ تھا اور ہدّو کو اس سے جو محبت تھی اس کے بھی معترف تھے، اس لیے ہاتھی کو بیچنے کی تجویز پر کسی طرح راضی نہ ہوے۔ ہاتھی ہدّو کو سونپ کر جونپور میں ایک 'غیر مقیم ہندوستانی' دوست کے بنگلہ نما مکان کے احاطے میں اس کی رہائش کا انتظام کرایا اور ماہ بہ ماہ اتنی رقم بھیجنے کا وعدہ کیا جو ہاتھی اور ہدّو کی کچھ کفالت ضرور کر سکے۔

Scanned with CamScanner

اب تھا یہ کہ گاؤں میں حویلی کے شاگرد پیشے میں رہنے کے بہت فائدے تھے۔ پھل پھلاری، سبزی ترکاری کی بہتات تھی، جو چھوٹی رانی صاحبہ فراخ دلی سے ملازموں میں تقسیم کرتی رہتی تھیں۔ ہدّو کے بچوں کے لیے عید بقرعید میں نئے کپڑے بن جاتے تھے۔ ہدّو فصل پر کٹائی اور دائیں میں مدد کر دیتے تو بہت سا غلہ مل جایا کرتا تھا۔ نقدی زیادہ ہاتھ میں نہ آنے پر بھی فراغت کی زندگی تھی۔ جو تین بچے اس دور میں پیدا ہوئے وہ نہایت صحت مند تھے؛ جونپور آ کر پیدا ہونے والے باقی تین نہایت مریل۔ اب تو تینوں بڑے بچوں کے گال بھی پچک گئے تھے۔ وہ اٹالہ مسجد کے پاس کے اقلیتی ادارے کے چھٹی کے اوقات میں چہار دیواری پھلانگ کر اندر گھس جاتے اور گولیاں اور تاش کھیلتے۔ گھر آتے تو ایسے بھوکے ہوتے کہ بس چلتا تو ہنڈیاں برتن توڑ کے کھا جائیں۔ اس وقت ہدّو کی بیوی کا جی چاہتا کہ وہ سفیدے کے درختوں میں آگ لگا آئیں یا ہاتھی کی تکا بوٹی کر ڈالیں جو بمبئی سے آنے والی قلیل سی رقم کا بیشتر حصہ کھا جاتا تھا۔

ایک آدھ مرتبہ بیوی نے تجویز رکھی، ''ہم ڈھال گر ٹولہ جا کے دیکھ آتے ہیں۔ شاید کہیں بیڑی بنانے کا کام مل جائے۔''

ہدّو بے حد ناراض ہوئے۔ ''اب تم برقع اوڑھ کے گلی محلے کے لونڈوں کے بیچ سٹر پٹر کرتی گھوموگی؟ سیدانی ہو، ذرا یہ تو سوچو۔''

ایک بار بیوی پھر ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ ''ہم تمھاری طرح کھرے سید نہیں ہیں۔ ہماری اماں پٹھانن تھیں۔ اور پھر کام کرنے میں ذات کیسی!'' انھوں نے اسی قدر چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا تھا۔

''سید کی بیٹی ہونا، اور سید کی بیوی بھی۔ بس، بات ختم۔ اماں سے کیا ہوتا ہے؟ اماں سے نسل نہیں چلا کرتی۔''

اماں سے نسل چلتی ہوتی تو بیچ گوتیوں کی بیٹی نے کب کا سیدوں کو راجپوت بنا دیا ہوتا، اور آگے چل کر مغلوں کو بھی۔ بیوی نے حلوہ روٹی کے لیے زیادہ راڑ مچائی تو ہدّو نے اس دریدہ دہن عورت سے کچھ دیر فرار حاصل کرنے میں ہی عافیت جانی اور گھر سے نکل لیے۔ جاتے جاتے ایک نظر ہاتھی پر ڈالی جو مزے سے کڑ کڑ کر کے پیپل کی ٹہنیاں چبا رہا تھا۔ حسبِ دستور پتے دیکھ کر محلے کی دو چار بکریاں بھی آ گئی تھیں اور پتوں پر منھ مار رہی تھیں۔ ہاتھی ان سے کبھی ناراض نہ ہوتا، شانِ

بے نیازی سے یوں دیکھتا جیسے وہ راجہ ہو اور بکریاں اس کی غریب رعایا۔ ایک دوسرے کو سینگوں سے ٹھیلتی بکریوں میں سے دو ایک بکریاں ہاتھی کو دھکے بھی لگا دیتیں تب بھی وہ برافروختہ نہ ہوتا۔ اس کی فراخدلی کو دیکھ کر ہدّو بھی کچھ نہ کہتے۔ اس وقت بھی ایک چھوٹی سی بکری اس کے موٹے موٹے ستون جیسے پاؤں کے بیچ ہو کر سائبان تلے کھڑی جلدی جلدی پتوں پر منھ مار رہی تھی۔ ہدّو کا جی بھر آیا۔

بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلتے ہدّو اٹالہ چوک پر آ کے کھڑے ہو گئے۔ شاندار اٹالہ مسجد سر بلند کیے کھڑی تھی — سبک نہیں بلکہ مست ہاتھی کی طرح مہیب، بھاری رعب دار، مسحور کن۔ ایسا لگتا تھا یہ مسجد ابھی چلنے لگے گی اور اس کے ساتھ چل پڑے گی کل کائنات — دمادم، دمادم — اور شاہی کا وقت پھر لوٹ آئے گا۔

بارونق اٹالہ چوک پر ایک رکشہ اکیلا کھڑا تھا۔ رکشے والا کہیں گیا ہوا تھا۔ شاید چائے پینے یا چائے پی کر پیشاب کرنے؛ یا صبح صبح اسٹیشن سے اچھی کمائی کر لایا تھا اور کہیں بیٹھ کر اسے اڑانے کے لیے پتے کھیل رہا تھا۔ ہدّو وہیں کھڑے ہو گئے، کچھ بے دھیان سے۔ ایک برقع پوش عورت نزدیک آئی۔

''اے رکشے والے، چلو گے؟ حمام دروازہ چلنا ہے۔'' اس نے ہدّو کو مخاطب کیا۔ ہدّو کو جیسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا۔

''ارے ہم تمھیں رکشے والے لگتے ہیں؟ ہم فیلبان ہیں فیلبان! وہ بھی ایسے ویسے نہیں، راجہ کے فیلبان ہیں۔ جا کے دیکھ یاؤ۔ پرلے محلے میں راجہ صاحب کے رشتے دار کی خاصی زمین ہے، ہم اس پر رہتے ہیں۔ وہیں ہمارا ہاتھی کھڑا ہے۔ سب ہمیں جانتے ہیں اور ہمارے ہاتھی کو بھی۔ لگتا ہے تم یہاں نئی ہو، کسی گاؤں گراؤں سے آئی ہو شاید۔''

عورت اس مسلسل بوچھاڑ سے گھبرا گئی۔ اسے یہ شخص کچھ سنکی معلوم ہوا۔ اس نے تیز تیز قدموں سے سٹک لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

ہدّو بُدبُداتے ہوئے لوٹ آئے۔ عورتوں کے پیچھے لگنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ جب ان کا دل زیادہ دُکھتا تو ہاتھی سے باتیں کر کے اسے ہلکا کر لیتے۔ اس وقت انھیں بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ وہ ہاتھی پر چڑھ گئے اور گردن سہلا سہلا کے اس کے کان میں کہنے لگے، ''سنا بیٹا، ایک پگلی سی عورت تھی، پاگل نہیں تو

سنکی ضرور ہی ہوگی، ہمیں رکشے والا سمجھ رہی تھی۔ ارے ہمارے پاس رکشہ کھڑا تھا تو ہم رکشے والے ہو گئے؟ ارے ہم فیلبان ہیں فیلبان۔"

ہاتھی نے بڑے بڑے کان جھل کر مکھیاں اڑائیں۔

"دیکھا ہمارا بیٹا کہہ رہا ہے: اور نہیں تو کیا! سنکی نہیں، پوری پاگل رہی ہوگی۔ چل بیٹا، گومتی چل کے نہلا لائیں تجھے۔ گرمی بہت ہے۔"

بوڑھے ہاتھی نے السائی ہوئی آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں، جیسے کہہ رہا ہو، "اب تمھارا جی چاہ رہا ہے تو لے چلو، چلتے ہیں۔"

تیکھے نقوش اور جلی جلی سی رنگت والے ہدّو نے اٹالہ سے کچھ دور فیروز شاہی قلعے کی چڑھائی پر ہانپتے کانپتے رکشہ آگے بڑھایا تو انھیں بے تحاشا وہ عورت یاد آئی جس نے کچھ عرصے پہلے انھیں رکشے والا سمجھ کر حمام دروازے چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی چھل پیری تھی یا اس کی زبان پر کالا دھبا تھا۔ ویسے کالی زبان تو ہدّو کی بیوی کی بھی رہی ہوگی جو ہاتھی یوں کھڑا کھڑا مر گیا تھا بیچارہ۔ لیکن موت کا ذائقہ تو ہر ذی روح کو چکھنا ہے، ہاتھی ہو یا چیونٹی، اور مرنے کے لیے صرف ایک وجہ کافی ہے: پیدا ہونا۔ اور موت اور پیدائش، ان دونوں کے علاوہ اس دنیا میں نہ کچھ حتمی ہے اور نہ قطعی۔ مزید یہ کہ ہاتھی، جو خاصا بوڑھا ہو چلا تھا، آدھا پیٹ کھا کے زندہ رہنے والے انسانوں کی طرح زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن ہدّو کی تسلی کے لیے ان میں سے کوئی حقیقت کافی نہیں تھی۔ وہ بلک بلک کے رویا کرتے تھے — ایک قلیل سی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ہاتھی کے فراق میں۔ نہایت ایمانداری کے ساتھ انھوں نے راجہ صاحب کو ایک پوسٹ کارڈ لکھوا کے اس کی اطلاع دے دی تھی۔ انھوں نے ہدّو کو کچھ یکمشت رقم بھیجی اور ایک جوڑ کپڑے — یہ ان کے لیے خلعت کا قائم مقام تھے اور ہاتھی کا آخری تحفہ۔

ساری رقم ختم ہو گئی تو ہدّو حاجی رضا علی کے یہاں گئے۔ ان کے یہاں رکشے چلا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک کام چور، ٹی بی کے مریض رکشے والے کو انھوں نے حال ہی میں چھٹی دی تھی۔ اس کا رکشہ انھوں نے ہدّو کو تھما دیا۔ شرمسار اور رنجیدہ ہدّو جب پہلے دن گردن جھکا کے اٹالہ کے رکشہ

Scanned with CamScanner

اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے تو ان کا دل بالکل اچاٹ تھا۔ لیکن تب انھوں نے یاد کیا کہ ابھی کچھ دن پہلے ان کے پاس ہاتھی تھا — سچ مچ کا ہاتھی — اور ان کے شجرے میں کہیں سید سنجر حسین تھے جو شاہی کے وقتوں میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے (اور شیر ازِ ہند جون پور کے مصنف سید اقبال حسین کا کہنا تھا کہ اس وقت شاہی فیل خانے میں ہاتھیوں کی تعداد کم از کم چھ سو ضرور تھی)۔

ثبوت کے طور پر ہاتھی کے دانت بچی دیوار پر آویزاں تھے اور شجرہ بکس میں محفوظ تھا۔

❋❋

ذکیہ مشہدی

فضلو بابا ٹخ ٹخ

صدیوں پہلے کی بات ہے — یا کم از کم ایسا لگتا ہے کہ بچپن گزرے صدیاں بیت گئیں — تب میں اپنے بزرگوں کی گود میں گھس کر کہانیاں سنا کرتی تھی۔ والد کے پرانے دوست اور کلاس فیلو شمسی چچا، پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ (اب مرحوم و مغفور) ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے سر پر سوار ہو گئی۔ ''چچا، کہانی!''

والد اپنی روداد سنانے میں مشغول تھے، جھنجھلا کر بولے، ''دفع ہو، شیطان کی خالہ! ہر وقت کہانی...''

شمسی چچا ہنسنے لگے۔ بولے، ''تمھاری بیٹی ہے، بات منوائے بغیر ٹلے گی نہیں۔ اس کی فرمائش پوری کر دیتا ہوں، پھر اطمینان سے گپ ہو گی۔''

میں ان کی لانبی چوڑی میدان جیسی گود میں باقاعدہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

''سنو، ایک پہلوان تھا۔ نام امیر وخاں طمیر وخاں، لنگڑ چمرِ چاخاخاں، چی وئی وئی۔ اب اگر تم اس نام کو دہرا دو تب تو کہانی آگے سناؤں گا، ورنہ تم فیل اور کہانی ختم۔''

میں نے جلدی جلدی ہانپتے کانپتے دہرایا، ''امیر وخاں طمیر وخاں، لنگڑ چمرِ چاخاخاں، چی وئی وئی۔''

''واقعی شیطان کی خالہ ہے!'' وہ زور سے ہنسے۔ گودی میں بھونچال آ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں فضلو بابا ٹخ ٹخ کے اِکّے میں بیٹھ کر شرافت چچا کے گاؤں جا رہی ہوں اور اِکّہ اُلار ہو گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

''اچھا بھئی چلو، ہم شرط ہار گئے۔ اب آگے کی کہانی سناتے ہیں۔

''ایک بہت بڑا میدان تھا، ہرا بھرا اور شاداب۔ اس کے بیچوں بیچ ایک ہزار میل چوڑی ندی بہتی تھی۔ ندی کا پانی شفاف تھا۔ اس میں بہت سی مچھلیاں تھیں۔ کنارے اُگے درختوں میں رنگ برنگی چڑیاں رہا کرتی تھیں۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے جانور ٹہلتے پھرتے تھے۔ اس ندی کے ایک کنارے وہ رہا کرتا تھا، ارے وہی... امیر و خاں طمیر و خاں... غلاموں کی بہت بڑی فوج اس کے پاس تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر ایک اور پہلوان رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا آلتو خاں فالتو خاں چڑاتے خاں مارتے خاں دونالی خاں بے دھڑک...'' 'بے دھڑک' انھوں نے زور سے ادا کیا۔

میں نے قدرے سہم کر ابا کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے۔ کہانی جاری تھی:

''امیر و خاں طمیر و خاں رات کو اپنی روٹی خود پکاتا تھا۔ جب وہ ہاتھوں پر روٹی بڑھاتا تو اس کی تھاپ ایک ہزار میل چوڑی ندی کے پانیوں سے گذر کر آلتو خاں فالتو خاں کے گھر پہنچتی تو اطراف میں بسے لوگوں کے دل دہل جاتے۔ پیڑوں پر بسیرا کرتی چڑیاں بے چین ہو کر اڑنے لگتیں اور شیر اپنی ماندوں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔''

''پھر؟'' میں نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''پھر اس کے جواب میں آلتو خاں فالتو خاں اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور دوسرا ہاتھ بھرے پیٹ پر پھیر کر ڈکار لیتا... غاؤں... اوں... اوں... اس کی رانیں پیٹنے اور ڈکار لینے کی آواز ایک میل چوڑی ندی کے پانیوں سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچتی اور راستے میں ملنے والے سارے پنکھ پکھیرو آدمی جانور بے چین ہو جاتے۔ کئی سو سالوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔

'''یہ دونوں کشتی لڑ کر خود فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟' گاؤں کے کچھ نیک بزرگوں، پنکھ پکھیروؤں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں نے کہا۔ 'ہمارے دل کیوں دہلاتے رہتے ہیں؟'

'''جب جی چاہتا ہے اپنے غلاموں کو بھیج کر ہمیں پکڑوا لیتے ہیں،' ایک سفید بالوں والے خرگوش نے کہا۔

'''ہمارے گھاس کے میدانوں میں آگ لگا کر اپنی روٹیوں کے لیے گیہوں اُگاتے ہیں،'

Scanned with CamScanner

ہرن کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

''بزرگوں نے تاسف سے سر ہلایا۔'ہم سمجھا بجھا کر ہار گئے، ہمارا ان پر کوئی زور نہیں۔''

اور شاید حالات پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ اسی وقت چچا زوار حسین نازل ہو گئے اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ضرور مارتے خاں بے دھڑک ان ہی کی صورت کا رہا ہوگا۔ ابا اور شمسی چچا ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں شدید کوفت کے ساتھ اندر سنک گئی؛ کہیں چچا زوار حسین رانوں پر ہاتھ مار کر، پیک کے چھینٹے اڑا کر پھر اپنا وہی پرانا قصہ نہ شروع کر دیں جس سے ایڑی میں لگتی اور چوٹی میں بجھتی۔

''اری بٹیا، تو پھر نقل کر کے کلاس میں فرسٹ آ گئی؟''

اس وقت کہانی میں ایسا اڑنگا لگا کہ کہانی ادھوری رہی تو رہ ہی گئی، کیونکہ شمسی چچا دوسرے دن واپس لکھنؤ چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی ٹیڑھی کبڑی تحریر میں انھیں خط لکھا کہ وہ کہانی پوری کر دیں۔

''کہانی کہیں خط میں لکھی جاتی ہے بیوقوف! کہانی تو آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ اسے پکڑوں تو سناؤں،'' انھوں نے جواب دیا۔

بعض واقعات کہیں گہری کسک چھوڑ جاتے ہیں، جیسے اس کہانی کا ادھورا پن، جو آج بھی پھانس بن کر دماغ میں گڑا ہوا ہے۔ اور اب... اب جبکہ میں خود آس پاس گھومتی کہانیوں کو پکڑ پکڑ کر دوسروں کو سناتی رہتی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ اس کہانی کو بھی خود ہی مکمل کر کے اپنے آپ کو سنا دوں تاکہ میرے اندر جو ننھی بچی چھپی بیٹھی ہے وہ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دے۔

بچی ابھی شرافت چچا کے بھیجے ہوئے گنے چوسنے میں مصروف ہے۔

''فضلو... اے فضلو، ہمیں ایک چکر دلا کر لاؤ!'' گنا ختم کر کے وہ فضلو بابا کی آستین پکڑ کر اچھلنے لگتی ہے جو گھوڑے کی لگام پکڑے، اس کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ارے بٹیا، سوجھے (سیدھی طرح) بیٹھو۔ ابھی جائے کو ہے پانچوں پیرن۔ ڈاکٹر تاراچرن کی ماتا جی منت مانے رہیں۔ سو جات ہیں چدّر لے کے۔''

''ہم بھی چلیں فضلو بابا؟''

''پانچ موئی موئی مہرارو ہیں سب جوڑ کے۔ تم کہاں بیٹھیو بٹیا؟'' وہ اکے سے شکر قند کی ٹوکری

Scanned with CamScanner

اتارتے ہیں جو گنوں کی پھاندی کے ساتھ آئی تھی۔ ’’ہے لیو، کھاؤ بھونج بھونج کے۔ سراپھت کے کھیت کی گنجی (شکر قند) بڑی میٹھ ہوت ہے۔‘‘ وہ دوبارہ اِکے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ…

’’فضلو بابا ٹخ ٹخ… فضلو بابا ٹخ ٹخ!‘‘ محلے کے دو چار لڑکے تالیاں بجاتے یکے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ان میں موٹا بیوقوف پریم چند لوہیا سب سے آگے ہے۔ پیچھے سے اسمٰعیل، جو اسمٰعیل پگلا کہلاتا ہے، اسے ٹھوکا دے رہا ہے۔

’’اچھا بچو…‘‘ فضلو بابا پریم چند کی طرف مصنوعی غصے سے چابک لہراتے ہیں۔ ’’اب کے جیہو سگرا کے میلہ!‘‘

پریم چند کھسیانا ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ شہر سے پانچ میل دور سگرا کا میلہ لگا کرتا تھا۔ لوہیا کنبے سے فضلو کا پرانا ربط ضبط تھا، اس لیے ان کا اِکہ پہلے سے ان لوگوں کے لیے بک رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس چھوٹے سے شہر سلطان پور اودھ میں لوگ باگ چار پانچ کوس کے لیے اِکہ تانگہ ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ فضلو کی گھوڑی ہمیشہ صحت مند اور چاق و چوبند رہتی تھی اور اِکہ درست، اس لیے ان کی سواریوں کا حلقہ شہر کے خواص پر مشتمل تھا۔

’’ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ…‘‘ اسمٰعیل کو سگرا کے میلے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس لیے وہ چڑائے جا رہا ہے۔ ’’فضلو بابا ٹخ ٹخ…‘‘

’’اس کمبخت فضلو کو ٹخ ٹخ کا مینگنیا ہے۔ [تائی اماں Mania کو ’مینگنیا‘ کہا کرتی تھیں۔] کوس بھر بھی چلو تو ٹخ ٹخ سنتے سنتے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کب سواری سے بات کر رہا ہے، کب رام پیاری سے، یہ سمجھنا بھی اکثر مشکل ہی ہوتا ہے۔‘‘

بڑی اماں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’طبیعت کمبخت کیا ٹھیک رہے گی۔ اس بلڈ پریشر کا ستیاناس ہو، لگتا ہے لے ڈوبے گا۔‘‘ تائی اماں پردے کے پیچھے سے تفصیل بتانے لگتی ہیں کہ جانا ضروری تھا ورنہ گھر سے نہ نکلتیں۔ ’’اس وقت بھی سر بھاری ہو رہا ہے۔‘‘

’’کا ہو، آج سیر سیر ے گھاس ناہیں کھائے رہیو کا ٹھیک سے؟‘‘

’’ارے کمبخت فضلو، میں گھاس کھاتی ہوں؟ ستیاناسی، تیرا بیل کا منھ ہو!‘‘ تائی ماں جھٹے سے

اکھڑ جاتیں۔

''ہم تو رام پیاری کو کہت رہیں بڑی اماں،'' فضلو بغیر شرمندہ ہوئے آرام سے جواب دیتے ہیں اور یکا یک اکہ روک کر اتر جاتے ہیں۔

''ستیاناس! اب کیا ہوا؟ اس رام پیاری کی ٹانگ ٹوٹ گئی کیا؟''

''دیکھو بڑی اماں، رام پیاری کو کچھو نا کہو۔ ہم کا گریا لمیو جتنا من ہوئے۔''

''ارے مردود، میں کیا گالیاں بکتی ہوں جو تجھے گالیاں دوں گی؟ اور یہ تیری گھوڑی آسمان سے اتری ہے کیا جو اسے کچھ نہ کہوں؟ ایسے چل رہی ہے جیسے آدھی مر گئی ہو۔''

''اِکہ چلاتے چلاتے اس کی شکل خود گھوڑی جیسی ہوتی جا رہی ہے،'' ایک بار کسی بات پر فضلو نے تھوتھنی جیسا منھ لٹکایا تو کم سخن اماں بھی بے اختیار بول پڑی تھیں۔ اس وقت تائی اماں کی سرزنش پر اس نے پھر ویسا ہی منھ بنایا۔ رام پیاری کے لیے تحقیر آمیز الفاظ اس کی برداشت سے قطعی باہر تھے۔

''رام کھلاون کا کا سے لیے رہیں۔ کہے لگیں کہ بیٹا کا بیاہ نا کرے کو ہوتا تو نا بیچتیں۔ کھول کر دیے لگیں تو آنکھ ماں آنسو۔ بولیں کہ بیٹا پھجلو، تو تو اِی کا نام بدل دیہو۔ تمھار کا کا بڑے پریم سے رکھے رہیں۔ رام پیاری، ہمری پہلوٹھی کی بٹیا کوئی دو مہینا کی ہوئے کے گجر گئی رہی، او ہو کا نام رہا رام پیاری۔ تو بڑی اماں، ہم کہیں کہ ہم نام کا ہے بدلیں گے؟ کون جرورت ہے نام بدلے کی؟ نام تو بڑا نیک ہے۔''

''وو ئی تمھاری یہ داستان کبھی ختم بھی ہوگی۔ نو سو ویں بار دہرا رہے ہو۔ ذرا دو چار چابک رسید کرو اپنی اس نو پھول راج کماری کو تاکہ ذرا تیز چلے۔''

''کچھ ناراج ہیں کا؟'' فضلو کا لہجہ ریشم کی طرح نرم تھا۔

''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں مگر...'' بڑی اماں پگھل گئیں۔

''آپ کا ناہیں کہت رہے بڑی اماں، رام پیاری سے پوچھت رہیں۔ پانچ ٹھو روپیہ دیجیے گا؟''

خون تائی اماں کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ مارے غصے کے خاموش ہو گئیں۔ ویسے بھی فضلو کی اودھی ان کے پلے پوری طرح پڑتی نہیں تھی۔ وہ مراد آباد کی تھیں۔ ''بڑی اماں پانچ ٹھو روپیہ نا

دیہیں؟ کون بڑی بات ہے آپ کے لیے؟''

''ارے مجھ سے کہہ رہا ہے جنم جلے؟ مجھے کیا پتا کہ مجھ سے مانگ رہا تھا یا وہ بھی اس گھوڑی سے ہی کہہ رہا تھا۔''

''آپ سے کہت رہیں بڑی اماں،'' نہایت ملائمیت اور سادگی سے فضلو نے جواب دیا۔

''کیا کروگے پانچ روپے؟''

اس زمانے میں پانچ روپے ایک غریب آدمی کے لیے اچھی خاصی رقم تھی۔

''ابھی تو ہم تین گاہکی لوگن سے پانچ پانچ روپیہ...''

''ایک اور شادی کر رہا ہے کیا؟''

''ہاہاہا...'' فضلو دوسری شادی کے مذاق پر جی کھول کر ہنسے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ دیوالی آ رہی تھی اور لڑکے پٹاخوں کی ضد کر رہے تھے۔ لائی، بتاشے، کھلیں تو کوئی ججمان دیتے ہیں لیکن پٹاخوں کے لیے تو پیسہ چاہیے۔

''اچھا لے لینا پیسہ، چھڑا لینا پٹاخے، مگر کل ذرا ایک بجے ضرور چلے آنا۔ شرافت کے گاؤں جانا ہے۔ سب لوگ چلیں گے۔''

فضلو سے تائی اماں کی چخ ہمیشہ چلتی رہی لیکن پھر بھی کہیں جانا ہو تو انھیں کو بلاتیں۔ بقول تائی اماں، جب کہیں جانا ہو تو ڈھینگ کے ڈھینگ لڑکوں کی خوشامد کرو کہ اے بیٹا، ذرا فلاں جگہ ساتھ چلے چلو۔ پھر بھی دسیوں بہانے گڑھیں گے، ہزار نخرے دکھائیں گے۔ کبھی راضی ہوں گے، کبھی اس کے باوجود نہیں ہوں گے۔ فضلو سے کہلا دیا، وہ آ گیا وقت سے۔ اب کسی سپہ سالار کی ضرورت نہیں کہ ساتھ چلے۔ اطمینان سے دور نزدیک، جہاں چاہو جاؤ۔ ڈاکٹر کے یہاں گھنٹوں کھڑا رکھ لو۔ یہ رشتہ اس وقت بھی قائم رہا جب رام پیاری مر گئی اور فضلو بابا رکشہ چلانے لگے۔ ان کے اِکے کی طرح ان کا رکشہ بھی کبھی اسٹینڈ پر جا کر نہیں لگا۔ وہ محلے کے 'لگے ہوئے گاہکوں' کے یہاں کام کرتے تھے۔ رکشے میں آگے لکڑی کی بنچ لگا کر اب وہ ان لگے ہوئے گھروں کے بچوں کو اسکول بھی لے جانے لگے تھے۔ ہاں، یہ اسکول والا کام پکڑنے کی وجہ سے کبھی کبھی تائی اماں کو دقت ہو جایا کرتی تھی۔ پچھلی مرتبہ انھیں ظہر کے بعد بلایا تھا، وہ عصر بعد ہانپتے کانپتے وارد ہوئے تو تائی اماں کا بلڈ پریشر کافی بڑھ چکا تھا۔

Scanned with CamScanner

پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔

''ارے بڑکی اماں، ہمری او سنیو کی ناہیں۔ بولت جات ہیں، بولت جات ہیں،'' وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔ پھر انھوں نے داستان سنائی کہ ان کے رکشے پر شہر میں نئے آئے ہوئے سول انجینئر اجے کمار کی بچی بھی اسکول جاتی تھی۔ وہ اس کے گھر پہنچے تو دیکھا، گھر میں تالا۔ اس کی نوجوان ماں پڑوس میں کہیں جا بیٹھی تھیں اور دھیان سے اتر گیا تھا کہ سنیچر کو ہاف ڈے کی وجہ سے بچی تو بارہ بجے ہی گھر آ جائے گی۔ فضلو کھونٹے کی طرح وہاں جم کر بیٹھ گئے، گرچہ باہر لان اور چھوٹا سا باغیچہ تھا اور ملازم سوکھے پتے صاف کر رہا تھا۔ بچی کی ماں واپس آئیں تو بچی کو انھیں سونپ کر ہی فضلو اٹھے اور باقی بچوں کو ان کے گھر پر پہنچایا۔ چلتے وقت اجے کمار کی بیوی کو لمبا لیکچر بھی پلایا کہ اس طرح گھر سے غائب نہ ہو جایا کریں، ملازم پر بچی کو نہ چھوڑیں، اسکول کے نظام الاوقات اچھی طرح یاد کر لیں، وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ بوڑھے ہونے کے بعد فضلو بابا اور تائی اماں، دونوں میں اور بھی بے میل خواص پیدا ہو گئے تھے۔ تائی اماں بے صبر اور چڑچڑی ہو گئی تھیں اور فضلو سست رفتار، موڈی اور بکی۔ اس دن تائی اماں خوب ہی تو ناراض ہوئیں۔ مارے غصے کے اپنا پروگرام ہی کینسل کر دیا۔

پھر رام پیاری کی طرح ایک دن وہ بھی فضلو بابا کی زندگی سے خارج ہو گئیں۔

تیجے کے دن سب نے کھانا کھایا، لیکن فضلو اپنے برتن سرکا کر یونہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچی زمین پر ان کے آنسوؤں کا گول نشان دیر تک گیلا رہا۔

پھر فضلو بابا کے شانے اور بھی ڈھلک گئے اور قویٰ کمزور ہو گئے۔ اب ان سے رکشہ بھی نہیں چلتا تھا۔ وہ بازار میں ترکاری کا ٹھیلا لگانے لگے تھے۔ گردن جھکائے چپ چاپ سبزیاں تولتے رہتے۔ ایک بیٹا تھا جو کب کا بمبئی بھاگ چکا تھا۔ سنا، وہاں درزی کا کام کرتا تھا۔ تین بیٹیاں تھیں، تینوں کے بیاہ ہو چکے تھے۔ بیوی کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایک اکیلا پیٹ پالنے میں ایسی دقت نہ ہوتی لیکن کچھ عرصے پہلے ایک داماد ان کی بیٹی کو مار پیٹ کر ان کے گھر چھوڑ گیا۔ اب اس کا پیٹ تو پالنا ہی تھا۔ بیٹی بیڑیاں بناتی تھی، پھر بھی انتہائی عسرت میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اکثر سبزی تولتے تولتے ہاتھ روک کر خلا میں تکنے لگتے اور دھیرے دھیرے بدبداتے: ''ٹخ ٹخ، ٹخ ٹخ، سنبھل کے بیٹا رام پیاری، سنبھل کے!'' شاید وہ اس عہدِ زریں میں واپس لوٹ جانا چاہتے تھے جب ان

Scanned with CamScanner

کے قویٰ مضبوط تھے، ان کے بال بچے ان کے سائے میں محفوظ تھے اور رام پیاری ایک ماں بن کر ان کی کفالت کر رہی تھی۔

یا وہ محض سٹھیا گئے تھے؟

لیکن مجھے کیا ہو گیا؟ میں تو فضلو بابا جتنی بوڑھی نہیں ہوں۔ نہ میرے بال سفید ہوئے ہیں، نہ دانت ٹوٹے ہیں اور نہ ہی میری مت ماری گئی ہے۔ میں تو امیرو خاں طمیر و خاں اور مارتے خان بے دھڑک کی کہانی سنانے جا رہی تھی جو خوف و دہشت پیدا کرتے اور قبروں پر اپنا راج سنگھاسن جماتے ہیں۔ یہ فضلو بابا کہاں سے درمیان میں آ گئے؟ میں بھی سٹھیا گئی ہوں کیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ مجھے عادت ہے ان لوگوں کی کہانی سنانے کی جنھیں میں بہت قریب سے جانتی ہوں اور جن سے مجھے ڈر نہیں لگتا اور جن کی کہانیوں کو میں اختتام تک پہنچا سکتی ہوں۔ امیرو خاں طمیر و خاں تو ایک کبھی نہ ختم ہونے والی داستان کے کردار ہیں، شاید اسی لیے شمسی چچا بھی اسے کبھی پورا نہ کر سکے۔

لیکن ٹھہریے... فضلو بابا کی کہانی میں بھی کیسے ختم کروں؟ ان سے ملے زمانہ گزر گیا۔ تین برس ہوئے کہ میں وطن نہیں گئی ہوں — وطن جسے عورتیں اپنی زبان میں مائیکہ کہتی ہیں اور جو انھیں بہت عزیز ہوتا ہے — لیکن کہانی تو مکمل کرنی ہے۔ میں گیارہ بجے رات کو ٹرنک کال کرتی ہوں۔ میرا بھتیجا فون اٹھاتا ہے اور اتنی رات کو میری آواز سن کر گھبرا سا جاتا ہے۔

''پھپھو، کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں بھیا، ابھی تک تو ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آج کل خیریت سے ہیں۔''

''فون کیوں کیا پھپھو؟''

''سنو، وہ جو تھے فضلو بابا ٹخ ٹخ... میرا مطلب جنھیں بچے ٹخ ٹخ کہہ کر چڑاتے تھے، وہ آج کل کہاں ہیں، کس حال میں ہیں؟''

وہ اچانک خاموش ہو جاتا ہے، پھر ذرا رک کر کہتا ہے، ''یہ گیارہ بجے رات میں آپ نے فضلو بگلے کا حال جاننے کے لیے فون کیا ہے؟''

''ارے بھئی، سوال مت کرو، میرے سوال کا جواب دو۔''

وہ ایک طویل سانس کھینچتا ہے۔ ''آپ کو معلوم ہے پھپھو، اس کی سب سے چھوٹی بیٹی بدایوں میں تھی۔ وہ اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پچھلے سال زچگی میں وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ داماد کا خط آیا تو فضلو بیوقوف قرض ادھار لے کر بدایوں کے لیے روانہ ہو گیا۔ فضا ان دنوں بھی ایسی ہی خراب تھی۔ بدایوں اسٹیشن پر جو مسافر اردو کے نام پر ٹرین سے کھینچ کر مار دیے گئے، ان میں فضلو بھی تھا۔ لاش بھی گھر نہ آ سکی۔ اور کچھ پوچھنا ہے، بڑی پھپھو؟''

میں بغیر جواب دیے خاموشی سے رسیور رکھ دیتی ہوں۔ ایک دبلا پتلا، جھکے ہوئے شانوں اور جھریوں بھرے شفیق اور مہربان چہرے والا بوڑھا نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ ضرور اس کی حیران و پریشان روح آسمانوں کے درمیان چکراتی، گھومتی ہوگی اور پوچھتی ہوگی، ''ہم کا کاہے ماریو بھیا؟ کا بگاڑے رہیں تہار؟''

بجھے دل کے ساتھ برش اٹھا کر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ سونے سے پہلے بال سمیٹ کر ایک چوٹی گوندھ لینا میری عادتوں میں شامل ہے۔ لیکن یہ کیا؟ اچانک آئینے سے میرا چہرہ غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ شانوں پر فضلو بابا کا چہرہ اُگ آتا ہے۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور برش ہاتھ سے گر جاتا ہے۔

ندی کے پانی میں تلاطم ہے، پنکھ پکھیرو بے چین ہیں اور خرگوش، ہرن اور میمنے خوفزدہ۔

❄❄

ذکیہ مشہدی

تھوڑا سا کاغذ

ممدو کباڑی نے اپنا ٹھیلا لا کر ٹھیک صدر دروازے کے پاس لگایا تو معظم کو معاً خیال آیا کہ آج اتوار تھا، کیونکہ ممدو اتوار کو ہی آیا کرتا تھا۔

''آ گئے ممدو؟'' اندر سے معظم کی بیوی تاجور نے ذرا زور سے پکار کر کہا، اور پھر خود بھی باہر آ گئی۔

''دیر لگے گی۔''

''معلوم ہے،'' ممدو کے لہجے میں سنجیدگی تھی — موت کے احترام میں پیدا ہونے والی سنجیدگی۔ وہ معظم کے والدین کے وقت میں ایک نوجوان، مسیں بھیگتا ہوا لڑکا تھا اور معظم کی سب سے بڑی بہن ریشماں سلطان عرف ریشم کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوا تھا۔ ہر دو تین ماہ پر کسی اتوار کو اپنا ٹھیلا لے کر آ کھڑا ہوتا۔ تاجور ان دو تین مہینوں کی ردّی نکالتے وقت اچھی طرح دیکھ بھال لیتی تھیں کہ پھوپی کا کوئی پرچہ اس میں نہ چلا جائے۔ پھر بھی ممدو کی آواز سن کر پھوپی چیل کی طرح وہاں پہنچ جاتیں اور ایک ایک کر کے ساری ردّی کھنگالتیں کہ کہیں ان کا کوئی رسالہ، کوئی کتاب یا مطلب کی کوئی اور چیز اس میں نہ چلی گئی ہو۔ کبھی کبھی وہ اخبار کے تراشے بھی نکال کر رکھ لیا کرتی تھیں۔ مضمون تراشنے کا موقع نہ ملتا تو اخبار ہی تہہ کر کے الگ رکھ دیتیں۔ ایسے تراشوں کی نہ جانے کتنی فائلیں تھیں ان کے پاس۔ وہ ردّی کے پاس پھیل کر بیٹھ جاتیں تو منہ چڑھا ممدو جھنجھلاتا، تاجور دبی دبی ناراضگی کا اظہار کرتیں، لیکن جب تک پھوپی ساری ردّی دیکھ کر اطمینان نہ کر لیں تب تک وہ ممدو کی ترازو پر چڑھ

نہیں پاتی تھیں۔

ملازم بازوؤں میں بھر کر ایک بھاری بوجھ لے کر آیا اور ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ زمین پر پٹخا۔ تہذیب الاخلاق۔ معظم وہاں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے ایک دو شمارے اٹھائے — کرم خوردہ زرد صفحے۔ ہاں، کیا کرنا ہے ان کا۔ ذہن نے خاموشی سے دہرایا۔

دوسرا گٹھر: آج کل۔

تیسرا: بیسویں صدی۔

چوتھا: شب خون۔

پانچواں: نقوش۔

مختلف صوبائی اکادمیوں کے ذریعے نکالے جانے والے پرچے، خواتین ڈائجسٹ، مذہبی رسالوں کی فائلیں: دین و دنیا، آستانہ، الحسنات۔

بچوں کے رسالے کھلونا کی بیس پچیس سال کی مکمل فائل، ایک اور بڑا گٹھر۔

''پھپو، آپ کی ردّی بکے تو ہم دونوں کا یہاں سے دلّی تک کا ہوائی جہاز کا کرایہ نکل آئے،'' معظم کی چھوٹی بیٹی عنبرین نے، جو پھپو کی لاڈلی تھی، ایک مرتبہ کہا تھا۔

پھپو ناراض نہیں ہوئیں، مسکرا کر بولیں، ''دلّی جا کر کیا کرو گی بیٹی؟''

''کچھ بھی کریں۔ ہوائی جہاز پر مفت میں چڑھ تو لیں گے۔ امی تو کرایہ دینے سے رہیں۔''

''میری کتابوں کو ردّی کہتی ہو؟'' پھوپی کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

''اور نہیں تو کیا۔ باوا آدم کے وقت کی کتابیں۔ سنہ پینتالیس تک میں چھپے ہوئے رسالے۔ چلیے سال دو سال پرانے رکھ بھی لیے، لیکن سنہ پینتالیس!''

''یہ ابا کے وقت کے ہیں بیٹا۔ وہ پابندی سے لیا کرتے تھے۔ ہم نے سنبھال کر رکھ لیے۔''

''اٹھارہ سو پینتالیس کے پھوپی؟'' بڑی بیٹی نوشین نے لقمہ دیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''اٹھارہ سو پینتالیس میں ہماری پھپو نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ ایشیا کی پہلی عظیم خاتون ہیں جنھوں نے اتنی تعلیم حاصل کی،'' نوشین نے بالکل کسی نیوز ریڈر کے انداز میں بیان کیا۔

''اٹھارہ سو پینتالیس — ارے میں اتنی پرانی روح ہوں؟ انسان ہوں یا بھوت پلید؟'' وہ

Scanned with CamScanner

زور سے ہنسیں۔

''آپ ہماری ریشم پھپھو ہیں۔'' دونوں ان کے گلے میں جھول گئیں۔ ''بھوت پلید ہوں آپ کے دشمن۔''

''چپ، کٹنیو! بات تو مانتی نہیں۔ بس جھوٹ موٹ کا کٹناپا۔''

''کیا بات نہیں مانتے پھپھو؟ کہہ کے تو دیکھیے۔''

''اردو کیوں نہیں پڑھتیں؟''

''پڑھتے تو تھے!''

''پڑھتے تو تھے، اپنا سر! کچھ مہینوں تک گھنٹہ آدھا گھنٹہ بیٹھ کر مولوی صاحب کے ساتھ ریں ریں کر لیا تھا۔ میرے پاس بیٹھ کے پڑھو۔ دیکھو بیٹا، اتنی اچھی اچھی کتابیں اس آبنوس کی الماری میں بھری ہیں تمھارے دادا کی چھوڑی ہوئی، اچھی خاصی لائبریری ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا۔ ''بھاگ لو یہاں سے، چالو ہو گئیں پھپھو!''

''وہ تو درست ہے، لیکن اب یہ سب کون پڑھے گا،'' ایک مرتبہ معظم نے دبی زبان سے کہا تھا۔ داستانِ امیر حمزہ، قصہ چہار درویش، فسانۂ آزاد، سیرِ کہسار، شریف زادہ، ابن الوقت، امراؤ جان ادا، پھر علامہ راشد الخیری، ایم اسلم، حجاب امتیاز علی... اور تو اور، ابنِ صفی، صادق صدیقی سردھنوی کی ہر تصنیف۔ روسی مصنفین کے اردو ترجمے۔ اور ترجموں پر یاد آئے منشی تیرتھ رام فیروز پوری... کتنی کتابیں خریدتے تھے ابا۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، حکمت، سارا کچھ اردو میں۔ ابا ملازمت کے سلسلے میں کافی دن پنجاب رہ چکے تھے۔ وہاں ان کے ایک بزرگ دوست تھے منگت رام نیر، جو اردو کے عاشق تھے۔ سینکڑوں کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک بار ابا سے بولے، ''خاندان میں میرے بعد ان کتابوں کا کوئی قدردان نہ ہوگا۔ صدیقی، تم مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو، تم انھیں لے جاؤ۔ میرا کیا، کب ٹپک جاؤں۔ سوچ کے افسوس ہوتا ہے۔ دیمک لگے گی یا ردّی میں بکیں گی۔''

''آپ سمجھتے ہیں، میرے بعد میرے یہاں قدردانی ہوگی؟''

''امید تو ہے۔''

''امید فضول ہے آپ کی۔''

ابا ان سے کچھ چنیدہ کتابیں لے آئے تھے، بمشکل ایک فیصد، پھر بھی ایک بڑا ٹرنک تھیں۔

کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے کی عادت ٹھہری! معظم نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ اب مکان سکڑ رہے ہیں، پہلی جیسی جگہیں کہاں۔ تاہم معظم کی نسل اولادیں برملا گستاخی سے پرہیز رکھتی تھیں۔ اس نے ناک بھوں تو چڑھائی لیکن بولا کچھ نہیں۔

ابا کی کتابوں میں اپنی کتابوں کا اضافہ کر کے وراثت کو سنبھالا تھا ریشم پھوپی نے۔ طبِ یونانی، فلسفہ، ویدوں اور گیتا کے اردو و فارسی ترجمے۔ ابا ایسی دقیق تصنیفات پڑھتے رہتے تھے۔

''آپا، کیا پڑھتی رہتی ہیں؟'' معظم اپنی زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔

''پھپو، اگر دیمک چٹی کتابوں والی الماری خالی کر دیں تو اس میں شیشے لگوا کر ڈرائنگ روم میں رکھا جائے۔ ممی نے اتنے سارے ڈیکوریشن پیسز اکٹھا کر رکھے ہیں،'' معظم کے بیٹے نے کئی بار تجویز پیش کی تھی۔

کتابیں بیشک دیمک چٹی تھیں اور بڑی ہی غیر دلکش جلدوں والی، لیکن دادا کی چھوڑی ہوئی الماری تو آبنوس کی لکڑی کی تھی، پرانے طرز کی نقاشی والے بھاری فرنیچر کا بیحد دلکش نمونہ۔ وہ تو بذات خود ایک آرائش تھی۔

''اب کی آموں کی فصل بک کر میرے حصے کے روپے آئیں تو میں ان سب کتابوں پر خوبصورت چمڑے کی جلدیں چڑھوا دوں گی اور الماری کے درمیانی حصے میں شیشے لگوا دوں گی۔ پھر تم اسے ڈرائنگ روم میں رکھ لینا،'' پھوپی نے پیشکش کی۔

''پھپو کی جو بات ہے وہ نرالی!'' اعظم نے منہ پھلا لیا۔ ''بھلا ان کتابوں پر مزید پیسے پھینکنے کی کیا ضرورت ہے! اسے کہتے ہیں، گوبر میں گھی سکھانا۔''

پھپو کو اس گوبر میں گھی سکھانے والے محاورے سے قلبی اذیت پہنچی۔ اس بیش قیمت اثاثے کو یہ آج کے نوجوان گوبر سے تشبیہ دے رہے ہیں! انھوں نے گلے میں پھنستے گولے کو نگلا۔

'ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمری بینم'

اسی میں تو آگے حافظ نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکیاں ماں کی بات نہیں مانتیں اور لڑکے بزرگوں کے ساتھ بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ پرانی اور نئی نسلوں کا ٹکراؤ تو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ مگر پھوپی اور ان کی ماں کے بیچ جو ٹکراؤ تھا وہ بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا، اس لیے کہ اس وقت کی اقدار سوچ پر پہرے خواہ نہ بٹھا سکیں لیکن وہ دریدہ دہنی کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ اور یہ بھی تھا کہ اماں بالکل جاہل تھیں، پھوپی سوچتی تھیں وہ پڑھی لکھی ہیں۔ وہ جب ماں بنیں گی یا بزرگ، تو ان کے اور اگلی نسل کے درمیان خیالات و افکار کا یہ بُعد نہیں رہے گا۔

لیکن خیالات و افکار کا بُعد کیا محض تعلیم کے ہونے نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے یا زمانہ اسے خود بخود پیدا کرتا ہے؟ رہی زبان، تو اس میں نئے الفاظ آ جائیں، طرز میں تبدیلی آئے لیکن زبان کہیں مرا کرتی ہے؟ پھپھو نے شروع سے ہی معظم کی دلہن تاجور کو تاکید کی تھی کہ بچوں کو اردو پڑھوائیں۔ وہ ہر بار کنی کاٹ گئیں۔ "آپا ریشم، اب آج کل لڑکیوں کو اتنی فرصت کہاں ہے۔ ذرا کورس دیکھیے۔ اب سی بی ایس ای کے دسویں کے کورس میں اتنا سائنس پڑھا رہے ہیں جتنا ہم نے انٹرمیڈیٹ میں بھی نہیں پڑھا تھا۔ پھر یہ کہ تینوں بچے پروفیشنل کورسز کے امتحانوں کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ دس سے بارہ گھنٹے کی محنت۔ کوچنگ انسٹیٹیوٹ..." تاجور نے پورا لیکچر ہی دے ڈالا تھا۔

ریشم پھوپی نے یہ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی، اور جس زبان کو بولنا آتا ہے، اسے لکھنا اور پڑھنا سیکھنے کے لیے کوئی محض آدھا گھنٹہ روز صرف کردے — گھڑی دیکھ کر صرف آدھ گھنٹہ — تو اتنا ہی کافی ہوگا۔ آخر یہ تینوں جب کورس کی پڑھائی ختم کر لیتے ہیں تو کوئی انگریزی ناول لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ ناول اردو کا بھی ہو سکتا ہے۔

تاجور دل ہی دل میں کتنا بھی جھنجلائیں لیکن شوہر کی ماں جیسی بزرگ، بڑی بہن سے کبھی بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی۔ پھوپی کو اس کا خیال تھا۔

بدتمیزی تو اپنی بیٹی مرینہ ہی کر لیا کرتی تھی۔ وہ تقریباً معظم کی عمر کی تھی۔ ریشم پھوپی بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ مرینہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ ماموں بھانجی ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ پھر اماں کا جلد ہی انتقال ہو گیا تو ریشم پھوپی نے معظم کو ماں کی کمی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا

Scanned with CamScanner

تھا۔ پھوپی کے شوہر اچھی سرکاری ملازمت میں تھے۔ ان کے بعد فیملی پنشن ملتی رہی۔ آبائی جائیداد میں بھی پھوپی کا حصہ تھا، اس لیے جب معظم کا اپنا کنبہ ہوا، بچے ہو گئے، تب بھی پھوپی کے ساتھ رہنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں تھیں، نہ ہی مرینہ کی شادی میں کوئی مالی دقت پیش آئی۔ مگر جس کا چہرہ دیکھ کر انھوں نے جوانی کاٹ دی تھی وہ بچی شادی ہونے کے کچھ ہی سال بعد امریکہ روانہ ہو گئی اور اس میں اس کے شوہر سے زیادہ اس کی اپنی خواہش کا دخل تھا اور وہاں کی چکاچوند کا، ایک ڈاکٹر کے بے پناہ پیسہ کمانے کے امکانات کا۔ تب سے وہ بے حد دل گرفتہ اور اداس رہا کرتی تھیں۔

دل بہلانے کے لیے انھوں نے محلے کی کچھ بچیوں کو مفت اردو پڑھانی شروع کی تھی۔ وہ کچھ دن آتیں، پھر غائب ہو جاتیں۔

''ابتدائی ہندی، انگریزی، میتھس وغیرہ پڑھا دیا کیجیے تو آئیں بھی،'' معظم کی تجویز تھی۔

''ان مضمونوں کے لیے لوگ پیسہ خرچ کرلیں گے، اردو مفت پڑھاتی ہوں اس لیے دو چار آ بھی جاتی ہیں،'' ان کی دلیل تھی۔ ''اردو کے لیے ٹیوشن نہ رکھے گا کوئی۔''

مرینہ نے ان سے کئی بار کہا کہ وہ امریکہ آجائیں۔ ایک بار گئی تھیں۔ ایسا خفقان ہوا کہ ویزے کی مدت پوری ہونے سے پہلے بھاگ آئیں۔ پھر انھیں یہ بھی احساس ہوا کہ مرینہ کے اصرار میں شدت اس وقت آئی تھی جب اس کے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ پھر اس کی ایک سسرالی عزیز خاتون نے، جو عمر دراز کنواری اور بھائیوں پر بھاری تھیں، امریکہ جانا منظور کرلیا اور اس کے ایک بعد ایک ہونے والے تینوں بچوں کو سنبھال دیا، تب مرینہ ان کو امریکہ بلانے کی ضد چھوڑ دی۔ دو تین سال میں ایک بار خود ہی پندرہ دن کو آجاتی تھی۔ ہفتہ بھر سسرال رہتی اور ہفتہ بھر ماں کے پاس۔

''اتنا ہی بہت ہے،'' ریشم پھوپی ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔

وہ چلی جاتی تو اس کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ایک ایک دن گنا کرتی تھیں۔ کبھی دو سال کے تیرہ سو تیس دن اور کبھی تین سال کے ایک ہزار پنچانوے جمع تھوڑے سے اور، تب مرینہ اور اس کے بچوں کی صورتیں دکھائی دیتیں۔

''مرینہ، انھیں اردو سے نابلد مت رکھنا، اردو ضرور پڑھانا،'' انھوں نے ہر مرتبہ کہا تھا۔

Scanned with CamScanner

''بڑھاپے میں کیا سبھی لوگ سٹھیا جاتے ہیں؟ میں بھی سٹھیاؤں گی کیا؟ مجھے تو سوچ کر گھبراہٹ ہوتی ہے،'' مرینہ نے جواب دیا تھا۔ ''آخر کتنی بار کہیں گی ایک ہی بات؟''

اس مرتبہ جو مرینہ واپس گئی تو ریشم پھوپی کو پہلا دل کا دورہ پڑا تھا اور اس دن بھی وہ کتابوں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی کسی نایاب کتاب کے نسخے کو تلاش کر رہی تھیں جو بہ ہزار دقت ابا میاں نے کہیں سے حاصل کیا تھا۔ معظم کی بیوی تاجور حسب معمول منھ ہی منھ میں بڑبڑاتی گھوم رہی تھی۔ ''اب آج پھر انھوں نے یہ کھڑاگ پھیلا رکھا ہے۔ شام کو معظم کے کچھ دوست مع بیویوں کے آنے والے ہیں۔ صفائی میں دیر ہو جائے گی۔ اور کیا تعجب جو آدھی کتابیں وہ یونہی باہر پڑی چھوڑ دیں کہ کل اٹھائی جائیں گی، کوئی چھونا مت۔''

اس دن آدھی کیا، ساری کتابیں باہر نکلی رہ گئیں۔ پھوپھی اچانک سینہ پکڑ کر ان پر دوہری ہو گئی تھیں۔ تیسرے دن نرسنگ ہوم میں جب ان کی طبیعت بحال ہوئی تو پہلا سوال اپنی کتابوں کے بارے میں کیا۔ ''انھیں کسی نے چھیڑا تو نہیں؟ وہ ممدو کمبخت تو نہیں آن نکلا نظر لگانے؟'' ممدو اکثر انھیں چھیڑتا تھا۔ ''باجی، آپ کی رڈی کے لیے تو ٹرک اور دو چار آدمی لے کر آؤں گا۔ کب آجاؤں؟''

کیوں چھونے لگا تھا کوئی وہ پرانی دھرانی کتابیں، وہ بھی اردو کی! انگریزی کی ہوتیں تو لڑکے لڑکیاں لے لے کے بھاگتے۔ ہندی ہوتیں تو تاجور نے الٹ پلٹ کی ہوتیں۔ تاجور نے بمشکل جھنجھلاہٹ ضبط کی۔ اب ریشم پھوپی پر ترس تو سب کو آتا تھا۔ لاکھ بھائی ماں سمجھے، اس کی اولادیں پیار سے پیش آئیں، اپنی اکلوتی بیٹی سے سات سمندر پار کی دوری، وہ بھی کسی مجبوری کے تحت نہیں، محض اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے۔ دل ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا، اب احتجاج بھی کر بیٹھا۔ واپس آئیں تو ان کی آرام کرسی پائیں باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف ڈال دی گئی۔ سامنے میز پر کتابیں رکھ دی گئیں اور کاغذ قلم...

کاغذ قلم کس لیے؟ اب کوئی خط و کتابت نہیں کرتا۔ لوگ فون کرتے ہیں یا ای میل۔ الفاظ اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ ای میل کی زبان بھی کیسی ہو گئی ہے۔ کاغذ قلم لے کر پھپو نے اپنا روزنامچہ درج کرنا شروع کیا۔ چلو، خط نہ سہی، کچھ تو لکھیں۔ پہلے دن ہی لکھا: ''زندگی کے کتنے دن اور باقی ہیں؟ کتنے صفحات پُر ہوں گے؟'' ساٹھ صفحات پُر ہو سکے۔

Scanned with CamScanner

دو مہینے بعد پھوپی کو دوسرا دورہ پڑا جو ان کے لیے مہلک ثابت ہوا۔

مرینہ کو فون کیا گیا تھا لیکن اس کی فلائٹ سات گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی۔ پھوپی وہ سات گھنٹے نہیں جھیل سکیں۔ ان کا پورا وجود تنے ہوئے اعصاب کا گچھا بن چکا تھا۔ ان کی آنکھیں دروازے پر تھیں اور لب ''مرینہ'' کا ورد کر رہے تھے۔

مرینہ پہنچی تو وہ ابدی نیند سو چکی تھیں۔

''کتنی بار امی سے کہا کہ میرے ساتھ چل کر رہیں، نہیں مانیں۔ نواسے نواسیوں کا سکھ بھی دیکھ لیتیں،'' مرینہ نے دل گرفتہ آواز میں دوسری بار کہا تو تاجور برا مان گئیں۔

''یہاں انھیں کوئی تکلیف نہیں تھی، مرینہ۔ علاج میں بھی ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی،'' تاجور نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا، ممانی۔ میری صورت نہیں دیکھ سکیں۔ ناشاد گئیں، اس کا ملال ہے۔''

تاجور شرمندہ سی ہو گئیں۔

چالیسویں کے بعد مرینہ نے واپس جانے کی تیاریاں شروع کیں تو تاجور نے واضح الفاظ میں کہا، ''مرینہ اپنی امی کا سامان دیکھ لو۔ اب نہ جانے کب آؤ گی۔ آگے چل کر کوئی تلخی نہ ہو۔''

''آپ جیسا چاہیں،'' مرینہ نے مختصر سا جواب دیا۔

ریشماں سلطان المعروف بہ ریشم پھوپی نے باقاعدہ وصیت تیار کر رکھی تھی۔ لفافہ ان کے ٹرنک سے نکلا۔ دو چار سچی زری کی بھاری ساریاں اب بھی موجود تھیں۔ ان کے حصے کا آموں کا باغ تھا، وہ مرینہ کے بچوں کا تھا۔ معظم کے بیٹے کے لیے انھوں نے اپنی پوری نقد رقم چھوڑ دی تھی جو اچھی خاصی تھی۔ باقی چیزوں کے لیے بھی واضح ہدایات موجود تھیں، مثلاً ہاتھی دانت کا بیش قیمت فوٹو فریم، جیڈ کا گلدان، وغیرہ وغیرہ۔ کتابوں کے لیے انھوں نے لکھا تھا: ''جو ان کی قدر کر سکے وہ انھیں رکھ لے۔''

''لے جانا چاہو تو کچھ کتابیں دیکھ لو،'' تاجور نے یہ رسمی طور پر کہا تھا کہ کتابیں آخر مرینہ کی ماں کی ملکیت تھیں۔ جواب تو انھیں معلوم ہی تھا۔

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔ ''کیا بات کرتی ہیں ممانی! میں کیا کروں گی ان کا؟ اور کیا انھیں لے جانا ممکن ہے؟''

''مرینہ، تمھارے ماموں یہ پرانا مکان بیچ کر کسی اچھے علاقے میں فلیٹ لینے کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل پہلے ابو اور پھر ان کے بعد ریشم آپا کے جذبات کا خیال کر کے ہی خاموش تھے۔ تم سمجھ سکتی ہو، فلیٹ میں اتنی گنجائش کہاں۔ تمھاری امی کے کئی ٹرنک کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بڑی آبنوس کی الماری ہے، دو اسٹیل کی چھوٹی الماریاں ہیں...'' وہ بولتے بولتے یکدم خاموش ہو گئیں۔

''اس سلسلے میں اپ جو چاہیں کریں، میں کبھی کوئی جواب نہیں طلب کروں گی؛'' مرینہ نے اداس سے لہجے میں کہا اور اگلے ہفتے واپس چلی گئی۔

معظم نے کوئی دس بیس کتابیں، جو نایاب تھیں اور جن پر پھوپی نے خوبصورت جلدیں بندھوا دی تھیں، شیشے کی الماری میں آرائشی سامان کے ساتھ رکھنے کے لیے الگ کر لیں۔ ویسے ان سے ابا کی یادیں بھی وابستہ تھیں۔ ریشم دو انگریزی رسالے بھی لیا کرتی تھیں، نیشنل جیوگرافک، اور ریڈرز ڈائجسٹ۔ ان کے پانچ سات شمارے تاجور نے رکھ لیے۔ باقی کے لیے انھوں نے ممدو کو بلا بھیجا۔

آنکھیں پونچھتا ممدو ٹرک تو نہیں، ہاں بڑا والا ٹھیلا ضرور لایا تھا۔ ساتھ میں اس کا بیٹا بھی تھا۔ دونوں باپ بیٹا لنگی چڑھائے صبح سے دوپہر تک رڈی چھانٹ کر الگ کرتے رہے۔ مجلد کتابوں کی جلد علیحدہ کر کے تولا گیا۔ ان کتابوں اور پرانے رسالوں کے دام سوا روپے فی کلو لگائے گئے۔ تاجور کے احتجاج پر ممدو نے کہا، ''پانچ روپے کلو اخبار بکتے ہیں دلہن بی بی، وہ بھی نئے، اس لیے کہ ان سے لفافے بن جاتے ہیں۔ ان کتابوں کا کیا مصرف ہے؟ ہاتھ لگاؤ تو کاغذ جھڑیں۔''

تاجور جھینپ مٹانے کو پوچھنے لگیں، ''اور ان کا کیا ہوگا؟ آخر خرید کر تو تم لے ہی جا رہے ہو؟''

''لو، اب ہم آپ کو بتائیں گے! ان سب کی لگدی بنا کر سنتے ہیں دوبارہ کاغذ ہی بنتا ہے۔''

قبر میں ریشم پھوپی نے کروٹ بدلی۔

ہاں، انھیں 'ری سائیکل' کیا جائے گا۔ ان پر لکھے سارے حروف مٹ جائیں گے۔ لگدی بن کر ان کا کاغذ بنے گا — کورا کاغذ — لیکن کیا کوئی تھوڑا سا کاغذ اردو لکھنے کے لیے بھی مانگے گا؟ کوئی میر، کوئی غالب، کوئی فیض، کوئی عصمت، کوئی قرۃ العین؟

ان کی بے چین روح چکراتی پھر رہی تھی۔

❊❊

Scanned with CamScanner

ذکیہ مشہدی

منظوروا

پٹنہ والی چچی اسے 'موگا' کہتی تھیں، امرونی ممانی 'میلا' اور مقامی عورتیں 'مہیندرا'۔ یہ تینوں القاب ہم معنی تھے۔ جہاں کام دھام سے فارغ ہوا، بس عورتوں کے درمیان گھسا اور ہاتھ مٹکا مٹکا کے گپیں ہانکنی شروع کیں۔ ''اے بھوجی سُنیو!'' ''اے باجی، لاّ قسم ہم کہیں ...'' ''ہائے دیا چچی، سہاگن ہوئے کے سفید دوپٹہ! لاؤ ہم رنگ دیتے ہیں۔''

''اے ہے، پرے ہٹ کمبخت۔ اب یہ میرا دوپٹہ رنگے گا!'' باہر رنگریز مرد ہو یا عورت لیکن گھر کے اندر ان کی آنکھوں کے سامنے ایک جوان مرد وا ان کا دوپٹہ رنگے، چچی اس خیال سے ہی بدک جاتیں، گرچہ وہ مردوا گھر کی جان تھا۔ نل ہمیشہ سوکھے پڑے میونسپلٹی والوں کی کارکردگی کا مرثیہ پڑھتے رہتے، بس سڑک پر لگے پمپ میں پانی آتا تھا۔ غریب غربا لائن لگا کر پانی بھر لیتے، اشراف اپنی شرافت لیے پیاسے بیٹھے رہ جاتے۔ جو منظور مہیندرا نہ ہوتا تو گھر میدانِ کربلا بن جاتا۔ وہ سویرے ہی آ جایا کرتا تھا۔ بیسیوں بالٹی پانی بھرنے کے بعد بھی تروتازہ اور شاداب، ہنستا، مذاق کرتا۔ بازوؤں کی مچھلیاں اس کی محنت کشی کی گواہ تھیں اور پھٹے کپڑے زبوں حالی کے۔ اس قدر نیک اور بے ضرر قسم کا انسان تھا کہ گھر کی جوان بہویں تک اسے بلا تکلف چھیڑتیں۔ بھاوجوں کی ہنسی کچھ زیادہ بڑھتی تو وہ کھسیا کر خاتون خانہ سینئر یعنی اماں کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ ''کا پکایو چچی؟'' وہ اس کے لیے ناشتہ نکالتیں — آلو گوبھی کی ترکاری، روٹی اور ایک بڑا مگ بھر کر چائے۔ ''اے چچی، گوبھی تو میتھی سے بگھاری اچھی لگتی ہے۔ میتھی نہیں ڈالیو کا؟''

''لے کمبخت، اب کھائے گا یا عیب نکالے گا؟''

''عیب نہیں نکال رہے ہیں چچی، ترکاری بہت مزیدار ہے۔ بس میٹھی ...''

''اے کھا چک اور پھوٹ۔ بڑا آیا اماں کو صلاح دینے والا!'' انور بھیا کو اماں کے ہاتھ کے کھانوں کے آگے کسی کا پکایا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بدک جاتے۔ دبی زبان سے کہتے، ''زنخا کہیں کا!''

منظور کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ اس کی موٹی عقل کو کوئی بات اہانت انگیز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ برا بھلا تو اماں ہی اسے سنایا کرتی تھیں۔ دراصل اماں بڑی صفائی پسند تھیں۔ پھر مشترکہ خاندان تھا، بہت سے لوگ، کئی بچے؛ سویرے پانی نہ ملتا تو انھیں بڑی دقت ہو جاتی۔

آج بھی وہ منظورروا کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ بیٹھا ہوگا کہیں بھوجی، چچی کرتا ہوا۔ ساڑھے نو بجے خدا خدا کر کے اس کی شکل دکھائی دی تو وہ بڑی زور سے بگڑیں۔ ''کہاں چلا گیا تھا کمبخت، کلموہا، ڈاڑھی جار!'' ڈاڑھی جار اماں کی پسندیدہ گالی تھی لیکن جب بھی وہ منظورروا کو ڈاڑھی جار کہتیں، وہ بڑی زور سے ہنستا۔ ''ارے چچی، ڈاڑھی جرے اس کی جس کی ہو۔ یہاں تو ڈاڑھی مونچھ سب صفاچٹ۔ کؤنو دوسری گاری دیؤ چچی۔'' لیکن آج وہ خلاف معمول قطعی نہیں ہنسا۔ کسی اداس گدھے کی طرح لمبی تھوتھنی لٹکائے چپ چاپ بالٹیاں اٹھانے لگا۔

منظورروا غصے بولے نہیں، اپنی رائے سے نوازے نہیں، ایسا شاذونادر ہی ہوا کرتا تھا۔ ''کیا ہوا بے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا؟'' انور بھیا نے اسے چھیڑا۔

وہ بالٹیاں اٹھاتے اٹھاتے پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور حیرت اور ہمدردی اور بہت سے ایسے جذبات جنھیں گونگی آنکھیں کھل کر کہہ نہیں پاتیں، بس خلط ملط کر کے رکھ دیتی ہیں۔

''بھوجی!'' وہ انور میاں کے بجائے ان کی دلہن سے مخاطب ہوا جو ہاتھ میں بچی کے دودھ کی بوتل لیے کھڑی تھیں اور یوں گویا ہوا، ''بازار سے آ رہے تھے۔ دیکھا، بڑی بھیڑ ہے۔ وہاں کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ دیوکی نندن بابو کی بڑی بی بی کو کسی نے مار دیا ہے۔''

''اے ہے کسے؟ شیاما دیوی کو؟'' اماں جو باورچی خانے میں بس داخل ہی ہو رہی تھیں، یکلخت پلٹ آئیں۔

''ہاں چچی! لو بھلا، بوڑھی آدمی، سو برس کی عمر، کچھ دنوں میں خود ہی مر جاتیں۔ ان سے ایسی دشمنی! جان سے مار دیا چچی۔''

''اب، سو برس تو تُو جیے گا قیامت کے بورے سمیٹنے کو۔ ساٹھ ستر کی ہوں گی، کہہ رہا ہے، سو برس کی!'' انور بھیا نے لقمہ دیا۔

منظور کو سخت حیرت ہوئی — بھیا کو تنک افسوس نہیں۔ ''بیچاری بڑی بھلی مانس تھیں'' اس نے اتنا ہی کہا۔

''تھیں تو بھلی مانس، مگر تو وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''ہم وہاں کھڑے افسوس کر رہے تھے۔''

کر چکا افسوس؟ جا، اب پانی بھر۔''

''پانی تو ہم بھر ہی دیں گے، ہمارا کام ٹھہرا، مگر شیاما دیوی کی موت کا افسوس تو ہمیشہ رہے گا۔''

''یہ الو کا پٹھا ایک عدد بوڑھی عورت کے قتل کا افسوس کر رہا ہے جو بقول اس کے کچھ دنوں میں خود ہی مر جاتی۔ اچھا ہے جو نپٹ جاہل ہے، اخبار نہیں پڑھتا، ورنہ اب تک افسوس کر کر کے مر چکا ہوتا۔''

''افسوس کی بات تو ہے میاں،'' اماں رسان سے بولیں۔ ''جائیداد کا جھگڑا بہت دنوں سے سنتے ہیں کہ چل رہا تھا۔ لگتا ہے، سوتیلے بیٹوں پوتوں میں سے کسی نے...''

''انھوں نے بھی کم نہیں ستایا تھا سوتیلی اولادوں کو۔ نگوڑی، ناٹھی، اکیلی، اپنی تو کوئی اولاد تھی نہیں۔ دیوکی نندن بابو نے دوسری شادی بھی اسی لیے کی تھی۔ مگر جائیداد کی ہوس میں سب سے کد تھی۔ اب کیا جائیداد ساتھ لے گئیں؟'' بھیا کا لہجہ بے رحم تھا۔

''پھر بھی، ماں تھیں، دادی تھیں۔ کیا زمانہ آن لگا ہے!'' منظوروا نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

دراصل منظوروا کو بسنت کی خبر نہیں ہے، اپنی دنیا میں رہتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کمپیوٹر اور اسپیس کرافٹ اور لوگوں کے مارنے کی اعلیٰ درجے کی تکنیکیں۔ نسل کشی کے منصوبے اور پھر نسل کشی کو فساد قرار دلوانے کی گھاتیں۔ ابے منظوروا، احمق الذی، پانی بھر، تیرے میرے گھر کا بچا کھچا کھانا کھا اور ایک دن بغیر نالہ و شیون، نوحہ و ماتم کسی اندھیری گلی میں مارا جا۔ تب تو دیوکی نندن بابو کی بڈھی بی بی

کے قتل پر افسوس کرنا بند کر دے گا۔

منظورروا اگلے چار پانچ دنوں تک لگاتار دیو کی نندن بابو کی پہلی بے اولاد بی بی کے اوصاف حمیدہ اوران کے سوتیلے بیٹوں پوتوں کے اوصاف خبیثہ کا ذکر کر کے بور کرتا رہا اور ساتھ ساتھ انور بھیا کی بے حسی پر حیرت بھی کرتا رہا۔ پھر وہ اپنی اصلی جون میں واپس آ گیا۔

اس کا دل سب سے زیادہ اسی گھر میں لگتا تھا۔ یہاں ڈھیر سارے لڑکے بالے تھے اور کئی بھوجائیاں۔ اکتوبر کے آخری ہفتے کی شفاف اور نرم دھوپ میں وہ سارے بچوں کو بٹور کر آنگن میں گھوم گھوم کر ناچ رہا تھا اور تالیوں کی تال پر کہہ رہا تھا، ''تیل لگاؤ ڈابر کا، نام مٹاؤ بابر کا!'' پھر وہ چلایا، ''بابر کی اولاد و!'' اور سکھائے پڑھائے بچے کورس میں بولے، ''ہندوستان چھوڑ دو۔''

دوسرے کمرے میں بیٹھے انور بھیا کو جیسے کسی نے بجلی کا کرنٹ مارا۔ وہ تلملا کر باہر نکل آئے اور سیدھے منظور کی گردن میں ہاتھ دیا۔

''کیوں بے، یہ کیا کہہ رہا ہے اور کہاں سے سیکھ کر آیا ہے؟''

بھیا کا لہجہ اتنا درشت تھا اور گردن پر گرفت اتنی سخت کہ منظورروا بالکل بت بن گیا۔ یہ آج کیا ہو گیا بھیا کو؟ وہ تو فرصت کے اوقات میں لڑکے بالوں کو سمیٹ کر ہمیشہ یہی کرتا آیا ہے۔ ''ہاتھی گھوڑا پالکی، جے کنہیا لال کی،'' اور ''برسو رام دھڑا کے سے، بڑھیا مر گئی فاقے سے۔'' پڑوس کے دین محمد سبزی والے کو چڑانے والی کہبت ''محمد دین، ٹکے کے تین'' بھی اسی نے محلے کے لونڈوں کو سکھائی ہے۔ دین محمد نے آ کر بھیا سے شکایت جڑی تو بھی بھیا اتنے ناراض نہیں ہوئے۔ اتنے کیا، وہ تو بالکل بھی ناراض نہیں ہوئے تھے، الٹا ہنسنے لگے تھے۔

''بولتا ہے کہ لگاؤں دو جھاپڑ؟'' بھیا نے آنکھیں تریریں۔ وہ واقعی خفا تھے۔

''تر پاٹھی جی کے مکان کی بغل میں جو بڑا میدان ہے وہاں بہت سے لونڈے اکٹھا تھے، وہی نعرے لگا رہے تھے۔ ہمیں بڑا مزہ آیا۔ کوئی بری بات ہے کیا بھیا؟''

''ابے، بابر بہت بڑا بادشاہ تھا، اسے ایسا کہتا ہے؟ بڑا آیا نام مٹانے والا! اور یہ تو تر پاٹھی جی کے یہاں کام کیوں کرتا ہے؟''

''بھیا، ہمیں جو پیسہ دے گا ہم اس کے یہاں کام کریں گے۔ اب بس آپ کا گھر چھوڑ کر اس

Scanned with CamScanner

محلے میں اور کہیں کام نہیں ہے۔ کئی لوگوں نے اپنے گھر پمپ لگوا لیے ہیں۔ اب دو ایک گھر کی مجوری سے پیٹ کیسے بھرے گا؟''

''اچھا کر، جہاں جی چاہے کام کر، مگر خبردار جو اس طرح کی باتیں سیکھ کر آیا ہے!'' بھیا نے پھر ڈپٹا۔

''کیا بھیا؟ کون سی بھیا؟''

''ارے یہی جو بک رہا تھا۔ اور بچوں کو سکھایا ہے تو کھال کھینچ لوں گا۔ اور ہاں سن...''

''کہیے بھیا۔''

''بابر بادشاہ کا نام ذرا ادب سے لیا کر۔ کہہ، بابر علیہ الرحمۃ۔''

''بابر رحمت اللہ۔ ان کا پورا نام بابر رحمت اللہ تھا کیا بھیا؟''

انور بھیا کا جی چاہا لگائیں دو جھاپڑ کس کے، مگر غصہ ضبط کر کے بولے، ''ابے ہم نے کہا تھا بابر علیہ الرحمۃ۔ علیہ الرحمۃ یا رحمت اللہ بزرگوں، پیروں، ولیوں کے ناموں میں لگایا جاتا ہے۔''

''بابر میاں ولی تھے، اور ہم کہہ رہے تھے، نام مٹاؤ بابر کا، ارے توبہ توبہ! اتنی بڑی بے ادبی۔ معاف کیجیے گا حضور پیر میاں۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور گالوں پر تھپڑ مارے۔ ''بابر رحمت اللہ'' کہہ کر ہاتھوں پر پھونکا اور ہاتھ چومے۔

بھیا کو ایک مرتبہ پھر غصہ ضبط کرنا پڑا۔ ''بابر پیر فقیر نہیں تھے، بادشاہ تھے۔ بڑے منصف، عادل، صوفی منش۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین، عالموں کے قدردان۔''

''غریبوں کا خیال بھی کرتے ہوں گے تب تو...'' منظورو نے لقمہ دیا۔ ''کیا اچھا ہوتا جو ہم ان کے وقت میں پیدا ہوئے ہوتے۔ پھر تو ہماری شادی بھی ہو گئی ہوتی۔''

''ابے تو جب بھی ویسا ہی رہتا۔ چمڑے کی مشک میں پانی بھر کر دلی کی تنگ گلیوں میں کٹورے بجاتا یا کسی گاؤں میں کھیت میں ہل چلاتا یا پیٹھ پر بوجھ ڈھو رہا ہوتا۔ یہ کچھ نہیں تو پھر پیدل فوج میں سب سے آگے توپوں کا چبینا بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوتا۔''

منظورو از حد اداس ہو گیا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر سارے دن کڑھتا رہا کہ وہ اگر بابر بادشاہ کے وقت میں ہوتا تو بادشاہ سلامت بھی اس کی قسمت کا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔ پھر بھی، بادشاہ تو بادشاہ

Scanned with CamScanner

ٹھہرے، ان کا نام ادب سے لینا ضروری ہے۔ وہ جا کر ترپاٹھی جی کے پوتوں کو سکھا آیا: ''بابر علیہ الرحمۃ! اور خبردار جو بابر بادشاہ کا نام مٹانے کی بات کی ہے۔ پاپ چڑھے گا، جہنم میں جاؤ گے۔ وہاں منظوروا نہیں ہوگا۔ ہاں! منظوروا تو جنت میں ہوگا بابر بادشاہ کے ساتھ۔ کندھے پر چڑھا کے تب کون لے جائے گا رام لیلا دکھانے؟''

ترپاٹھی جی کی بہو کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''ارے منجوروا، کس پاپی کو صوفی پیر کہہ رہا ہے؟ نہ جانے کتنے مندر ڈھا دیے، کتنے ہندوؤں کو مروا دیا۔ باہر سے آنے والا بدیسی آکرانتا۔ کئی بار کہا اماں جی سے کہ اس میاں کو کیوں گھر میں رکھ لیا ہے، نکالیے اسے۔ سنتی ہی نہیں ہیں۔ جب کہو، بس ایک ہی جواب، کہ تمھارا کیا بگاڑ رہا ہے؟ کام کر رہا ہے۔ پوجا گھر میں تمھارے کہنے پر ہم اسے جانے نہیں دیتے، پھر کیا اعتراض ہے؟ دو دو آدمی آئے گاؤں سے مسٹنڈے کے مسٹنڈے۔ سیر بھر اناج ایک وقت میں کھا جاتے تھے، اس پر بھی کام چوری۔ اور ٹکے بھی تو نہیں، بھاگ نکلے۔ اب ہم اپنی سہولت دیکھیں کہ ہندو مسلمان بانچیں؟ اب سنیں اماں جی یہ بکواس جو بچوں کو سکھائی جا رہی ہے۔ خرافاتی کہیں کا!''

اماں جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھانستی، کراہتی اٹھیں۔ ''ارے تو سمجھا دو نا۔ بیچارہ سیدھا ہے۔ دیکھ رے منجوروا، ایسی ویسی باتیں کرے گا تو نکال باہر کیا جائے گا۔ ونود بھیا جی کو معلوم ہو گیا تو دو چار جھاپڑ ماریں گے سو الگ۔ بابر نے ہمارے مندر ڈھائے تھے۔''

منظور پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ''ہیں، بہو جی؟''

''تب!'' ترپاٹھی جی کی بہو کے چہرے پر خشونت تھی۔

لیکن تب انور بھیا ایسا کیوں کہہ رہے تھے؟ بھیا بھی پڑھے لکھے ہیں اور یہ بہو جی بھی پڑھی لکھی ہیں۔ منظوروا کے دماغ میں جالے پڑ گئے۔ ''یہ تو اچھی بات نہیں بہو جی۔ مارنا تو ایک آدمی کا بھی برا، نہ کہ لاکھوں آدمی۔ مندر بھی کیوں ڈھایا جائے؟ وہاں تو لوگ پوجا کرتے ہیں۔'' مندر ڈھانا چاہیے، یہ خیال تو کبھی منظوروا کے ذہن کے آس پاس بھی نہیں پھٹکا تھا۔

''اچھا چل۔ یہ پکڑ راشن کارڈ اور گیہوں چینی لے آ۔'' بہو جی کا چہرہ پل کے پل نرم پڑا۔ پھر خیال آیا کہ چاپلوسی کر رہا ہے مکار۔ میاں مسلمان، چرب زبان، دل میں کچھ، زبان پہ کچھ۔ پوری قوم

Scanned with CamScanner

ہی مکار ہے، مکار اور دغاباز۔

راشن کارڈ تھام کر منظوروا وہیں اطمینان سے پسر کر بیٹھ گیا اور چنوٹی نکال کر سوکھا کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ ''ابھی دکان نہیں کھلی ہوگی،'' تمباکو پھولتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔ ''ہم تھوڑی دیر بعد جائیں گے۔''

بھوجی کا پارہ دوبارہ چڑھنے لگا۔ ''منجوروا، یہ تیرے بابر نے مندر ہی نہیں توڑا بلکہ ہمارا مندر توڑ کر وہاں اپنی مسجد بھی بنوائی۔''

''ہائے اللہ بھوجی، کہاں؟''

''اجودھیا جی میں۔ خیر، ہم اپنا مندر تو واپس لے ہی لیں گے، مگر کان کھول کر سن لے۔ یہاں کام کرنا ہے تو خبردار جو اس چنڈال کا نام لیا۔ لٹیرا کہیں کا!''

''بابر کا نام تو آپ ہی کے گھر سنا بھوجی۔ ہم تو جانتے ہی نہیں تھے اللہ قسم۔''

''جھوٹا، لفنگا! ابھی کیا کہہ رہا تھا کہ بابر صوفی پیر تھا؟ جوتے مار کر باہر کر دوں گی۔ جھوٹ بولتا ہے تو!''

جھاڑ تو منظوروا کو اکثر یہاں بھی پڑتی رہی تھی لیکن آج بھوجی کے لہجے میں جو تحقیر اور چہرے پر جو خشونت تھی وہ اسے کہیں اندر تک کچوٹ گئی۔ پہلی ساری ڈانٹیں وہ شربت کے گھونٹ کی طرح گٹک گیا تھا۔ ان میں نہ ایسی تحقیر تھی، نہ ایسی دھمکی، نہ ایسی نفرت، بلکہ وہ ساری جھڑکیاں ایسی اپنائیت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ اسے محسوس ہوتا تھا وہ اس گھر کا ایک ناگزیر حصہ ہے؛ لیکن آج گھر کی بہو کا مسخ چہرہ ایسا دھاردار خنجر تھا جس نے اس گھر سے اس کی ڈور کاٹ دی تھی۔ باتونی، خوش مزاج، ہر وقت مسخرہ پن کر کے سب کو ہنسانے والا منظوروا بہت اداس ہو گیا تھا۔

اس کی زندگی غربت میں کٹ رہی تھی۔ کوئی قریبی رشتے دار آس پاس نہیں تھا، کوئی ایسا انسان جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ شدید آرزو کے باوجود ابھی تک بیوی بھی نہیں ملی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ کوئی بڑا دکھ اس کی زندگی میں نہیں تھا، نہ کوئی بڑا تردد۔ اب یہ بابر نہ جانے کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔ آسمان سے ٹپکا تھا یا زمین سے اگا تھا، یا تاریخ کے ان صفحات سے اچانک باہر نکل آیا تھا جنھیں منظوروا نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ یہ مصیبت... توبہ توبہ... بابر مصیبت نہیں، بابر علیہ الرحمۃ۔

Scanned with CamScanner

انور بھیا تو کہیں باہر نکلے ہوے تھے۔ دل کا دکھ اماں سے کہہ کر اس نے بھڑاس نکالنی چاہی۔ وہ بہت ہی پریشان تھا۔

''ارے منظوروا، پانی بھر۔ میرا دماغ کاہے کو خراب کر رہا ہے۔ ارے ہاں، کیا کہہ رہی تھی وہ ترپاٹھی کی بہو؟ مسجد توڑے گی؟ ارے ان سب کا کیا ہے۔ تعداد پہ اتراتے ہیں۔ کر لیں زور زبردستی، توڑیں مسجد۔ مگر مسلمان بھی ایسے نیمرڈو بر نہیں ہیں۔ ارے بھیا، تو ذرا آج بچوں کو ساتھ لے جا۔ بستے خرید وادے ان کے۔ مہنگائی نے دماغ خراب کر رکھا ہے مگر اسکول والے ہیں کہ روز نت نئی فرمائشیں۔ ناک میں دم ہے۔ کتابوں کا بوجھ اتنا کہ روز بستے پھٹیں۔ ارے یہ ترپاٹھی کی بہوریا! یہ تو درگاہ پہ جاتی ہے۔ ایک دن نوچندی جمعرات کے روز ملی تھی۔ اندر سے ایسی فرقہ پرست! یہ سب ایسے ہی ہیں، منافق، اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔ ان کی رگ رگ میں مکاری ہے۔ ارے منظوروا، اٹھا بالٹی۔ کھڑا کھڑا سر کھجائے جا رہا ہے۔''

''نہیں چچی، ترپاٹھی جی کی بی بی کو کچھ نہ کہنا۔ بڑی نیک ہیں۔ اور ترپاٹھی ماس ساب نے ہمیں اب کی جاڑوں میں گرم چادر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ کے گھر اتنے دن کام کیا۔ کبھی گرم کپڑا نہ ملا چچی۔''

''ہاں، دونوں میاں بیوی ہیں تو نیک۔'' اماں گرم کپڑے کی بات صفا نظر انداز کر گئیں۔

''محرم کے دنوں میں سبیل لگایا کرتے تھے۔'' پھر وہ سر کھجانے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہندو نیک ہوتے ہیں یا بد۔ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ زیادہ تر تو پکے بدمعاش ہیں۔ بس ترپاٹھی جی اور ان کی بیوی نیک ہیں۔ اور ایک وہ تھیں بیچاری، دیوکی نندن کی مقتول اہلیہ۔

منظوروا کے دماغ میں کوئی مسلسل ڈنک مار رہا تھا۔ اماں نے اس کی دلجوئی تو کی نہیں، بس پانی کے لیے ہڑکایا اور جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہیں۔ اس لیے بھیا آئے تو وہ نئے سرے سے تفتیش میں جٹ گیا۔

''ابے، پیچھے ہی پڑ گیا تُو تو! اچھا سن، بابر 1526 میں ہندوستان آیا تھا...''

منظوروا کی سمجھ میں 1526 قطعی نہیں آیا لیکن یہ آ گیا کہ بابر باہر کہیں سے آیا تھا، اور یہ کہ ایک ہندو راجہ نے ہی اسے بلایا تھا اور ایک مسلمان راجہ کے خلاف لڑنے میں اس سے مدد چاہی تھی۔

Scanned with CamScanner

''بڑا بدمعاش تھا۔ مسلمان کے خلاف ہندو کا ساتھ دینے کو چلا آیا!'' منظوروا نے فیصلہ صادر کیا۔

''چپ بے ملاٹے! تاریخ میں نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان، صرف فرمانروا تھے اور بادشاہ۔ اور جس کی لاٹھی تھی بھینس بھی اسی کی تھی۔ اتفاق سے لٹھیا بابر کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ بھینسوں کی گلہ بانی کرنے لگا۔ اب، بھینسیں بھی نہ ہندو ہوتی ہیں نہ مسلمان۔ وہ بس بھینسیں ہوتی ہیں۔ مگر کوئی مندر وندر نہیں توڑا بابر نے۔ یہ جھوٹے ہیں جو ایسا کہہ رہے ہیں۔ دراصل اب وہ لٹھیا مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں...''

''ترپاٹھی جی کی بہو کہہ رہی تھیں...'' منظوروا بھیا کی بات کاٹ کر ہکلایا۔

''ثبوت لائیں نا ترپاٹھی جی کی عالم فاضل بہو!'' بھیا نے زور سے میز پر مکہ مارا اور منظوروا ڈر کے مارے اچھل پڑا۔ ہت تیری بابر کی... نہ نہ... بابر علیہ الرحمۃ۔

''ارے میاں، کس کے ساتھ دماغ کھپا رہے ہو اور کیوں؟'' ابا پہلی مرتبہ دخل انداز ہوئے تھے۔

''ابا، ان لوگوں میں قومی حمیت جگانی ضروری ہے، ورنہ یہ جاہل ان لوگوں کے ساتھ مل کر بابر کا نام مٹانے کے نعرے لگائیں گے اور مسجد ٹوٹ جائے گی۔''

''میاں، ابھی جو تم بول رہے تھے... وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس... تو یہ معاملہ تو ازلی سچائی ہے۔ زمان و مکاں سے پرے۔ اسے کیوں بھول رہے ہو؟ مسجد تو میاں، ٹوٹی سمجھو۔ اور ذرا سی تصحیح کر لو۔ لٹھیا یہ ہاتھ میں لینا نہیں چاہ رہے، وہ ان کے ہاتھ میں عرصہ ہوا کہ آ چکی ہے۔''

ہماری مسجد کوئی کیوں توڑے گا؟ سیدھے سادے، کبھی ناراض نہ ہونے والے منظور کو سخت غصہ آیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غصہ اسے جب آیا جب اسے 'بابر کی اولاد' کہا گیا۔ بابر بادشاہ ہوں یا کوئی علیہ الرحمۃ، منظوروا تو صرف اپنے باپ کی اولاد تھا۔

ترپاٹھی جی کے گاؤں سے ایک لمبا تڑنگا، کالا کلوٹا، مچھیش اکثر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ رشتے میں ان کا بھائی لگتا تھا۔ عام لوگوں کی طرح منظوروا کو چھیڑ بھی لیا کرتا تھا۔ لیکن اس بار جو آیا تو اس کی نظریں ذرا ٹیڑھی ٹیڑھی سی تھیں۔

وہ نومبر کی ابتدائی تاریخیں تھیں ۔ بس پہلا ہفتہ گزرا تھا۔ اس دن فضا ساکت تھی ۔ شہر میں سناٹا تھا۔

ہر شخص سہما سہما سا تھا۔ یم راج نے اپنے کارندوں کی لگا میں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور وہ آسمانوں سے زمین کی طرف گامزن ہو چکے تھے: سر سر سر سر...

''جہاں تم کام کرتے ہو وہاں تو آج ماتم پڑا ہوگا!'' مچھیش نے منظوروا کو چھیڑا۔

''نوج جو چچی کے گھر ماتم پڑے۔ ماتم پڑے دشمنوں کے گھر۔ ارے بھیا، کاہے کو بن ناحق منھ بھر بھر کے کوستے ہو؟ کیا بگاڑا ہے انھوں نے تمھارا؟''

منظوروا حیران رہ گیا تھا۔ بھلا چچی سے اس مچھیش کو مطلب؟

''ابے بابر کی اولاد، چپ! بڑا بڑھ بڑھ کے بولتا ہے۔''

''ہمارے والد صاحب کا نام ببنگن مستری تھا۔ خبردار جو کسی بابر وابر کو ہمارا باپ بنایا۔'' منظوروا کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی سے اس نے اس طرح آنکھیں نکال کر بات کی تھی۔ وہ تو نہایت سیدھا سادا، امن پسند انسان تھا۔ اکثر طعنے تو اس کی سمجھ سے بھی پرے ہوا کرتے تھے۔

''ہی ہی ہی... کیا کرلے گا تو؟'' مچھیش کے لہجے میں تضحیک تھی۔

منظوروا سر کھجانے لگا۔ وہ کیا کرلے گا؟ اس پر تو اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہی کہا تھا بڑے مالک نے، کہ بھینس تو آج بھی اس کی ہے جس کی لاٹھی۔ وہ منحنی سا، چھوٹا سا، پدی سا آدمی اس لمبے چوڑے بھوت کا کیا بگاڑ لے گا! بے بسی کے شدید احساس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کریں گے کیا بھیا جی، مگر یہ شرافت نہیں ہے۔''

''ہمیں شرافت کا سبق پڑھائے گا؟'' یکا یک وہ چٹان کی طرح آگے سرکا اور منظوروا کے سر پر آ گیا۔ کس کس کر دو جھاپڑ رسید کیے اسے۔

تر پاٹھی جی کی بی بی ہائیں ہائیں کرتی دوڑیں۔ ''کیا کرتے ہو چھوٹے لالہ جی! بیچارہ سیدھا سادا آدمی۔'' وہ ہاتھ پکڑ کر منظوروا کو الگ لے گئیں۔ ''جا بیٹا، آج گھر جا، اور ابھی کچھ دن اور یہاں

مت آئیو۔'' ان کے لہجے میں سرو کار تھا۔

منظورروا کچھ دن کیا، پھر کبھی نہیں آیا۔ ایک تنگ گلی میں اس کی گردن ریتی لاش پائی گئی۔ مرتے وقت بھی اس کے دماغ میں جالے لگے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آیا تھا کہ بابر سے اس کا کیا رشتہ تھا اور کیوں تھا، اور اس کا باپ زمانہ قبل مسیح میں پیدا ہونے والا ہینگن مستری تھا یا 1526 میں ہندوستان آنے والا ظہیر الدین محمد بابر۔ زمان و مکاں سے اوپر اٹھ چکا تھا گردن ریتا منظورروا۔

❋❋

Scanned with CamScanner

ذکیہ مشہدی

محمود وایاز

لانبی سی نئی گاڑی کو کافی آگے بڑھا کر سڑک کے کنارے لگے اس پرانے جٹادری پیپل کے نیچے لگاتے وقت گردھر مانجھی نے مسجد کے صحن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ یہ نظارہ کوئی نیا نہیں تھا۔ جمعے کی نماز کے لیے وہ 'صاحب' کو تقریباً باقاعدگی سے مسجد لایا کرتا تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی بحث تکرار نہیں، جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں کھڑا ہو گیا۔ صفیں خود بخود آراستہ ہو گئیں۔ زیادہ تر لوگ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ہوتے۔ وہ ایک ساتھ جھکتے، سجدہ ریز ہوتے، پھر اٹھ جاتے۔ گردھر بے حد متاثر ہوتا۔ اکثر اتنی بھیڑ ہو جاتی تھی کہ نمازی سڑک پر آ جاتے تھے، پرانے پیپل کے بے حد قریب جس کے نیچے ایک چبوترا بنا کر سیندور پتی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں اور جس کے موٹے تنے کے گرد عورتوں نے اپنے شوہروں کی طویل عمر اور اولاد کی خواہش کے لیے گہرے نارنجی رنگ کا موٹا سوت لپیٹ رکھا تھا۔ پیپل سے فوراً پہلے ایک خستہ حال مکان تھا — خستہ حال اور بہت ہی کم چوڑائی میں بنا۔ اس کم چوڑائی میں بھی دروازے سے لگا کر مالک مکان، شنکر بابو نے ایک دکان نکال دی تھی۔ ٹائر میں ہوا بھرنے والا لطیف سکڑ سمٹ کر بمشکل تمام اس میں آ پاتا تھا۔ اس میں اس نے ویلڈنگ کی مشین اور کچھ اور انگڑ کھنگڑ بھر رکھا تھا جو پنکچر بنانے میں کام آتا تھا۔ دکان سے باہر زمین پر پرانے ٹائر بکھرے رہتے تھے جنھیں رات کو گھر جانے سے پہلے لطیف اٹھا کر تلے اوپر کر کے اندر ڈال دیتا اور ایک زنگ آلود تالا لگا کر اس سے بھی زیادہ زنگ آلود کھڑکھڑاتی سائیکل پر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ گردھر اس کا منھ چڑھا شناسا سا تھا، گرچہ دونوں کے تعلقات جمعے کے جمعے ہونے والی اس مختصر سی ملاقات سے

Scanned with CamScanner

زیادہ نہیں تھے۔ لطیف اکثر نماز میں غچا دے دیا کرتا تھا۔

گردھر محسوس کرتا کہ وہ اٹھنے والا نہیں ہے تو ٹوک دیتا۔

''کا ہو، آج پھر نہ جیہو کا؟'' کھڑی بولی روانی سے بولنے والا گردھر کبھی کبھی اپنی مادری زبان پر اتر آتا۔

''نہیں یار، ایم ایل اے صاحب کی گاڑی ہے۔ بیٹری کا بھٹہ بیٹھا ہوا ہے۔ جلدی بنا کے دینی ہے۔ ان کا مچھیش باڈی گارڈ آ کے دھمکا گیا ہے کہ چار بجے تک دے دو۔ ایک ٹائر میں پنکچر بھی بنانے کو ہے۔''

''تمھرے اللہ میاں ناراض نہ ہوئیں؟ اچھا بیٹا جاؤ، جلو آگ ماں!'' اس کے لہجے میں شرارت ہوتی۔

''ارے تجھے کیا؟ اللہ میاں نے کیا تجھے بھیج دیا ہے لگان اُگاہنے کو؟ وہاں کی وہاں دیکھی جائے گی۔'' اس نے مکھی اڑانے کے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ پھر قدرے غصے سے بڑبڑایا، ''چھت ٹپک رہی ہے۔ برسات آنے کو ہے۔ پورے پندرہ سو کا نسخہ بتایا ہے راج مستری نے۔''

گردھر نماز کے لیے ٹوکتا تو لطیف کو کچھ زیادہ ہی شرمندگی ہوتی تھی۔ شرمندہ ہوتا تو جھنجھلاتا۔ مولوی صاحب تو تھے ہی ڈرانے اور گناہ کا احساس پیدا کرنے کے لیے۔ ایک مرتبہ خطبے میں بتا رہے تھے کہ نماز قضا کرنے سے زیادہ بڑا کوئی گناہ تو ہے ہی نہیں۔ جہنم کے کندوں کی روشن آگ میں جل جل کر گناہگاروں کی کھال جب جھڑنے لگے گی تو اللہ میاں نئی کھال بنائیں گے اور اسے پھر سے جلائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ پھر کہیں جا کر کبھی روزِ قیامت جب اللہ کے رسول کی شفاعت نصیب ہوگی، تب نجات ملے گی۔

''قیامت کب ہوگی؟ عذاب کا یہ لامتناہی سلسلہ کے سو سالوں تک چلے گا؟ اللہ میاں کو اور کوئی کام نہیں ہے؟ دنیا کی حالت کیسی خراب ہو رہی ہے۔ بنا کے بھول گئے۔ ذرا اسے بھی دیکھیں...'' وہ جل کے بدبدایا تھا۔

لطیف کو معلوم تھا، ذرا سی کھال تھوڑی سی دیر کو بھی جل جائے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

وہ اکثر داتا پیر کی درگاہ پر حاضری دینے جایا کرتا تھا۔ عرس یا کسی نیاز فاتحہ کے موقعے پر وہاں

بہت سا کام بھی کرا دیتا۔ وہاں گیارھویں شریف کے موقع پر سالن کا بڑا سا دیغ اتارتے ہوئے اس کا ہاتھ بہکا اور کھولتے ہوئے شوربے کی اچھی خاصی مقدار اس کے ہاتھ اور بازو کو جلاتی ہوئی نیچے گری۔ وہ تکلیف آج تک نہیں بھولا تھا لطیف۔ درگاہ پر اتنی خدمت کرتا تھا، پھر بھی ادھر اس کی آمدنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اغل بغل کئی چھوکرے پمپ لے کر بیٹھنے لگے تھے۔ گرچہ وہ تو پنکچر بناتا تھا اور بیٹری کا کام بھی کرتا تھا، پھر بھی اس کی آمدنی کا اچھا خاصا حصہ وہ لونڈے اٹھا رہے تھے۔

آج بھی اس کا قطعی موڈ نہیں تھا کہ وہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھے مگر وہ آن موجود ہوا — وہی کمبخت گردھر۔ محمود علی صاحب کی گاڑی دور سے ہی آتی دکھائی دے گئی تھی۔ ویسے کبھی کبھی وہ بھی ناغہ کر لیتے تھے، یا وہیں کچہری میں ظہر پڑھ لیتے، لیکن جس دن ایسا ہوتا، لطیف کو گردھر سے نہ مل پانے کی خلش بے چین کرتی۔

گردھر نے مسجد کے پاس آ کر رفتار کم کی، بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے ہاتھ کر کے دروازہ کھول کر محمود صاحب کو اتارا، پھر گاڑی آگے بڑھاتا سیدھے لطیف کی دکان کے پاس آ گیا۔

"ابے جا رہا ہوں، جا رہا ہوں! ابھی ذرا سا وقت ہے۔ آ اِدھر بیٹھ۔ چائے والا چھوکرا لاتا ہی ہوگا۔" وہ گردھر کو شیشہ گرا کر منھ نکالتے دیکھ، جلدی جلدی بولنے لگا۔ محمود صاحب آج واقعی ذرا پہلے آ گئے تھے۔

"جا، یا مت جا۔ ہمیں کیا! اللہ میاں سے تُو ہی نپٹ لیجیو!" چائے سڑکتے ہوئے گردھر نے مخصوص شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

گرم چائے کے گھونٹ گلے کے نیچے اتارتے ہوئے لطیف کو پھر وہ کھال جلائے جانے والی بات یاد آئی۔ "ایک دن تو بھی آ جا نماز پڑھنے۔ کہہ دیجیو اللہ میاں سے، اس کا ثواب لطیفوا کے نام لکھوا دیں۔ تو ٹھہرا ہندو، تجھے تو نمازیں معاف ہیں!" بڑبڑ کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا لطیف ٹھیک محمود صاحب کی بغل میں جا کھڑا ہوا۔ نمازی ابھی آ ہی رہے تھے۔

صاف ستھرے لباس میں ملبوس کسی بھینی بھینی خوشبو میں مہکتے سید محمود علی ایڈووکیٹ، ایم اے ایل ایل بی، زمیندار خاندان کے چشم و چراغ۔ ان کی بغل میں ملگجا کرتا پاجامہ پہنے، پسینے میں شرابور پنکچر بنانے والا جاہل مستری لونڈا؛ بلکہ ذرا سی دیر قبل تو وہ صرف گندا پھٹا بنیان پہنے اکڑوں بیٹھا کسی

Scanned with CamScanner

گاڑی کے ٹائروں میں ہوا بھر رہا تھا، پھر جلدی جلدی چائے سڑپ کر اس نے دکان میں ٹائروں پر رکھا کرتا اٹھایا اور تیزی سے گلے میں ڈالتا لپ جھپ بھاگا تھا مسجد کی طرف۔

''ہم نماز ختم ہوتے ہی کودتے پھاندتے بھاگ یائیں گے۔ ذرا رکیو۔ ضروری بات بتانی ہے،'' چلتے چلتے اس نے کہا تھا۔ ''ہوائی جہاز لے کے بھاگیو مت۔''

گردھر کو پتا تھا، لطیف کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ لگتا ہے طے ہوگئی۔ چائے کا گلاس ہاتھ میں نچاتے گردھر نے سر کھجایا۔ لوگ نیت باندھ رہے تھے۔ لطیفوا بھی۔

ایک بات تو ہے، لطیف کے دھرم میں کوئی چھوا چھوت نہیں۔ یہاں شہر میں پتا نہیں چلتا لیکن گاؤں کے مندر میں جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں، گردھر مندر کے اندر نہیں جا سکتا تھا — باہر سے پرنام کر کے چلا جانا پڑتا تھا۔ یوں پرنام تو وہ مسجد کو بھی کر لیا کرتا تھا۔ اندر بھگوان کا نام ہی تو لیا جاتا ہے، اب نام لینے والے جیسے بھی ہوں۔ ویسے صاحب بہت اچھے ہیں اور جوہرا... نہیں، زہرا بٹیا (زہرا نے ڈانٹ ڈانٹ کے اس کا تلفظ درست کرایا تھا — جہاں اس نے 'جوہرا' کہا اور زہرا نے بڑی بڑی آنکھیں نکالیں... ''پھر!'') وہ تو سب سے اچھی ہیں۔ میٹھی مسکراہٹ، میٹھا چہرہ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، زہرا کیسی لگتی ہے۔ اسے دیکھ کر بہت سی چیزیں ذہن میں آتی تھیں — کھیت میں کھڑے پکے گیہوں کی سنہری بالیاں، رہٹ سے گرتا شفاف ٹھنڈا پانی، یا پھر بور سے لدا خوشبو بکھیرتا آم کا درخت، اور سب سے عجیب بات یہ کہ زہرا کو دیکھ کر کبھی کبھی گردھر کے ذہن میں اس کی نپٹ دیہاتی ماں در آیا کرتی تھی جس کا رنگ کالا تھا اور پیروں میں بوائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ زہرا اور وہ اتنی ہی مختلف تھیں جتنی انھیں ہونا چاہیے تھا؛ پھر وہ کیا بات تھی... کچھ آنکھوں میں، کچھ چہرے پر جو گرفت سے بالکل ہی پرے تھی، لیکن تھی تو ضرور، ورنہ ایسا کیسے ہوتا! گردھر سوچتا تو ذہن کے تاریوں الجھ جاتے جیسے زہرا کا اون کا گولہ، جو بلی کے بچے نے پنجوں میں لے کر یوں الجھا دیا تھا کہ زہرا رونے لگی تھی۔

زہرا کا خیال آنے پر گردھر ہولے سے مسکرایا۔ اپنے ذہن کے سارے گڈمڈ تاروں کے باوجود وہ زہرا کا رازدار تھا۔

اس نے زہرا کو ایاز کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

یوں تو زہرا یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ کئی مرتبہ وہ اسے چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے

Scanned with CamScanner

لڑکے اِدھر اُدھر گھومتے دکھائی دیے تھے۔ زہرا کی بڑی بہن عائشہ کی شادی ہوئی تھی تو لڑکیوں کے ساتھ کئی لڑکے بھی آئے تھے۔ یہ سب ساتھ پڑھتے تھے۔ لیکن ایاز کے ساتھ دیکھ لیے جانے پر زہرا کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہوگئی تھی جیسے کسی چور کے سیندھ کاٹتے وقت دیکھ لیے جانے پر ہو جائے۔

"پاپا سے نہیں کہو گے نا؟" اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ مگر ایاز کے چہرے پر اعتماد تھا۔ وہ جلدی سے یوں زہرا کے سامنے آ گیا تھا جیسے اسے سب کی نظروں سے بچا لینا چاہتا ہو، جیسے کہہ رہا ہو، "اتنا مت ڈرو زہرا۔ میں ہوں نا۔"

"نہیں کہیں گے بٹیا!" گردھر کے لہجے میں اس کا خلوصِ نیت تھا، وہ ساری گونگی عزت اور محبت تھی جو وہ زہرا کے لیے دل میں لیے گھومتا تھا، وہ نمک تھا جو کئی پشتوں سے گردھر کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا چلا آیا تھا۔

کئی پشتیں

زہرا کی نانیہال سے گردھر کا رشتہ کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔ سنہ سینتالیس میں زہرا کی امی پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی والدہ کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ قصبے میں زبردست کشیدگی تھی — اب فساد ہوا کہ جب ہوا۔ گردھر کا باپ بنواری اس وقت کوئی سال بھر کا تھا۔ گردھر کے دادا پربھو مانجھی نے بکریاں پال رکھی تھیں۔ وہ زہرا کے نانیہال میں کھیت مزدور تھا اور دوسرے کام بھی نمٹا دیا کرتا تھا، جیسے گھر سے متصل پائیں باغ کی دیکھ بھال اور رکھوالی، نئے درخت لگوانا، پرانوں کی نگرانی کرنا، موسمی پھول اگانا۔ وہ ذات کا مالی نہیں تھا لیکن پھلوں اور پھولوں کا اسے زبردست علم تھا۔ گھر میں جب بھی آتا، ہر طرف سے "پربھوا، پربھوا!" آوازیں لگتی رہتیں۔ پربھوا نہ ہوتا تو پتا نہیں زہرا کی امی کا کیا حشر ہوتا۔ ان دنوں اس نے دونوں وقت لٹیا میں بکری کا دودھ پہنچایا۔ کئی لوگوں نے اسے سمجھایا۔ "معلوم نہیں کہ نوا کھالی میں ان مسلمنٹوں نے کیا آفت ڈھائی ہے؟ ارے کاٹ کے پھینک دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے محلے میں جاتا ہے۔ سانپ کو دودھ پلا رہا ہے۔ اس سالے کو تو ہمیں کاٹ کے پھینک دیں گے۔" پربھو اس مانجھی عرف پربھوا پر اس آخری دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا۔ گلیوں گلیوں چھپتا چھپاتا پربھوا کسی طرح پہنچ ہی جاتا۔ بچی کو گود میں لے کر دُلارتا اور پھر لپ جھپ بہت سے کام

Scanned with CamScanner

بھی نمٹا کر واپس ہو جاتا۔ زہرا کے سگے چچا کا خاندان چلا گیا، پھر چچیرے چچا گئے، اور بھی بہتیرے رشتے دار۔ پربھو نے ایک دن ہاتھ جوڑ کر کہا، ''مالک لوگ بھی چلے جائیں گے کیا؟'' زہرا کی نانی، جو اس وقت نوجوان تھیں اور ننھے ننھے تین چار بچوں کی ماں، آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں، ''نہیں رے پربھو، ہم اپنی مٹی نہیں چھوڑ رہے۔ جانے دو جو جا رہے ہیں۔'' اس کے بعد سے کسی نے اسے 'پربھو' نہیں کہا؛ وہ بڑوں کے لیے 'پربھو' اور بچوں کے لیے 'پربھو چاچا' بن گیا تھا۔ مالکوں نے اس کے نام کچھ زمین کر دی۔ زہرا کی امی نے گردھر کو تعلیم کے لیے ماہانہ خرچ بھیجا لیکن تعلیم جیسا جان لیوا اور بیکار شغل اسے سخت ناپسند ہوا؛ مارے باندھے پانچ سات جماعتیں پڑھیں، پھر گھر سے بھاگ گیا۔ بڑی مشکل سے پکڑ دھکڑ کر لایا گیا تو زہرا کی امی نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ ڈرائیونگ اسکول میں رکھ کر ڈرائیونگ سکھوائی۔ پھر کہا، ''گردھر، اگر کہیں اور جانا چاہے تو چلا جا، نوکری ڈھونڈ لے۔ یہاں رہنا چاہے تو رہ جا۔'' گردھر کہاں جانے والا تھا۔ یہاں کھانا پینا، کمرہ سب مفت تھا۔ کبھی گاڑی نکلی تو چلالی، ورنہ گھر کے سارے کام نمٹاتا رہتا تھا۔ پندرہ سو ماہوار مل جاتے تھے جو پورے کے پورے بچ جاتے تھے۔ تیس برس کا ہو چکا تھا اور گاؤں کے حساب سے بڈھا ہو چلا تھا، اس لیے ماں جلے پیر کی بلی کی طرح لڑکی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دستور کے مطابق لڑکی والوں نے، جنھیں اس کے گھر آنا تھا، آنا بند کر دیا تھا۔ گردھر کے جوڑ کی ساری لڑکیاں بیاہ چکی تھیں اور کئی بچوں کی ماں تھیں۔ گردھر بڑی زور سے ہنس کر کہتا تھا، 'ارے کسی بیٹے والے کی مت ماری گئی ہے جو ہم سے بیٹی بیاہے گا!'' لیکن جب سے لطیفوا اپنی نسبت کی بات کرنے لگا تھا، گردھر کے دل میں بھی کچھ لڈو پھوٹنے لگے تھے، اور آج اس نے زہرا کو ایاز کے ساتھ دیکھ کر سر کھجا کر سوچا تھا کہ کیسے اچھے لگ رہے ہیں دونوں! جیسے رام سیتا کی جوڑی۔ مگر صاحب؟ صاحب اور مالکن... زہرا بٹیا کی امی... گردھر اس گھر کو یوں جانتا تھا جیسے بطخ تالاب کو جانے...

سید محمود علی اور سید مسعود علی نے اپنے والد سے یہ مکان ورثے میں پایا تھا۔ وسیع و عریض لیکن خاصی بری حالت میں تھا؛ زیادہ تر حصے میں کھپریل کی چھت، دیواریں بوسیدہ۔ دونوں کی شادیاں جن لڑکیوں سے ہوئیں وہ حقیقی چچازاد بہنیں تھیں۔ محمود علی اور مسعود علی کی والدہ سیدانی بی بی کہلاتی

تھیں۔ خاندان کی کئی خواتین نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ایک گھر کی دولڑکیاں نہ لائیں، عموماً بہنیں بہنیں مل کر ساس کے خلاف متحدہ محاذ بنالیتی ہیں؛ حبِ معاویہ ہو نہ ہو، بغضِ علی بڑا زبردست اتفاق پیدا کرتا ہے۔ لیکن سیدانی بی بی کی دلیل دوسری تھی۔ ''ہمارے دونوں بیٹوں میں بڑی محبت ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہ محبت برقرار رہے۔ دیکھا گیا ہے کہ شادی ہوئی نہیں کہ نگاہیں بدلیں۔ وجہ: بیویاں۔ ہم نے خود دیکھا ہے۔ ہمارے دیور ہم پر جان چھڑکتے تھے، شادی ہوتے ہی نظریں پھیر لیں۔ ہم نے بہت چاہا تھا اپنی چھوٹی بہن لے آئیں، خدا بخشے ہماری ساس نے ایک نہ سنی۔ اب جو آئیں اللہ کی سنواری، وہ شروع ہی سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چنتی ہوئی آئیں۔ ہم تو اپنے بیٹوں کے لیے دو بہنیں ہی لے کر آئیں گے۔ بیویوں میں ایکا ہوگا تو بیٹے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنے رہیں گے۔''

سیدانی بی بی کو دوسگی بہنیں نہ مل سکیں تو انھوں نے چچازاد کو بہت غنیمت جانا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ دونوں مشترکہ خاندان میں پیدا ہو کر ساتھ ساتھ پلی بڑھی تھیں۔ عرصے تک سیدانی بی بی نے اپنے فیصلے کی کامیابی پر خود اپنی پیٹھ خوب ٹھوکی۔ گھر میں چولھا ایک بنا رہا تھا۔ بچے ہوئے تو پتا ہی نہ چلتا، کون کس کا ہے۔ ہر نماز میں وہ ایک فاضل سجدہ شکر کا ضرور بجالاتیں۔ مگر...

مگر ایسا ہوا کہ سید محمود علی رفتہ رفتہ پیسے والے ہوتے گئے۔ وہ محکمہ نہر میں اوورسیئر تھے۔ ترقی پاکر اسسٹنٹ انجینئر ہو گئے۔ پچھواڑے کی آمدنی چلی آ رہی تھی، اب مرتبے کا زعم بھی آیا۔ کچھ عرصے تک باپ دادا کی اقدار کو سنبھالے رکھا تھا لیکن اب وہ چرمرانے لگیں۔ بیوی کے زیور بنے، بچوں کا نام پرانے اسکولوں سے کٹوا کر شہر کے بہتر اداروں میں لکھوایا گیا (یہاں بھی جوڑ توڑ اور پیسوں کی فراوانی نے اپنی افادیت منوائی)، جن کمروں میں محمود علی اور ان کا کنبہ رہتا تھا ان میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں۔ مسعود علی ایسے محکمے میں اسسٹنٹ تھے جہاں نہ مستقبل قریب میں کوئی ترقی ہونی تھی نہ ہی بالائی آمدنی کی گنجائش تھی، ورنہ ایمان ان کا بھی ایسا پختہ نہیں تھا کہ موقع ملنے پر ثابت قدم رہ سکیں۔ مرتبے میں فرق آیا تو حسد اور رقابت نے اپنے پر پھیلائے۔

پہلا نفاق مکان کی مرمت اور رنگ و روغن کے سوال پر پیدا ہوا۔

''بھائی جان انجینئر ہیں۔ دوسرے، پیسوں کی فراوانی ہے۔ وہ درست کرائیں مکان۔ ہمارا کیا ہے، ٹوٹا پھوٹا بھی ہماری اوقات کے عین مطابق رہے گا،'' مسعود علی کی بیوی نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

Scanned with CamScanner

محمود علی کی بیگم نے جواب دیا کہ مکان پر حق دونوں کا برابر ہے۔ اس لیے کچھ رقم مسعود علی بھی نکالیں ورنہ وہ صرف اپنا حصہ درست کرائیں گی۔ (ان کا حصہ درست ہی نہیں ہوا، چمک بھی گیا۔) لیجیے صاحب، مکان میں میرا حصہ، تیرا حصہ شروع ہو گیا۔

مسعود علی اور ان کے اہل و عیال میں جو احساسِ کمتری پیدا ہوا، اس نے طعن تشنوں کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چولھا الگ ہو گیا اور کچھ عرصے بعد وہ حصے جو ذہنوں میں بٹے تھے، نقشے پر آ گئے۔ آنگن بیچ دیوار اٹھ گئی۔ سیدانی بی بی بہت رنجیدہ تھیں؛ لیکن عمر پوری ہو رہی تھی، رنجیدہ رہنے کو زیادہ دن نہیں رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد تو کوئی احتساب ہی نہ رہا۔

مسعود علی کا اکلوتا بیٹا لائق نکلا تھا۔ آج کے دستور کے مطابق کمپیوٹر کی ڈگری حاصل کی اور منھ اٹھا کر بگٹٹ بھاگا بنگلور کی طرف، جو سارے کمپیوٹر والوں کا مکہ بنا ہوا ہے۔ دو لڑکیاں تھیں، ان کا بیاہ مسعود علی نے ذرا جلدی ہی کر دیا تھا۔ کہتے تھے، قلیل آمدنی ہے اور دو دو ہیں سر پر۔ اس لیے سوائے ہڈی بوٹی کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ سادات کی ایک بستی سے دو نالائق لونڈوں کو پکڑ کر نکاح کر کرا کے چھٹی کی۔ لڑکیاں اپنے گھر کی ہو گئیں۔

مسعود علی پٹنہ سے باہر کبھی نہیں نکلے تھے۔ بیٹے نے بنگلور بلایا تو بڑا شہر دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں سے ہی دوست احباب کو فون کر کے بنگلور کے یوں گن گاتے جیسے سیدھے نیویارک پہنچ گئے ہوں۔ واپس لوٹے تو بات بیچھے، ''وہاں اس طرح ہوتا ہے'' یا ''وہاں تو ایسا ہے''... لوگ سمجھ جاتے، 'وہاں' سے ان کی مراد کیا ہے۔ پھر مسعود علی نے 'وہیں' جا کر بس جانے کا فیصلہ بھی کر ڈالا۔ یہاں ان کا رہ ہی کون گیا تھا، اور پھر وہاں شدّاد کی جنت جو تھی۔

سید مسعود علی نے بڑے بھائی کو کانوں کان خبر کیے بغیر، کہ کہیں وہ رخنہ انداز نہ ہوں، اپنے حصے کا مکان بیچ ڈالا۔

''سنا ہے بھائی مسعود علی نے مکان بیچ دیا؟'' ایک رشتے دار خاتون نے محمود علی کی اہلیہ سے کہا۔

''ہاں، دُھنوں کو بیچ گئے۔''

''اے ہے، دُھنوں کو!'' انھوں نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

''ہمیں بتاتے تو ہم ہی خرید لیتے۔ باپ دادا کا مکان ہاتھ میں رہتا۔ یہ تو ہاتھ مل کے رہ

Scanned with CamScanner

گئے۔اور بیچا بھی تو کس کو۔اب رہو دُھنوں، جلاہوں کے ساتھ۔'' دو تین بار اہلیہ مسعود علی نے دُھنوں کو دُھنکا تو زہرا سے نہ رہا گیا۔

''امی، دُھنے کون ہوتے ہیں؟''

''ارے وہی جو روئی دُھنتے ہیں۔''

جاڑوں کی آمد ہوتی تو گلی محلے میں اچانک وہ نمودار ہو جایا کرتے تھے۔ بیچارے، خستہ حال سے لوگ۔ اکثر تو ننگے پیر، لنگی کرتے میں ملبوس، کاندھے پر دُھنکی رکھے۔ کبھی کبھی وہ دھنکی کے تار چھیڑتے تھے۔ یہ گویا ان کی موجودگی کا اعلان تھا۔ زہرا نے اکثر ان کی طرف دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا، لیکن اب ان کا آنا بہت کم ہو گیا تھا اس لیے کہ زیادہ تر لوگ لحاف گدے یا بھرے بھرائے لینے لگے تھے یا مشین پر بھیج کر بھروا لیتے۔ گھر پر روئی دُھنوانے میں اب لوگوں کو قباحت محسوس ہونے لگی تھی۔ زہرا کو اس طرح کے بھی لوگوں پر بڑا ترس آتا تھا۔ دوسروں کے یہاں جڑاول کا انتظام کرانے والے یہ مفلوک الحال لوگ اکثر شدید سردی میں بھی محض لنگی کرتے میں ملبوس نظر آتے۔ جاڑا زیادہ پڑتا تو سر پر انگوچھا لپیٹ لیتے۔ یہ محلے کا دورہ کرتے تو اکثر چھوٹے چھوٹے لونڈے ان کے پیچھے لگ لیتے اور ناک سے دھنکی کی آواز نکالتے۔

''امی، تو کیا اب ہر وقت ہمارے یہاں تن تن تائیں تائیں کی آواز گونجتی رہے گی؟'' دھنوں کی مفلوک الحالی سے زہرا کو جتنی بھی ہمدردی رہی ہو، دیوار بیچ گھر میں روئی دھنی جائے اور شور مچتا رہے، یہ ذرا گڑبڑ معاملہ تھا۔ پھر یہ کہ کسی غریب دھنے نے چچا ابا کا مکان خریدا کیسے؟ اتنے پیسے آئے کہاں سے اس کے پاس؟ یہ کون سی قسم کا دھندا ہے؟

''بیوقوف، ہر دُھنا روئی تھوڑی دھنتا ہے۔''

''نہیں دھنتا تو پھر وہ دھنا نہیں رہ جاتا۔''

''بڑی کٹھ حجت لڑکی ہے!'' زہرا کی والدہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔ آج محمود علی صاحب نے مرغ دو پیازے کی فرمائش کی تھی۔

چلتے وقت چچا ابا مل کر گئے۔ انھوں نے گلے شکوے بھلا دینے کو کہا (یہ مکان بیچ دینے والا

Scanned with CamScanner

شکوہ کیونکر بھلایا جاسکتا ہے، یہ نہ سوچا انھوں نے) اور ایک بار وہاں ضرور آنے کی درخواست کی تا کہ بھائی جان اور ان کے اہل وعیال کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ بھی دیکھ لیں کہ اب ان کے کیا ٹھاٹھ ہوں گے اور وہ کیسے شہر میں رہیں گے۔

دوسرے دن وہاں 'احمد حسین، بی اے، ایل ایل بی' کی تختی لگ گئی۔

سامان اترا تو اس میں ٹی وی، فرج، صوفہ سیٹ، ایک عام متوسط گھر کی سبھی چیزیں تھیں۔ اچھے صاف ستھرے ذوق کی غماز۔ قیمت کے اعتبار سے بھی کم وبیش ویسی ہی تھیں جیسی مسعود علی کے گھر میں، بس شجرہ مختلف تھا۔

ایک گمنام شجرہ

احمد حسین صاحب کے دادا (کہ تاریخ بس دادا تک ہی یاد تھی اور گھر کے کسی کونے کھدرے میں کہیں کوئی کرم خوردہ شجرہ بھی نہیں تھا، اس لیے کہ شجرہ وہی بنواتے ہیں جو اپنی عظمت ماضی میں ڈھونڈتے ہوں) کاندھے پر دھنکی لیے، کڑکڑاتے جاڑوں میں بھی لنگی کرتے میں ملبوس، سر پر پھینٹا باندھے، صاحبِ استطاعت لوگوں کے یہاں روئی دھن کر لحاف گدے بھرتے گھوما کرتے تھے۔ اگر وہ مقامی آدمی ہوتے تو شاید محلے کے کسی اندھے چند ھے، جھریوں بھرے چہرے والے بزرگ کو یاد بھی ہو سکتے تھے۔ ان کا اسم شریف 'ممدو' تھا جو بگڑ کر 'مادو' اور پھر کچھ ستم ظریفوں کے تلفظ تلے آ کر 'مادھو' ہو گیا تھا۔ وہ تا زندگی اسی عرفیت سے جانے جاتے رہے۔ موصوف لحاف میں دھاگے ڈالنے میں ماہر تھے۔ خاص کر اگر لڑکی کے جہیز کا لحاف ہوتا تو وہ اس میں اپنی ساری فنکاری صرف کر دیتے اور اجرت میں کمی کر دیتے کہ بٹیا کا بیاہ ہے۔ گدوں میں ایسا دھاگہ ڈالتے کہ روئی سالوں ٹس سے مس نہ ہوتی۔ پاؤ ڈیڑھ پاؤ روئی دھن کر بادلوں کی طرح ہلکی کر ڈالتے اور بڑی سی دُلائی میں یوں برابر کر کے پھیلاتے کہ معلوم ہوتا کہ بس ململ کی ایک تہہ ڈال دی گئی ہے۔ ان خوبصورت، بادلوں جیسی ہلکی دلائیوں کو خواتین بکل مار کر لپیٹ لیتی تھیں اور روئی ذرا نہ ٹوٹتی۔

مادھو میاں کی ایک خاصیت یہ تھی کہ ان کی دھنکی کے ساتھ ان کے کاندھے پر مٹ میلے سے کھیس کا ٹکڑا پڑا ہوتا تھا۔ جاڑا ہو یا گرمی، وہ ان کے لباس کا حصہ تھا۔ نماز کا وقت ہوتا (جس کا اندازہ

Scanned with CamScanner

وہ آنگن یا دیوار پر پڑتے سایوں سے لگایا کرتے تھے) تو وہ اس کثیف ٹکڑے کو بچھاتے جو جگہ جگہ سے مسک رہا تھا اور سر بسجود ہو جاتے۔ جو یاد آتا، پڑھ ڈالتے، جو بھول گئے ہوتے اس کی فکر نہ کرتے۔ بیوی اس جانماز کے کونے میں چنا چبینا باندھ دیتی تھیں۔ وہ اسے ظہر سے پہلے کھا لیتے۔ جانماز 'فری' ہو جاتی۔ جس کے گھر کام کر رہے ہوتے اس سے پانی مانگ لیتے۔ نہ کام ملا ہوتا اور کسی پیڑ کے سائے میں نماز پڑھی ہوتی تو کہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے نلکے سے کام چلا لیتے۔ ان کے دل میں ایک ہی آواز تھی: ان کے بیٹے اللہ رکھا عرف بنن کو دھنکی کاندھے پر رکھ کر گلی گلی مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ ایک تو کڑی مشقت، اس پر سے لوگوں کا تحقیر بھرا برتاؤ۔ ستم بالائے ستم، محلے میں گھومتے تو چھوٹی امت پیچھے لگ جاتی۔ "تنک تنک تائیں تائیں، بگنے کو کہاں جائیں۔" وہ لاکھ دھنکی سے دھمکاتے لیکن بے شرم بچے ذرا نہ ڈرتے۔ ایک حقیر دھنا اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا: ایک آدھ چپت لگا دیتا تو روزی روٹی پر بن آتی۔

اور وہ حقیر سا مفلوک الحال انسان باپ دادا کے وقت سے چلے آ رہے پشتینی دھندے سے بھی تو منھ نہیں موڑ سکتا تھا، اس لیے اس کی سوچ بھی اس سے آگے نہیں نکل سکی تھی۔ اللہ رکھا عرف بنن کے لیے ان کی خواہش بس اتنی ہی تھی کہ ایک دکان مل جائے اور وہ وہاں بیٹھ کر روئی دھننے اور دھاگہ ڈالنے کا کام کرے؛ جسے ضرورت ہو خود وہاں آ کر کام کرائے اور لے جائے۔

ان کے بے ریا، معصوم سجدے اللہ کے یہاں قبول ہوے۔ انتھک محنت اور انتہائی کفایت شعار زندگی کی وجہ سے انھوں نے اتنا پیسہ بچا لیا کہ عمر کے کچھ سال باقی رہتے انھوں نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے لی۔

اللہ رکھا نا خلف نہیں نکلے۔ ایسی ہی محنت کی جیسے مادھو میاں کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد دکان انھوں نے خرید لی۔ ایک غریب رشتہ دار عورت کو دھاگے ڈالنے کے کام پر ملازم رکھا۔ پھر کاروبار مزید بڑھا کر دکان پر کپڑوں کے تھان اور روئی بھی رکھنے لگے۔ ہنر کی قدردانی ہوئی۔ ان کی سوچ نے بھی ترقی کی اور مادھو میاں سے کئی قدم آگے نکل گئی۔ اپنے بیٹے کو انھوں نے پڑھنے کے لیے اسکول بھیج دیا اور گھر پر ٹیوٹر بھی رکھا۔ اللہ رکھا عرف بنن کو اپنا نام اور عرفیت دونوں سخت ناپسند تھے، اس لیے بیٹوں کے نام احمد حسین، رضوان حسین وغیرہ رکھے گئے۔ دکان قائم رہی لیکن جب اللہ

Scanned with CamScanner

رکھا اپنے والد کی عمر کو پہنچے تو ان کی حیثیت سپروائزر کی ہو گئی تھی، اس لیے کہ دکان اب کارندوں کے سپرد تھی۔ رضوان حسین پورا حساب کتاب رکھتے تھے اور شام کا خاصا وقت دکان کو دیتے تھے جسے وہ 'فیکٹری' کہا کرتے تھے۔ احمد حسین نے گریجویشن کی اور اس کے بعد اپنے اساتذہ کے مشورے سے، جنھوں نے ان کے ذہن رسا کا اندازہ لگا لیا تھا، وکالت پڑھی۔ کنبہ بڑھا تو انھوں نے الگ مکان لینے کی بات کی۔ اس میں کنبے کی پوری رضامندی شامل تھی۔ سید صاحب مکان بیچ رہے ہیں، یہ ایک دلال کی معرفت معلوم ہوا تو بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ (اور اس امید کے ساتھ بھی کہ سید کا مکان ہے، ضرور اس میں برکت ہوگی) انھوں نے وہاں ہجرت کرنے والے سید مسعود علی کا مکان خرید لیا، جو دراصل دو بھائیوں کے مشترکہ مکان کا نصف حصہ تھا۔ حسبِ توفیق انھوں نے اس کی مرمت کرائی، رنگ و روغن کرا کے مزید کارآمد بنایا جس طرح وہ اپنی اولاد کو بنا رہے تھے۔

احمد حسین نداف ولد اللہ رکھا ولد مادھو میاں نے بیٹے کا نام رکھا 'ایاز احمد وارثی' اس لیے کہ احمد حسین صاحب کو وارث پیا سے بے حد عقیدت تھی۔ دوسرے، وارثی ایک مبہم سا ٹائٹل ہے — مبہم اور باعزت اور صوتی اعتبار سے خوبصورت۔ وکالت پڑھنے کے بعد سے ذہن پر اور بھی جلا ہو گئی تھی۔ کہتے تھے، ''اب یہ لوگ جو صدیقی، فاروقی، علوی اور عثمانی وغیرہ لگاتے ہیں تو ہم تو کہیں، یہ سارا عقیدت کا کھیل ہے۔ میاں، ذرا پردادا سے اوپر جا کے تو کوئی دکھائے تو ہم جانیں۔ دادا کے باپ تک پہنچتے پہنچتے زیادہ تر لوگ ہکلانے لگتے ہیں، اور کہیں اُن کے بھی باپ کا پوچھ لیا تو بالکل ہی پالکی دھری رہ جائے گی۔ لیکن یار لوگ ہیں کہ ساڑھے چودہ سو برس کی خبر لا رہے ہیں! اور مان لیا شجرہ موجود بھی ہے تو...''

تو سن لیجیے ڈپٹی صاحب کی کہانی

ڈپٹی سلیم احمد صدیقی نے (ڈپٹی جن کے نام کا جزوِ لاینفک تھا) اپنی بیٹی کی شادی شیوخ کی ایک ایسی شاخ کے فرزندِ ارجمند سے طے کر دی جو 'شیخ گھڑلدے' کہلاتے تھے، اس لیے کہ کبھی امتدادِ زمانہ سے مجبور ہو کر چند پشت پہلے ان کے گھر کے کچھ افراد گھوڑوں پر سامان لے کر بیچنے نکلے تھے۔ اس طرح انھوں نے سوداگری شروع کی تھی۔ ڈپٹی سلیم احمد صدیقی کے خاندان کے زیادہ تر

Scanned with CamScanner

لوگ یا زمیندار تھے یا بڑے کاشتکار۔ نئی نسل کے کچھ افراد سرکاری نوکریوں میں بھی آرہے تھے (جن کے رول ماڈل ڈپٹی سلیم احمد تھے) اور گرچہ رسولِ خدا نے خود نہ صرف تجارت کی بلکہ تجارت کو ایک افضل پیشہ قرار دیا، بیچارے شیخ گھڑلدے اس تحقیر آمیز خطاب سے نوازے گئے۔ حالانکہ اب گھوڑوں پر سامان لاد کر اِدھر اُدھر لے جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی اور جماعت مختلف دھندوں، بشمول تجارت، میں لگی ہوئی تھی لیکن یہ خطاب ان پر چپک گیا تھا۔ جو شیوخ خود کو برتر قرار دیتے تھے وہ ان کے یہاں شادی بیاہ سے اجتناب کرتے تھے اور اس طرح کے رشتے کو جو ڈپٹی سلیم احمد نے طے کیا، باعثِ تذلیل گردانتے تھے۔

روایت سے بغاوت کرنے والے گرچہ بہت کم ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں رہے ہیں۔ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کو 'ملیچھ' کے ذلیل لقب سے نوازنے کے باوجود تیسری صدی قبل مسیح میں چندر گپت موریہ نے ان ہی ملیچھوں میں سے ایک کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ ڈپٹی سلیم احمد بھی روایتوں کے باغی تھے۔ انھوں نے اپنی ڈپٹیانہ نظر سے گھڑلدوں کے بیٹے کو پرکھا اور اسے نہایت لائق و فائق جانا، بیٹی دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی اور شادی طے کر دی۔ (آخر تھے تو وہ بھی شیوخ ہی! اس سے آگے کی بغاوت تو انھوں نے کی نہیں تھی۔) خیر، خبر عام ہوئی تو ایک رشتے دار بزرگ درّاتے ہوئے ڈپٹی صاحب کے اجلاس میں گھس آئے۔ (خاصے عمر دراز تھے، اس پر لہراتی ہوئی نورانی ڈاڑھی، لانبے اور بارعب۔ اردلی سے ڈپٹ کر بولے، ''ہم ڈپٹی صاحب کے چچا ہیں۔'' وہ انھیں روک نہ سکا۔)

''کیا میاں، یہ کیا سن رہے ہیں؟ خاندان میں لڑکوں کا کال تھا؟''

''نہیں، بالکل نہیں تھا۔ ایک سے ایک نالائق موجود ہیں،'' جواب ملا۔

''تمھارے اندر سرکاری نوکری کا تکبر آ گیا ہے۔ اللہ سے توبہ کرو۔ سب کو نالائق قرار دے رہے ہو!''

''اور آپ شیوخ کی ایک بڑی جماعت کو نالائق قرار دے رہے ہیں۔''

''بالکل نہیں! ہوں گے وہ اچھے، لیکن بیٹی تو کفو میں ہی دی جاتی ہے۔''

''سنیے بزرگوار، میں نے کفو کے تین معیار مقرر کیے ہیں: شرافت، تعلیم اور وجاہت۔ اگر کوئی

Scanned with CamScanner

لڑکا ان پر پورا اترتا ہے تو میں بلا تکلف بیٹی بیاہوں گا، پھر وہ شیخ گھڑلدا ہو یا خرلدا۔ اب آپ تشریف لے جائیں، میں مصروف ہوں۔ مگر ہاں، ذرا ٹھہریے۔" انھوں نے گھنٹی بجا کر اردلی کو طلب کیا۔ "باہر ایک صاحب بیٹھے ہوں گے، رجب علی بلبل، انھیں اندر بھیج دیجیے۔ اور ہاں، چائے بھی منگوا لیجیے۔"

رجب علی ایک چڑی مار صورت، مفلوک الحال مقامی ہستی تھے۔ شعر و شاعری میں شد بد رکھتے اور بلبل تخلص فرماتے تھے۔ عرصے سے باریابی کے خواہشمند تھے۔ کئی مرتبہ آن آن کے لوٹ چکے تھے۔ آج بھی پرزہ اندر بھجوا کے کوئی گھنٹے بھر سے جھک مار رہے تھے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

"بلبل صاحب!" ڈپٹی صاحب نے مخاطب کیا۔

"جناب والا!" وہ گھٹنوں تک جھک گئے۔

"ہمارے ہونے والے داماد شیخ جاوید حسن گھڑلدے (گھڑلدے کو انھوں نے قدرے تبسم کے ساتھ ادا کیا) کا ایک شجرہ تیار کیجیے تو! والد کا نام شیخ ولی حسن۔ دادا شیخ علی حسن۔ آگے آیت۔ پھر آپ جائیں۔" ڈپٹی صاحب ادائے بے نیازی سے فائلوں پر جھک گئے۔ اگلے دن کئی اہم مقدمے ان کے اجلاس میں پیش ہونے والے تھے۔

اگلے دن بلبل صاحب شجرہ لے آئے۔ شیخ جاوید حسن صدیقی کا سلسلۂ نسب سیدھا حضرت ابوبکر صدیق سے مل رہا تھا۔ اونٹوں پر سامان لاد کر تجارت کرنے والے حضرات کے اسلاف ہندوستان آ کر گھوڑوں پر تجارت کریں (کہ یہاں اونٹ کچھ ریگستانی علاقوں کو چھوڑ کر باقی جگہوں کے لیے نہ درکار ہیں نہ دستیاب) تو یہ تو عین عزت افزائی ہے۔ کمتر ٹھہرانے کا جواز کہاں نکلتا ہے! جو ٹھہرائیں وہ گردن زدنی۔

ڈپٹی صاحب نے ہنس کر پوچھا، "بلبل میاں، آپ کو یہ ان کے اسلاف کے سارے نام کہاں سے مل گئے؟"

"علی حسن صاحب کے اوپر دو نام تو حقیقی مل گئے تھے۔ کچھ بزرگ رشتے داروں سے تحقیق کر لی تھی۔ اس کے بعد حضور، آپ کا حکم تھا، اس لیے باقی شاعری ہے۔"

ڈپٹیانہ وقار کو بھول کر ڈپٹی سلیم احمد صدیقی نے قہقہہ لگایا، گھنٹی بجا کر چپراسی کو طلب کیا اور چائے کے ساتھ سموسے بھی منگوائے۔

Scanned with CamScanner

(ڈپٹی صاحب کی داستان کے راوی نوے سالہ حکیم خلیق احمد صدیقی تادمِ تحریر بقیدِ حیات ہیں۔ یہ داستان انھیں ڈپٹی صاحب نے بہ نفسِ نفیس سنائی تھی۔ شیخ گھڑلدوں سے حکیم صاحب موصوف کی ذاتی واقفیت بھی تھی۔)

مکان کا نصف حصہ دشمنوں کے قبضے میں چلے جانے اور پڑوس دوام کا احتمال ہونے سے سید محمود علی کی بیگم خاصی کبیدہ خاطر تھیں۔ بار بار ذہن میں آتا تھا کہ یہ وسیع و عریض مکان پورا ان کے قبضے میں ہوتا۔ محلے کے اندر ہونے کی وجہ سے قیمت نہایت واجب لگی تھی، وہی وہ بھی دے دیتیں۔ درمیان کی دیوار گرا کر کچھ ترمیم و تزئین کے بعد کیا عمدہ حویلی کی صورت ہو جاتا۔ بیٹوں کی شادیاں ہوں گی، بہویں آئیں گی۔ زہرا کی تعلیم مکمل ہو رہی تھی، داماد بھی آئے گا ہی۔ اچھے علاقے میں مکان خرید نا فی الحال بساط کے باہر تھا۔ وہ بھی اب تو فلیٹ مل رہا تھا، مکان تھے کہاں۔ ایک مرتبہ دلال آیا تھا۔ جو قیمت لگائی، فلیٹ خریدنے کے لیے بھی اس میں اور چند لاکھ ڈالنے پڑتے۔ محمود علی خاموش رہ گئے۔ صاحبزادے اڑے ہوئے تھے: ایم بی اے کریں گے۔ مہنگا سودا تھا۔ ان کے لیے بڑی رقم درکار تھی۔ پرس سنبھال کر باہر نکلتے ہوئے محمود علی کی اہلیہ نے مکان کے نصف حصے کے دروازے پر 'احمد حسین بی اے، ایل ایل بی' کی تختی پر نظر ڈالی۔ دیور اور چچازاد بہن کے خلاف دل میں غصے کا طوفان اٹھا، لیکن پھر جیسے اچانک ہی اس میں کسی نے پاور بریک لگا دیے۔ ان کی توجہ سامنے سے آتے ہوئے ایک نہایت خوش شکل اور اسمارٹ نوجوان پر پڑی۔ نظریں نیچی کیے، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ دوسرے حصے کی کال بیل پر انگلی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے جواب ملنے میں کچھ دیر لگی۔ دھوپ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''شاید کوئی ملنے والا ہوگا۔ لڑکوں کا ساتھ براتی۔ اللہ کی شان! ان کے لڑکے بھی تو اب خوب پڑھ رہے ہیں،'' بیگم محمود نے سوچا۔ تبھی اس لڑکے کی نظریں ان پر پڑیں۔ اس نے نہایت شائستگی سے سلام کیا۔ قدرے بے دلی سے سر ہلاتی وہ آگے بڑھ گئیں۔

تیسرے چوتھے دن اسی لڑکے نے محمود علی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اتفاق سے بیگم محمود علی ہی سامنے آئیں۔ ''کیا ہے میاں؟ آج پھر تمھیں جواب نہیں مل رہا کیا؟''

لڑکے کی سمجھ میں بات کچھ آئی نہیں۔ وہ کافی کنفیوزڈ سا لگا۔ پھر اس نے کہا، ''آنٹی، امی نے

سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ آج ذاتی مکان میں منتقل ہونے کے لیے مغرب بعد شکرانے کا میلاد کرا رہی ہیں۔ آپ ضرور آئیں۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں اور جناب مسعود صاحب کے سگے رشتے دار بھی۔ ہم خود حاضر ہوتے لیکن گھر میں ساز و سامان منتقل کرنے میں اتنے مصروف رہے۔ امی نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کچھ خیال نہ کریں، بعد میں وہ ضرور آئیں گی۔"

"تم کون ہو میاں؟"

"جی، ہمارا نام ایاز احمد وارثی ہے۔ ہمارے والد نے آپ کے بھائی صاحب سے یہ مکان خریدا ہے۔ جمعے کی نماز میں میری اور والد صاحب کی جناب محمود صاحب سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ہم ان ہی کی صف میں تھے۔" وہ مسکرایا۔ اس کے ایک گال میں گڈھا پڑا جس سے اس کی وجاہت میں اضافہ ہو گیا۔

محمود صاحب کی اہلیہ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اللہ کی شان! یہ ان لوگوں کا بیٹا ہے۔ کیسا ستھرا اجلا نقشہ، صاف رنگ، لانبا، اور بولی چالی تو دیکھو۔ خوب بڑھ رہے ہیں لوگ۔ ان ہی کو عروج ہے آج کل۔ یہاں ہم بیٹی کا رشتہ تلاش کر رہے ہیں تو ایک گت کا لڑکا نہیں دکھائی دے رہا برادری میں۔

"کہہ دینا امی سے، ہم آئیں گے،" وہ قدرے رکھائی سے بولیں۔

پھر چونک کر پلٹیں۔ "کیا نام بتایا تھا؟"

"جی، ایاز احمد وارثی۔"

زیرِ لب مسکرائیں۔ انھیں معاً شیخ چراغ علی قادری یاد آ گئے۔

قدرِ مشترک درمیانِ ایاز احمد وارثی و شیخ چراغ علی قادری

بیگم محمود کے ننیہالی قصبے میں ایک دور دراز کے نابینا رشتے دار شیخ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ حافظِ قرآن تھے اور نیکوکاروں میں شمار۔ محلے میں صرف ان کا مکان پختہ اور دو منزلہ تھا، باقی سب مکان کچے اور ایک منزلہ تھے۔ تین سو قطعات کی اس مترفعہ داری میں خمرے اور بنکر آباد تھے۔ شیخ صاحب عموماً بان کے پلنگ پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے۔ اکثر دو چار حواری موالی بھی مودب بیٹھے دکھائی پڑ جاتے۔ ان کی رعیت میں سے جو بھی چھوٹا بڑا گزرتا، 'السلام علیکم جی شیخ جی' کہتا ہوا گزر

Scanned with CamScanner

جاتا۔ شیخ صاحب نابینا تھے، لیکن تمام نابینا افراد کی طرح ان کی باقی حسیں نہایت تیز تھیں۔ آواز تو سب کی جانتے ہی تھے، کبھی تو قدموں کی چاپ سے پہچان لیتے کہ برابر سے کون گزر رہا ہے۔ اس دن بھی دور سے آتی جوتے پہنے ہوئے پیروں کی چاپ سے وہ سمجھ گئے کہ کلن انصاری کا چھٹیوں میں گھر آیا جوان بیٹا چلا آرہا ہے۔

''السلام علیکم!'' لونڈے نے بڑی زور سے سلام داغا لیکن اس کے قدم ہلکے نہیں پڑے۔ طرّہ یہ کہ السلام علیکم کے فوراً بعد اس نے ہلکے سروں میں سیٹی بھی شروع کر دی تھی۔ وہ چند قدم بھی نہ بڑھ پایا تھا کہ شیخ شفاعت حسین کا بھاری بھرکم باریش جسم اس پر آن پڑا، اور قبل اس کے کہ وہ اس آفتِ ناگہانی کی نوعیت کو سمجھ سکے، دے دھما دھم، دے دھما دھم... چھت کی طرح اسے کوٹ کر رکھ دیا۔

''حرامزدہ! کم ذاتوں کی بدذات اولاد! علی گڑھ پڑھنے گیا ہے تو تمیز سیکھ کر آتا، اُلٹا اپنی اوقات بھلا بیٹھا۔'' تھک کر شیخ شفاعت حسین پھر پلنگ پر جا بیٹھے۔

شام کو 'رعیت' کا ایک گروہ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، 'لمڈے' کی کم عقلی اور بدتمیزی کے لیے اجتماعی معافی مانگی۔ چار برس سے علی گڑھ میں پڑھ رہا تھا، بھول گیا تھا، سلام کیسے کرنا ہے، اور یہ کہ چونکہ کم عمر لڑکا تھا اس لیے قدم بوسی کے بعد ہی آگے بڑھنا ہے۔ 'لمڈا' ساتھ نہیں آیا۔ اس کی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی کہ بدن میں درد ہے، پیٹھ پر والدہ محترمہ ہلدی چونے کا لیپ لگا رہی ہیں؛ گرچہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اگلے ہی دن علی گڑھ واپس لوٹ گیا تھا۔ شیخ صاحب بہت دن سے اس کنبے سے خار کھائے ہوئے تھے جس نے لڑکے کو پڑھنے علی گڑھ بھیجا تھا۔ یہ تاریخی واقعہ جائے حیرت بھی تھا اور جائے عبرت بھی۔ خمروں کو تو پختہ مکان بنانے کی بھی اجازت نہیں تھی، نہ اپنا مکان شیوخ کے مکانوں سے اونچا کرنے کی۔ بنکروں کی آبادی کے مالی حالات کچھ بہتر تھے لیکن پھر بھی ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ محلے کے سربرآوردہ بزرگ کے پاس جا کر نام تجویز کراتے۔ وہ عموماً دن کے حساب سے بدھو، جمعراتی، جمن میاں، ممدو، سدّو، گھسیٹا، اللہ رکھا قسم کے نام رکھ دیتے۔

اللہ رکھا کے یہاں بیٹا ہوا تو وہ نام رکھوانے نہیں آیا۔ دراصل ٹھیک اس کی ولادت کے وقت اس کی دادی نے چراغ میں تیل ڈال کر بتی اکسائی تھی۔ دادا میاں نے جو گھسیٹا انصاری کے نام سے

جانے جاتے تھے، بچے کا نام 'چراغ علی' تجویز کر دیا۔

چراغ علی دو ماہ کے ہوئے تو، بقول ان کی والدہ، ان پر کسی مونث آسیب کا سایہ ہو گیا اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت تھے۔ کاجل کے ٹیکے کی اس آسیبی نے چنداں پروا نہ کی، اس لیے پھنکوانے کے لیے چراغ علی کے والد میاں اللہ رکھا انھیں لپیٹ لپاٹ کر نانا پیر حافظ شیخ شفاعت علی کے پاس لائے۔

"بچے کا نام ابھی تک نہیں رکھا گیا ہے،" شیخ صاحب نے فرمایا۔

میاں اللہ رکھا نہایت شرمندہ ہو گئے۔ بولے، "والد صاحب نے چراغ علی تجویز کیا ہے۔"

شیخ صاحب پر ذرا کی ذرا سناٹا چھا گیا۔ بغاوتوں کے چڑیا کے پر جسے ہلکے پھلکے بیچ ہواؤں کے دوش پر اڑنے لگے تھے۔

"ہم اسے چرغنا کہیں گے،" قدرے توقف کے بعد انھوں نے فرمایا۔ "اور تم سب بھی۔ چرغنا کے نام سے ہی اس کے لیے دعا کر رہے ہیں۔" انھوں نے پھونک ماری۔ پھر انھوں نے 'پڑھی ہوئی' سونف لا کر دی۔ "یہ سونف ابال کر اس کا پانی دن میں دو بار پلا دیا کرنا۔" بچہ پیٹ کے اپھارے کی وجہ سے روتا رہتا تھا، سونف کا پانی پی کر دو چار روز میں چنگا ہو گیا۔

میاں چرغنے بڑے ہوئے تو محلے میں لونڈوں سے دھول دھپا، سید صاحب کے باغ کے آم امرود چرانا، آوارہ گردی کرنا ان کا معمول بن گیا۔ باپ دادا دریاں اور کھیس بناتے آئے تھے، یہ انھیں ہرگز راس نہ آیا۔ تنگ آ کر والدین نے انھیں بہار میں رہنے والے رشتے داروں کے ایک کنبے کے پاس بھیج دیا۔ وہ وہاں کچھ دن رہے۔ یہ کنبہ سنہ چھیاسٹھ میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلا گیا اور چرغنے کو ان کے والدین کی اجازت سے ساتھ لیتا گیا۔ کسی طرح یہ حضرات سنہ اکہتر کی خونریزی سے بچ گئے۔ چراغ علی پر بچپن میں جو مونث آسیب عاشق ہوئی تھی، شاید اس نے انھیں یہاں بھی ڈھونڈ نکالا اور ان پر انعام و اکرام کی بارش کر دی۔ دراصل چراغ علی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ناسازگار حالات میں محنت اور دیانت ہی ایک شخص کے سب سے اچھے دوست ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ کامیاب رہے۔ صاف رنگ، مضبوط قد کاٹھی اور معقول ذریعۂ معاش کی وجہ سے ان کی شادی ایک اچھے خاندان میں ہو گئی۔ سنہ اُنسٹھ میں شیخ چراغ علی اینڈ سنز کا ایک پھلتا پھولتا کاروبار تھا اور 'اینڈ سنز'

Scanned with CamScanner

اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک اچھی شریک حیات نے گھر سنبھال رکھا تھا۔ ایسے میں چراغ علی کو وطن عزیز کی یاد آئی۔ لوٹے تو سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے، کلائی میں بیش قیمت گھڑی تھی اور بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

پرانے شناساؤں میں شیخ شفاعت علی کے یہاں بھی پہنچے۔ محلے کا واحد پختہ مکان کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جہاں پائیں باغ تھا وہاں چراغ علی کے ہی کچھ دور کے رشتے داروں نے قبضہ کر کے برش کا کارخانہ لگا لیا تھا۔ بزرگ مکین مر کھپ گئے تھے، جوان روزی روٹی کی تلاش میں باہر تھے۔ صرف ایک بزرگ خاتون، جو چراغ علی کے بچپن میں نوجوان لڑکی تھیں، باقی رہ گئی تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ مع اپنے نالائق لڑکے، اس کی پانچ اولادوں اور بہو کے ساتھ کھنڈر پر دعویٰ ٹھوک کر آن بسی تھیں۔ خاصی ریسرچ کرنے کے بعد چراغ علی نے آ کر ایک بچے سے کہا:

''بیٹا جاؤ، اندر کہہ دو کہ شیخ چراغ علی آئے ہیں۔''

لڑکے نے باہر آ کر جواب دیا، ''دادی کہہ رہی ہیں، ابا نہیں ہیں، پھر آئیو۔''

انھوں نے فرمایا، ''کہہ دو، آپ کی بھی قدم بوسی چاہتے ہیں۔''

وہ کچھ حیران سی ہو کر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے آن کھڑی ہوئیں۔ ''کون ہے؟ ہم سے ملنے کون آیا؟''

''خالہ، ہم ہیں چراغ علی۔''

''کون چراغ علی؟''

''زمانہ پہلے ہمارے ابا کوئی آٹھ سات گھر چھوڑ کر رہا کرتے تھے۔ اللہ رکھا صاحب۔ ہم ان کے بیٹے ہیں۔ آپ اکثر ہم سے دوپٹے رنگنے کو رنگ منگوایا کرتی تھیں اور ابرق۔''

انھوں نے آنکھوں پر ہاتھ سے چھجا بنایا۔ ذرا سا پردہ ہٹا کر اس کی درز سے باہر جھانکا تو ذہن میں کھد بد کھد بد کچھ پکا۔

''ارے کمبخت، یوں کیوں نہیں کہتا، چرغنا ہے!'' وہ پردہ ہٹا کر یوں باہر نکل آئیں کہ ایک قدیم عادت کے تحت پیٹھ پر دھول جمانے کو ہاتھ اٹھا ہوا تھا لیکن ایک لانبے، مضبوط، ادھیڑ عمر، خوش لباس شخص کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئیں۔

Scanned with CamScanner

اس کے چہرے پر چراغ روشن تھے اور پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

''آجا، آجا، اندر آجا، چل بیٹھ۔'' انھوں نے پھٹیچر سا مونڈھا سرکایا۔ کچھ دیر بعد درار پڑی پیالی میں اونٹی ہوئی چائے دو کھڑ کھڑے بسکٹوں کے ساتھ پلائی، نام بنام سب کی خیریت پوچھی۔ چلتے وقت پانچ روپے کا مڑا تڑا نوٹ نکال کے دیا۔ ''بچوں کے لیے کچھ لیتے جائیو۔'' شیخ چراغ علی نے وہ مڑا تڑا کثیف نوٹ اپنے چمڑے کے بیش قیمت بٹوے میں سوسو کے نوٹوں کے درمیان رکھا اور سلام کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دل میں کہیں ایک ٹیس سی اٹھی۔ جب بھی ان کی والدہ اس ڈیوڑھی پر سلام کرنے کو حاضر ہوتیں، بچوں کے ہاتھ میں ایک آدھ مٹھائی کا ٹکڑا دیا جاتا یا بسکٹ۔ چلتے وقت دونی چونی جیسی رقم ضرور عطا کی جاتی۔ روایت برقرار تھی۔

(کہانی کے پہلے نصف حصے کے راوی احمد صدیق، پروفیسر شعبۂ قانون، دہلی یونیورسٹی، کا انتقال ہو چکا ہے؛ دوسرے حصے یعنی چراغ علی کے شناسا سید شفیع الزماں کا سایہ ان کے اہل وعیال پر قائم ہے۔)

تو چونکہ بہت سی روایتوں کے برقرار رہنے کے باوجود پل کے نیچے، بہت سا پانی بھی بہہ چکا تھا اس لیے محمود علی صاحب کی اہلیہ احمد حسین وارثی/ نداف کی اہلیہ کے ہاں میلاد میں تشریف لے گئیں۔

ربیع الاول کے مہینے میں میلاد محمود صاحب کے یہاں بھی ہوتا تھا۔ رشتے داری، تعلقات، سب طرف کی عورتیں جمع ہوتیں۔ سال بھر سے بند کرم خوردہ مولودِ سعیدی یا میلادِ اکبر کو جھاڑ پونچھ کر نکالا جاتا۔ ثناء اللہ کی اہلیہ کو (جو عرف عام میں 'دروغائن' کہلاتی تھیں) جھوم جھوم کر پاٹ دار آواز میں میلاد و سلام پڑھنے اور میاں کی رشوت کی کمائی میں ملے نوٹوں کی گڈیاں جھاڑ جھاڑ کر گدوں کے اندر چھپا کر رکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

ثناء اللہ عثمانی ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچ کر حال میں ریٹائر بھی ہو چکے تھے لیکن بیوی کے ساتھ لفظ 'دروغائن' چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ ایسا برا بھی نہ مانتیں۔ عزیزوں، رشتے داروں اور دوست احباب، کسی کے گھر زنانہ میلاد ہوا تو میلاد خوانی کے لیے انھیں ہی مدعو کیا جاتا۔ لیکن اِدھر میلاد پڑھ، دوہرا حصہ سنبھال، وہ موٹر میں چڑھتیں اور اُدھر گھر والے و بقیہ حاضرین ان کی بخیہ ادھیڑنی

شروع کرتے۔

''سنا ہے ایک فلیٹ گلستان میں بھی بک کیا ہے۔''

''بڑی مہنگی عمارت ہے۔ وہ تو علاقے کے دام ہیں!'' آواز میں رشک نمایاں تھا۔

''ریٹائر ہوتے ہوتے اتنا کما لیا کہ اگلی دو تین پشتیں آرام سے کھا سکیں۔ مکان دیکھا ہے علی نگر والا؟''

''یہ تو جب داروغہ تھے تب ہی چھوٹ کر کما رہے تھے۔ ڈی ایس پی ہو گئے، وہ بھی ٹریفک میں! اس کے بعد سے تو وارے نیارے۔''

''سب دیکھ رہے ہیں بھائی! لڑکوں کو ڈونیشن والے کالجوں میں پڑھا رہے ہیں۔ ایک ڈاکٹر، باقی دو انجینئر۔ ہمارے لڑکے بیچارے پڑھ پڑھ کر مر گئے لیکن مقابلے کا امتحان کلیئر نہیں کر سکے۔''

''اجی، ڈونیشن کی بات چھوڑیے، وہاں تک تو جائز ہے۔ انھوں نے اور کئی اور لوگوں نے تو مقابلے کے امتحانوں کو دولت کے بل بوتے پر پھوڑ لیا۔ وہ کیٹ (CAT) والا ہنگامہ نہیں یاد؟ بس دو تین سال ہی تو ہوے۔''

''رنجیت ڈان والا؟''

''ہاں صاحب، سی بی ایس ای اور کیٹ کو نا قابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اب لوگ لاکھوں دے کر کسی لائق امیدوار کو دھکا دے کر اپنے بچوں کو اس کی سیٹ پر لے آتے ہیں۔''

''بیٹی کی شادی فائیو اسٹار ہوٹل سے کی۔''

''لوگ اللہ سے ڈریں نہ عاقبت سے۔''

''لے، آخرت سے کیا ڈرنا! اب ڈی ایس پی صاحب مع دروغائن حج کرنے جا رہے ہیں۔ ڈاڑھی بھی چھوڑ چکے ہیں۔ گناہ ثواب کا پلہ برابر ہو جائے گا، جنت کے دروازے کھل جائیں گے!''

''نہ کھلے تو وہاں بھی رشوت دے دیں گے۔ یہاں لیتے آئے تھے، وہاں دے کے چھوٹ جائیں گے۔''

(یہ کمنٹ زہرا کا تھا۔)

''اجی، تم کون سی اللہ رسول سے ڈرو ہو! یہ نئی نسل دیدے کی صاف، زبان کی تیز۔ لو، داروغہ

Scanned with CamScanner

جنت کو رشوت خور ٹھہرادیا!''

گفتگو کا رخ نئی نسل کی طرف پھر گیا۔ زہرا وہاں سے سٹک لی۔ چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔

دروغائن کو فخر تو تینوں بیٹوں پر تھا لیکن ڈاکٹر بیٹے پر انھیں خصوصی گمان تھا۔ زیادہ تر اچھے گھروں کے لونڈے واہی تباہی ڈنڈے بجاتے گھوم رہے تھے اور نیچ ذاتوں کو عروج حاصل تھا۔ ان کا کنبہ ان چند کنبوں میں تھا جہاں بیٹی تک نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پونا کی ایک درسگاہ میں بھاری عطیہ دے کر اسے ایم سی اے کرایا گیا تھا۔ تعلیم کے دوران ہی رشتہ پکا ہو گیا تھا اور ریٹائر ہونے سے چند ماہ قبل دروغائن کے ڈی ایس پی شوہر نے اس کی شادی کر دی تھی، جس کا خاصا چرچا رہا تھا۔ اب بڑے لڑکے کی باری تھی۔ رشتے تو بہت آ رہے تھے، لیکن دروغائن کو ڈاکٹر کے لیے زہرا بہت پسند تھی اور اس کا عندیہ وہ ظاہر کر چکی تھیں، جس پر محمود علی ایگزیکٹیو انجینئر کی بیوی دبی دبی خوشی کا اظہار کر چکی تھیں۔ شادی کے بازار میں ڈاکٹر کا بھاؤ بہت تیز تھا۔ اگر ڈاکٹر کی ماں از خود لڑکی پسند کرے تو سودا مہنگا نہیں رہے گا۔ ابھی لمبی ڈاڑھی والے متین خاں نے بیٹے کی شادی میں ایک فلیٹ اور گاڑی کا مطالبہ کیا تھا۔

لمبی ڈاڑھی و لمبی گاڑی

متین خاں محکمۂ نہر میں اوورسیئر تھے۔ (اوورسیئر حضرات آج کل 'جونیئر انجینئر' کہلاتے ہیں۔) کمانے کی گنجائش تھی، خوب کمایا بھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد خدا یاد آیا، اس لیے کہ خدا سے ملاقات ہونے کا وقت قریب آتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی ڈاڑھی پہلے سے تھی، اسے انھوں نے کچھ اور بڑھا لیا۔ اب ٹھڈی نیچے کرتے تو ڈاڑھی سینہ چھوتی۔ مسجد میں درسِ قرآن شروع کرایا اور مرمت کے لیے بھاری عطیہ بھی دیا۔ مزید ترقی ہوئی، تبلیغی جماعت کے رکن بن گئے۔ بیٹا ایک ہی تھا، اور تھا ہونہار۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ کلاس ٹو گورنمنٹ پوسٹ مل گئی، جو آگے چل کر یقینی طور پر کلاس ون میں تبدیل ہونے والی تھی۔ لڑکی والے فیصلہ کن بات چیت کے لیے آئے تو عام سا سوال پوچھا، ''بھئی کوئی مطالبہ ہو تو پہلے بتادیں۔'' والد کہنے لگے، ''فی الحال تو مغرب کے لیے مسجد جا رہا ہوں۔ پھر گشت میں نکل جاؤں گا۔ میرا کیا مطالبہ ہو سکتا ہے، جو ہے وہ اُسی سے ہے۔'' انھوں نے آسمان کی

Scanned with CamScanner

طرف ہاتھ اٹھائے۔ ''ہاں، لڑکوں اور والدہ سے پوچھ لیجیے۔'' لڑکوں میں ایک تو صاحب معاملہ تھے، دوسرے بڑے صاحبزادے تھے جو شادی شدہ تھے۔

کافی دیر آئیں بائیں شائیں کے بعد اندر سے کہلایا گیا کہ لڑکے کو فوروہیلر دی جائے۔ لڑکی والے مان گئے۔ اتنی بساط تھی ان کی۔ دوسرے دن صبح ایک اور فون آیا۔ ''اب بھائی، گاڑی دیں تو ذرا ایسی دیجیے گا کہ حال کلاس ٹو اور مستقبل کلاس ون افسر کے مرتبے سے میل کھاتی ہوئی ہو، ورنہ جسے دیکھیے وہ ٹچی سی ماروتی 800 لیے گھوم رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو اب یہ لونڈوں کو دی جاتی ہے کہ لو، شہر کی سڑکیں ناپو، بعد میں بڑی بھی لے لینا۔''

''ہمارے لیے پیغام آنے لگے ہیں صاحب، ذرا ہوشیار ہو جائیے!'' زہرا نے شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

''ہمارے لیے بھی،'' ایاز نے نہایت سنجیدگی سے گھاس کا تنکا توڑتے ہوئے کہا۔

''تنکے کیوں چننے لگے؟''

''اس لیے کہ آپ ان پیغامات پر جو آپ کے لیے آرہے ہیں، اتنی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔''

''احمق ہیں آپ!''

''وہ تو اسی دن قرار پائے جس دن دل آپ کی نذر کیا۔''

''یہ بے بضاعت سی شے لے کر ہم کیا کریں گے؟ واپس لے لیجیے۔''

''چلیے، واپس لیا۔''

زہرا سچ مچ ناراض ہوگئی۔ ''اب کیا میرے نکاح میں گواہ بننے کا ارادہ ہے؟''

''تو کیا کریں؟ آپ کے ابا آپ کے دادا کی چھڑی لے کر دوڑا لیں گے۔ چھڑی کی موٹھ چاندی کی ہے، زور سے لگے گی۔''

''سیدزادی سے شادی کرنے کے لیے دو چار چھڑیاں کھا لینا ایسی کوئی بات نہیں۔ اگلی نسل سدھر جائے گی۔''

''محترمہ، نسل باپ سے چلا کرتی ہے۔ آپ کے یہاں بھی مادری نظام رائج نہیں ہے۔''

Scanned with CamScanner

''اجی چھوڑیے! نسل اس سے چلتی ہے جس کا پلہ بھاری ہو۔ ہمارے ہر دلعزیز راجیو گاندھی نہرو کے نواسے ہی کہلاتے رہے۔ ان کے والد کا نام تو ضرور معلوم ہے، دادا کا بتادیں تو ابھی آپ کو سونے کا تمغہ دے دیں ہم۔''

ایاز نے سر کھجانا شروع کر دیا۔ ''سیدزادی ہونے کا خاصا زعم آپ کو بھی ہے، جبکہ حضور نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا تھا کہ اے فاطمہ، اس زعم میں نہ رہنا کہ رسول کی بیٹی ہو، روزِ آخرت تمھارے اعمال تمھارے ساتھ اور میرے اعمال—''

''اور حضور نے یہ بھی فرمایا تھا،'' زہرا نے مصرع اٹھانے کے انداز میں بات کاٹ کر آگے کہنا شروع کیا، ''تم میں سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں—''

''نہ کالے کو گورے پر نہ گورے کو کالے پر—''

''نہ عربی کو عجمی پر نہ عجمی کو عربی پر— مگر ایاز صاحب، ہم سے شادی کر لیجیے گا تو بچے خم ٹھوک کر اپنا نام بتائیں گے۔ مثلاً، بیٹے کا نام کیا رکھیں گے آپ؟''

''فرض کیجیے، کیقباد احمد وارثی—''

''یہ کیقباد کیا ہوا؟ واہیات نام ہے۔''

''یہ نہایت مدبر رعایا پرور سلجوق سلطان تھا۔ کچھ مورخین نے تو اسے کیقباد دی گریٹ کہا ہے۔''

''کہا ہو! یہ سید کیقباد دی گریٹ احمد وارثی چلے گا نہیں۔''

''تو کوئی اور ذریعہ نکالیے کہ ہم اپنا سلسلۂ نسب یا عرب سے جوڑ سکیں یا سینٹرل ایشیا سے، خواہ ہم وہاں فوج میں گھوڑوں کی لید سمیٹنے پر کیوں نہ مامور رہے ہوں یا راہزن بدوؤں کی جماعت میں ہوں۔''

''یہ تمھارا احساسِ کمتری بول رہا ہے۔''

''زہرا، کیا تم سنجیدہ ہو؟'' ایاز کے لہجے میں خفیف سی دھار تھی اور کچھ حیرت بھی۔

زہرا دہشت زدہ ہو گئی۔ ''فار گاڈز سیک ایاز!'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پارک میں آس پاس کوئی دکھائی نہیں دیا۔ صرف ایاز کی موٹر سائکل چمک رہی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی، اتنا

Scanned with CamScanner

قریب کہ اس کی سانسوں کو اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ ''آئندہ ایسا نہ کہنا نہ سوچنا۔ میں جس مردِ مومن کے ساتھ اپنی باقی ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اس سے زیادہ عظیم میری نظروں میں کوئی نہیں۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ ''اور ہاں،'' اس نے خود پر قابو پا کر کہا، ''تم شوق سے ہمارے بیٹے کا نام کیقباد رکھنا۔ مجھے تمھاری کسی بات پر کبھی اعتراض نہ ہوگا۔'' اس بار اس کی آواز میں مسکراہٹ سے روشن تھی۔

''احمق الذی،'' ایاز نے اسے تیزی سے اور قریب کر لیا۔ ''کیقباد کی اماں! کیکاؤس کیسا رہے گا؟ نہیں تو پھر اریق بوغا۔ یہ سارے سینٹرل ایشیا کے گھاس کے میدانوں کی خوشبو میں بسے ہوئے نام—''

زہرا نے اس کے پورے چہرے کو اپنے ہاتھ سے ڈھک کر زیرلب کہا، ''پاگل کہیں کے۔''

''گھر میں بیری ہو تو ڈھیلے آتے ہی ہیں، لیکن ایسا بے ڈھب ڈھیلا! منھ اٹھائے سیدزادی کا ہاتھ مانگنے چلے آئے۔'' زہرا کی والدہ، اہلیہ محمود علی نے آموں کے ٹوکرے کو زور کی لات ماری جو ایاز کی امی نے بھجوایا تھا۔ بہترین، تازہ اور چنندہ گلاب خاص اور دسہری فرش پر لڑھک گئے۔ کچھ دیر وہ غصے میں تن پھن کرتی رہیں، پھر ملازمہ سے کہا کہ آم اٹھا کر ٹوکرے میں رکھ دے اور ان کے یہاں واپس پہنچا آئے۔ آموں کا ٹوکرا بطور سوغات انھوں نے سویرے ہی بھجوا دیا تھا، جو پڑوسی کی طرف سے دوستی اور منکسر المزاجی کا مظہر سمجھ کر قبول کر لیا گیا تھا، لیکن سہ پہر کو ایاز احمد وارثی کی والدہ خود تشریف لے آئیں اور ابتدائی گفتگو کے بعد پرس سے ایک کاغذ برآمد کیا۔

''پہلے رقعے چلا کرتے تھے جو مشاطہ لاتی تھی۔ اب یہ ہے بایوڈاٹا۔ وہ بھی ابا اماں کو اکثر خود ہی دینا پڑتا ہے،'' وہ ہنس کر بولیں۔ (ویسے اندر سے چھوٹا منھ بڑی بات تو اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں؛ بیٹے کی محبت میں اس امکان پر غور کر کے آئی تھیں کہ انھیں اہانت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔)

''کیا مطلب؟'' اہلیہ محمود حسین واقعی کچھ سمجھ نہیں سکیں۔ اس کا تو انھیں سان و گمان بھی نہیں تھا کہ یہ زہرا کے لیے پیغام ہو سکتا ہے۔

''ہم زہرا بٹیا کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں،'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر ایک دم سے بول پڑیں

Scanned with CamScanner

کہ کہیں زیادہ ہکلائیں تو شاید ہمت ٹوٹ جائے اور اٹھ کر بھاگ جائیں۔

زہرا بیٹا کی اماں نے انھیں یوں دیکھا جیسے وہ ہذیانی کیفیت کے تحت کچھ کہہ رہی ہوں۔

''ہمارا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ سرجری میں اسپیشلائز کر رہا ہے۔ مقابلے کا امتحان دیا تو پہلی مرتبہ ہی کامیابی ملی۔ ایم بی بی ایس میں بھی اور اب بھی۔ سولہ ہزار تو اس کورس کے دوران ہی مل رہے ہیں۔ صورت تو آپ نے دیکھی ہی ہے۔ گورا، لانبا، سعادت مند، نیک مزاج۔'' بیٹے کے خواص بیان کرتے وقت وہ ہکلانا بھول چکی تھیں اور خم ٹھونک کر بات کر رہی تھیں۔

اہلیہ محمود حسین نے انھیں شرارے برساتی نظروں سے گھورنا چاہا لیکن ضبط کر گئیں۔ ملازمہ چائے کی ٹرے لا چکی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا، اس گستاخ عورت کو اسی وقت نکال باہر کریں، لیکن وہ گستاخ عورت پڑوسن تھی اور پھر صبح آموں کا ٹوکرا قبول کر چکی تھیں۔ مزید ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے چائے کی پیالی بڑھائی اور ناشتے کی پلیٹ بھی، لیکن چہرے کا رنگ بدل چکا تھا جو ایاز کی پڑھی لکھی ماں پر ضائع نہیں جا رہا تھا۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''جواب کا انتظار رہے گا۔''

''جواب کا انتظار نہ کریں۔ شادی کفو میں ہی کی جاتی ہے۔''

''کفو تعلیم، رہن سہن کے معیار اور خاندان کے لوگوں کے کردار سے بنتا ہے۔ ان تمام باتوں کے لحاظ سے آپ ہمیں کفو سے باہر نہیں پائیں گی۔''

دریدہ دہنی کی انتہا ہو چکی تھی۔ لڑکی کی اماں، غصے سے گنگ، اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ ڈاکٹر ایاز احمد وارثی کا بایوڈاٹا کچھ دیر میز پر پڑا پھڑ پھڑاتا رہا، پھر ہوا سے اڑ کر آنگن میں چلا گیا جہاں سے ملازمہ نے اٹھا کر اسے کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیا۔

بایوڈاٹا کچھ یوں تھا:

عمر: 27 سال

تعلیم: ایم بی بی ایس، گولڈ میڈلسٹ (ایم ایس)

قد: 5 فٹ 8 انچ

وزن: 58 کلو

Scanned with CamScanner

رنگ: گورا

شوق: کرکٹ، ادبی کتب کا مطالعہ

ذات: نداف (روئی دھننے والے محنت کش انسان)

مذہب: سنی مسلمان

مزاج: ہنس مکھ، بذلہ سنج۔ دائرۂ اسلام کے اندر رہ کر جدید اقدار میں یقین

والد: ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

والدہ: بی اے پاس، ہاؤس وائف

مستقبل: نہایت روشن

رات کو اہلیہ محمود علی نے محمود علی صاحب سے کہا، ''دروغائن بہت صاف اشارہ کر چکی ہیں۔ آپ یا تو زہرا کی بات آگے بڑھایئے ورنہ کسی دوسرے رشتے پر غور کیجیے۔''

''یہ اچانک آپ کو زہرا کی شادی کی کیا سوجھ گئی؟ ابھی وقت باقی ہے۔''

انھوں نے اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بولیں، ''دروغائن کے یہاں کا رشتہ ہے، بہت مناسب۔ ذات رات کا کچھ پوچھنا نہیں، جانے بوجھے لوگ ہیں۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔''

''ہوں... سوچا تو جا سکتا ہے۔ لیکن لڑکا—''

''لڑکے میں کیا خرابی ہے؟''

''قد کم ہے زہرا کے حساب سے، اور سنا ہے—''

وہ بھڑک گئیں۔ ''اب فیتہ لے کے لڑکے ناپتے پھریے گا! اور یہ جو سنا ہے کہ میڈیکل میں داخلہ پیسہ کھلا کے ہوا، تو سب کا ایسے ہی ہو رہا ہے۔ لاکھوں لڑکے بیٹھتے ہیں، ان میں سے آپ نے محض ڈیڑھ دو ہزار لیے تو باقی کہاں جائیں گے؟ سب ناکارہ نالائق ہی ہیں کیا؟''

''میں اس موضوع پر بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ہے نا، آگے آیت۔ سنا یہ ہے کہ ان لوگوں کا مطالبہ بھی ہے۔ اب اگر ہماری بساط سے زیادہ مانگ بیٹھے؟''

''زہرا ایم سی اے کر رہی ہے، خود کما کر لائے گی۔ انھیں پسند بھی ہے۔ زیادہ وہاں مانگیں

Scanned with CamScanner

گے جہاں لڑکی کمتر ہو۔"

لڑکی کی شادی کی بات، وہ بھی ماں کے منھ سے، کوئی انوکھی تو نہیں لیکن جس لہجے میں اور جس اچانک طریقے سے اٹھائی گئی تھی، اس سے محمود علی صاحب کچھ کھٹک ضرور رہے تھے۔

"کیا دروغائن نے کچھ کہلایا ہے؟"

"دروغائن نے ابھی اِدھر تو کچھ نہیں کہا لیکن آپ کے بھائی صاحب جن لوگوں کو ہمارے سر پر مسلط کر گئے ہیں وہاں سے زہرا کے لیے پیغام لے کر لڑکے کی والدہ آ کر بیٹھیں۔ ادھر میں نے زہرا میں کچھ تبدیلیاں محسوس کی ہیں۔ میرا تو شام سے دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

"کیا؟" محمود علی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً انھیں کسی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اور کسی کی کیا، تمھاری بیٹی کی ہوگی۔ ذرا پوچھنا تو کل اس سے۔"

"میری بیٹی کا نام مت لیجیے۔ آپ کے بھائی صاحب نے ہشکایا ہوگا۔ جب وہ انھیں اس لائق سمجھ سکتے ہیں کہ اپنا مکان ان کے ہاتھ بیچ جائیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیغام بھیجو، آخر تم میں کیا کمی ہے۔"

محمود علی خاموش ہو گئے۔ شاید بیوی سچ کہتی ہوں، مگر کل اس زہرا کی خبر تو ضرور لینی ہے۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ زہرا کا اِدھر ہر جمعے کو ایکسٹرا کلاس ہونے لگا تھا، وہ سویرے ہی تیار ہو کر نکل چکی تھی۔ جمعے کی نماز کو جاتے ہوئے محمود علی صاحب یہی سوچ رہے تھے کہ شام کو سہی۔ ذرا لڑکی سے پوچھنا ہے کہ کیا گل کھلا رہی ہے، اور اتوار کو پہلی فرصت میں ڈی ایس پی صاحب سے مل کر رشتہ پکا کر دینا ہے۔

سوچ میں گم محمود علی نے نظریں گھمائیں۔ ایاز آج بھی ان کی صف میں ان کی بغل میں کھڑا تھا۔

❁❁

ذکیہ مشہدی

گلی سرمست میں رمضان

مغرب میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔

حافظ مستیا عرف حا بجؔی نے جلدی جلدی مسالہ ملے قیمے کو آٹے کی طرح گوندھنا اور سیخوں پر لگانا شروع کیا۔ دکان پر کام کرنے والا لڑکا مغلی پنکھے سے انگیٹھی کے کوئلے دہکانے میں مصروف تھا۔ انگیٹھی کے دوسرے منھ پر المونیم کا بڑا سا چائے دان چڑھ چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگ آنے لگیں گے۔ ایسے نہ جانے کتنے ہیں جن کا گھر دوار نہیں ہے۔ سب افطار کے وقت حا بجی کی دکان پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ روٹی، کباب، چائے اور پکوڑوں سے روزہ کھولتے ہیں۔ چنے، جو عام دنوں کے مینو میں شامل نہیں ہیں، رمضان میں خصوصی اہتمام کے طور پر ملنے لگتے ہیں۔

"جلدی کر بیٹا،" حافظ جی نے لڑکے سے کہا، "جاڑوں میں سورج سرسے ڈوبتا ہے۔ گرمی میں تو جیسے اس کے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔ ڈوب کے ای نہیں دیتا۔"

"ساما لیکم حا بج چا۔ ساما لیکم بھائی مغلی!" یہ اکبر تھا وقت سے کچھ پہلے ہی چلا آیا تھا۔ "پڑھ پڑھ کے سالا دماغ خراب ہو گیا،" وہ زیر لب بڑبڑایا اور انگیٹھی کے سامنے ہاتھ کر کے ہاتھ تاپے۔ "لکھ لکھ کے انگلیاں اکڑ گئیں۔"

ابھی اور لوگ نہیں آئے تھے اس لیے اس نے آرام سے پاؤں پھیلائے اور پیرا و پر چڑھا کر بیٹھ گیا۔ اکبر سامنے والی لاج کے لڑکوں میں سے تھا۔ چار پانچ کمروں میں کوئی سولہ سترہ لڑکے گھسے ہوئے تھے۔ سب کے سب قریب کے کوچنگ انسٹیٹیوٹ میں انجینئرنگ یا میڈیکل کالجوں میں

Scanned with CamScanner

داخلے کے امتحانات کی پڑھائی کر رہے تھے۔ گلی سرمست کے کئی لوگوں نے اپنے گھر کو لاج میں تبدیل کر دیا تھا۔ کچھ کھانا بھی مہیا کراتے تھے، کچھ نے محض رہنے کی سہولت دی تھی۔ سب کے سب نہایت مہنگے۔ اماں ابا بھگتتے رہتے تھے۔ لڑکا میڈیکل یا انجینئرنگ کالج میں آ گیا تو وارے نیارے ہیں، سمدھی سے مع سود سارا خرچ اگلوا لیں گے۔ نہ آیا تو بھی دیکھا جائے گا؛ جب تک امید ہے تب تک خوش ہو لیں۔ ویسے دنیا اب پہلے سے زیادہ وسیع ہو چکی ہے، ناقص پرزے بھی کہیں نہ کہیں فٹ ہو ہی جاتے ہیں۔

شاہ سرمست لاج میں آبادی کا تناسب ذرا گڑبڑا گیا تھا؛ اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ غیر مسلم لڑکے بدرجہ مجبوری ہی یہاں آتے۔ جو آتے تھے انھیں کوچنگ کے ساتھی چھیڑتے۔ ''ان سے ملیے، یہ پاکستان میں رہتے ہیں۔'' ''کیوں جی، میاں بننے میں کتنی دیر ہے؟'' ''اماں تمھیں دیکھا تھا، ایک دن مسجد سے نکل رہے تھے۔''

یہ مسجد والی بات ذرا بے ڈھب تھی۔ جس سے کہی گئی تھی وہ لڑکا گھبرا گیا۔ دراصل وہ اپنے ایک ساتھی کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ ساتھی دو دن سے غیر حاضر تھا اور اس کے نوٹس مانگ کر لے گیا تھا۔ اس کے بارے میں کسی نے بتایا کہ عشا کی نماز کے لیے باقاعدگی سے مسجد آتا ہے۔ یہ اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ یار لوگ غضب کی خبر رکھتے ہیں۔ ڈر گیا کہ کہیں اماں ابا تک بات پہنچ گئی تو کباڑا ہو جائے گا۔ شاہ سرمست کی لاج سے وہ پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ لڑکا کچھ ہی دنوں میں کہیں اور منتقل ہو گیا۔ بڑی مشقت کے بعد ایک جگہ تلاش کر سکا تھا جہاں پے انگ گیسٹ بن کر رہ سکے۔

''آ جا بے، تو بھی آ جا!'' اکبر نے قیصر کو بالکونی سے جھانکتا دیکھ کر ہانک لگائی۔ قیصر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''یار، آج صبح سے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ پیاس بھی بہت لگی۔ اتنی ٹھنڈ ہے، پھر بھی۔ حاجی کے کباب پراٹھے کھا کھا کے اور ہو گا بھی کیا!''

دراصل رمضان میں ہی نہیں، عام دنوں میں بھی یہ لڑکے زیادہ تر حافظ مستیا کے کباب پراٹھوں پر گزارہ کرتے تھے۔ چھ روپیوں میں پیٹ بھر جایا کرتا تھا — خوب تیز مسالوں والے

Scanned with CamScanner

کباب اور ہرے دھنیے کی کھٹی چٹنی۔

شاہ سرمست میں کھانا نہیں مہیا کرایا جاتا تھا۔لڑکے ایک آدھ وقت چائے ڈبل روٹی پر گزارہ کر لیتے، کبھی اسٹوو پر کھچڑی ابال لیتے۔ پھر دوسرے وقت کوئی اوپر سے چلّاتا: ''ارے حاجی چا... او بھائی مغلی! اماں لپک کے لے آئیو تو کباب پراٹھے... ہاں میں، سب کے لیے... ہم کیا اکیلے کھائیں گے؟... اور ہاں، گھاس خوروں سے پوچھ لیجیو انھیں کیا چاہیے... وہ بھی لے آئیو...'' دور سے مغیث حیدر عرف مغلی کی ٹھی ٹھی اور حافظ مستیا کی ڈانٹ سنائی دیتی۔

ابھئے نیا نیا آیا تھا۔ کباب دیکھ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اکبر کی پلیٹ پر لپکا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر پلیٹ پیچھے کر لی۔ ''ابے، بڑے کے ہیں۔ پرے ہٹ!''

''گئو مانس!'' گھن، نفرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت اس کے چہرے کو مسخ کر گئی۔ فوری طور پر وہ خود اپنا ردعمل سمجھ نہیں پایا۔

''ابے ہے تو یہ بھینس مانس، مگر تُو تو بھینس بھی نہیں کھائے گا۔ گائے ماتا، تو بھینس کم از کم موسی تو لگی؟ وہ بھی نہیں تو پھوا میں کیا شک!''

ابھئے ایک دم سے ہنس پڑا۔ گرچہ اس کا غصہ رفع نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اکبر کی ایمانداری کی قدر کی۔

''کباب پہ لپکے تھے۔ اس کا مطلب ہے، گوشت کھاتے ہو؟''

''اماں، گوشت تو ہم ایسا کھاتے ہیں کہ ہمارے کھانے کے بعد کتے کے لیے ہڈی نہ بچے، مگر ہاں...'' اس نے سر کھجایا۔

''وہ بھی کھانے لگو گے،'' دانش نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا، ''جب چھ روپے میں بھر پیٹ کباب پراٹھے ملیں گے۔ دھرم طاق پر رکھ کے یہاں کئی رکشے والے...''

''دانش!'' اکبر نے بڑی زور سے دانش کو ڈانٹا۔ وہ باقی لڑکوں سے عمر میں کچھ بڑا اور مزاجاً سنجیدہ تھا۔

''ابے نیچے اتر! وہاں کیا کر رہا ہے؟'' قیصر نے ابھئے کو بھی بالکونی میں نمودار ہوتے دیکھا تو اس بار اس نے ہانک لگائی۔

Scanned with CamScanner

''آجا، آجا۔ روزہ نہیں رکھتا تو نہ رکھ، شام کی چائے تو پیے گا نا؟ چل آج افطار ہماری طرف سے۔'' دولڑکے اور چلائے۔

ابھئے اور انجنی دونوں آگئے۔ جب سے رمضان شروع ہوا تھا، یہ دونوں نئے نئے مناظر سے دوچار ہو رہے تھے۔ شروع میں گھبراہٹ بھی ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے بہت سارے مسلمان بلبلاتے ہوئے نکل پڑتے تھے؛ سر پر کروشیا سے بنی ہوئی ٹوپیاں، لانبے لانبے کرتے۔ مسجد میں اذان ہونے سے پہلے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے سینی میں افطاری لیے ہوئے مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیتے۔ ان کی سینیوں پر بھی اکثر کروشیا سے بنے ہوئے خوان پوش پڑے ہوتے۔ دوپٹوں سے سر ڈھکے، سر جھکائے وہ لڑکیاں بڑی پیاری لگتیں۔ پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون شاہ سرمست لاج میں رہنے والے لڑکوں پر بڑا ترس کھاتیں۔ ''ہا، بیچارے گھر سے دور رمضان میں روزے رکھ رہے ہیں۔'' کبھی کبھی وہ مسجد کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں بھی سینی بھجوا دیتیں۔ ابھئے اور انجنی کے بھی چھکے پنجے ہوجاتے۔ ایک دن انجنی نے کہا، ''ذرا تفتیش کرلی جائے۔ یہ شاید 'فیوچر انوسٹمنٹ' ہے۔ گھر میں کوئی تیرہ چودہ برس کی لڑکی ہوگی۔ کچھ سالوں بعد ڈاکٹر یا انجینئر...''

دانش بگڑ گیا۔ ''ابے یہ ہمارے یہاں کا دستور ہے۔ مسجد میں کون سے ڈاکٹر یا انجینئر پکڑنے کو افطاری بھیجی جاتی ہے؟''

''تو حرج کیا ہے؟'' ابھئے نے انجنی کا ساتھ دیا۔ ''برا کیوں مان رہے ہو؟''

''سالے، تم دونوں پٹ جاؤ گے!'' دانش نے آنکھیں نکالیں۔

''ہاں، اقلیت میں ہیں۔ اقلیت ہمیشہ سے پٹتی چلی آرہی ہے۔''

''بہت بڑا فلسفہ بگھارا تم نے تو!'' دانش نے اس بار سالے سے دو چار ڈگری آگے کی گالی جوڑی۔

''رمضان میں زبان نہیں خراب کرتے۔ خبردار جو گالی بکی ہے!'' اکبر نے دانش کو ڈپٹا۔

''بھیا جی،'' قیصر کہہ رہا تھا۔ ''ایک دن روزہ رکھ کے کھاؤ، پھر مزہ دیکھو پکوڑوں کا... اس سے تو خیر تم محروم ہو۔'' اس نے شرارت سے سینیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ابھئے اور انجنی کو رمضان کے شروع میں سحری کے اعلان اور پھر فجر کی نماز کے بعد میلاد سے

Scanned with CamScanner

بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ''یار تم لوگ اپنے ساتھ یہ دوسروں کی نیند کیوں حرام کرتے ہو؟'' ایک دن چڑ کے کوئی بولا تھا۔

''لالہ ہردیال تو باقاعدہ اس کے خلاف مہم چلا چکے ہیں۔ تو بھی چلا لے!'' بولنے والا خاموش ہو گیا۔ قیصر کے ہونٹ کچھ کہنے کو پھڑکے۔ اسے خود ہی سخت کوفت ہوتی تھی۔ سحری کھانے کے لیے اٹھنا وہ بھی جاڑوں میں؛ اسے نیند سے زیادہ کچھ عزیز نہیں تھا۔ واقعی ان کے نقطۂ نظر سے سوچو جن کے نزدیک اس میں کوئی مذہبی رنگ نہیں ہے۔ ہوسٹل میں دو چار ملا تھے۔ وہ قیصر کی گردن دبا دیں گے، اس لیے اس نے زبان بند رکھنے میں عافیت سمجھی۔ اکثر یہی ہوتا ہے؛ وہ جو معقول سوچ رکھتے ہیں، اپنی زبان بند رکھنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ دکان پر جمگھٹ لگ چکا تھا۔ کسی نے ایک گھونٹ پانی سے روزہ کھولا، کچھ نے جیب سے کھجوریں نکالیں۔ ایک شخص نے ایک کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا انجنی کو بڑھا دیا۔ ''ہم روزہ دار نہیں ہیں'' کہتے کہتے وہ رک گیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں کھجوریوں لی جیسے وہ پرشاد لیا کرتا تھا، پھر ماتھے سے لگا کے قیصر کو بڑھا دی۔ اس شخص نے قدرے حیرت کے ساتھ انجنی کو دیکھا۔

افطار کے بعد لڑکوں نے ٹوپیاں سنبھالیں۔ حافظ جی نے بھی۔ مغلی نے حسب عادت ٹوکا۔

''جلدی آ جائیو حا پچا!''

''ابے الو کے، ہم دیر لگاتے ہیں کبھی؟ روز ٹو کے بغیر نہیں مانے گا۔''

''ہیں ہیں ہیں... چچا، ہم سے اکیلے نہیں بیٹھا جاتا۔ پھر ہمیں بھی تو نماز پڑھنی ہے۔''

''چپ بے، دکان دیکھ۔''

حافظ مستیا کو معلوم تھا، مغلی کبھی نماز نہیں پڑھتا۔ اسے پڑھنی آتی بھی نہیں۔ البتہ عید کے دن عید گاہ ضرور جاتا ہے اور جیسے جیسے لوگ رکوع اور سجدے میں جاتے ہیں وہ بھی نقل کرتا جاتا ہے۔ دعائیں البتہ بہت سی مانگتا ہے۔ اپنی خود کی چائے کی دکان، اماں کی آنکھیں، بہن کی شادی، ایک چھوٹا سا گھر، اس گھر میں پائل چھنکاتی بیوی، لڑتے جھگڑتے، شور مچاتے بچے، اور بھی بہت کچھ الم غلم۔ ساتھ ساتھ جو اسے برے لگیں، یعنی ایسے لوگ جنھوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو، ان کے لیے

Scanned with CamScanner

اللہ میاں سے حسبِ توفیق ان کا برا کرنے کی بھی دعا گھسیٹ دیتا۔ ایک مرتبہ حافظ جی نے دودھ ابالنے میں غفلت برتنے پر اسے چپتیا دیا تھا۔ اتفاق سے یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا۔ عید کی نماز میں اس نے دعا مانگی، ''اللہ میاں، اس حرامزادے حاپچا کی تو ٹانگ ہی توڑ دیجیو۔'' لیکن نماز سے واپس آ کر حافظ جی نے اسے دس روپے عیدی دی تو اس نے فی الفور اپنی بددعا نہ صرف واپس لے لی بلکہ ان کے لیے گالی استعمال کرنے کے لیے اللہ میاں سے معافی بھی مانگی۔

رمضان میں افطار کی گہما گہمی کے بعد پھر عشا اور تراویح کے بعد تک عموماً بزنس مندا رہتا تھا اس لیے وہ دونوں گھٹنوں پر سر رکھ کے اونگھنے لگا۔

''ارے بھائی موگلی!''

مغلی اچھل پڑا۔ آواز کراری اور اختیار آمیز تھی۔ آنکھیں ترچھی کر کے دیکھا تو لالہ ہردیال تھے۔ گلی کے اختتام پر جہاں سے چوڑی سڑک شروع ہوتی تھی وہیں نکڑ پر ان کا دومنزلہ مکان تھا۔ نچلے حصے میں مٹھائی کی شیشوں سے مزین فیشن ایبل دکان اور اوپر رہائش گاہ۔

''بابو جی، آپ؟'' حیرت سے مغلی کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایسی بات نہیں کہ لالہ جی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سلام پرنام اور تو تو میں میں، دونوں کا رشتہ تھا، لیکن تھا دور دور کا۔ دکان پر تو وہ صرف ایک مرتبہ اور آئے تھے، تصدیق کرنے کے لیے کہ ان کا لڑکا یہاں بیٹھ کر کباب کھاکے تو نہیں گیا ہے۔

''ہاں ہم! نہ آئیں تمھاری دکان پر کیا؟ اچھوت سمجھتے ہو؟'' مغلی اور زیادہ گڑبڑا گیا۔ خیریت ہوئی، نماز پڑھ کے واپس آتے حاپچی دکھائی پڑ گئے۔ اس کی جان میں جان آئی۔

''سلام لالہ جی، آپ؟'' حافظ مستیا بھی گھبرا گئے۔

''کیوں بھائی، ہم پڑوسی نہیں ہیں کیا؟ ہم نے تو سوچا ہے کہ گلی سرمست کے سب مسلمان بھائیوں کو افطار کی دعوت دیں۔ آخر ہم لوگ ایک جگہ رہتے ہیں، دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔''

''مگر بابو جی، آپ کو یہ سب ابھی کیسے یاد آیا؟'' مغلی بولنے ہی والا تھا کہ حاپچی نے آنکھ کے اشارے سے تنبیہ کی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ہردیال جی۔ ہم سب آئیں گے۔ کب کرا رہے ہیں افطار؟''

Scanned with CamScanner

''اب کی جمع کو رکھیں۔ پکوڑے آپ ہی سے چھنوائیں گے۔ اور ہاں، چنے بھی آپ کے ذمے۔ باقی حلوائی بٹھالیں گے۔'' وہ دیر تک کھڑے جزئیات طے کرتے رہے۔ مدعوئین کی فہرست بھی بن گئی تاکہ کوئی چھوٹے نہیں۔

''وہ مشروا سچ کہہ رہا تھا۔ لالہ ہردیال اس بار میونسپل کارپوریشن کے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں!'' اکبر کو دعوت ملی تو اس نے برجستہ کہا۔ ''جیت گئے تو صرف بھنگیوں کی بحالی میں ہی اچھا خاصا کمالیں گے۔ رعب داب رہے گا وہ الگ۔''

''تم سالے سب کو شک کی نظروں سے ہی دیکھتے ہو۔'' قیصر نے پڑھتے پڑھتے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔ ''ایک دن اچھا افطار مل جائے گا۔ بیچارہ مغلی دن رات محنت کرتا ہے۔ اس کا گھر یہاں ہے، پھر بھی دکان پر زندگی بسر ہو رہی ہے۔''

''مغلی کون سا روزہ دار ہے؟ خواہ مخواہ ترس کھا رہے ہو!'' دانش جھنجھلایا۔ دیر سے فزکس کے ایک سوال میں الجھا ہوا تھا جو بن ہی نہیں رہا تھا۔

مغلی کا اپنا ایک الگ فلسفہ تھا۔ ''اللہ میاں نے ویسے ہی ہمیں کھانے کو کم دیا ہے، اس لیے روزہ ہم پر فرض نہیں ہے۔ ہم بغیر روزہ رکھے جانتے ہیں کہ بھوکا رہنے پر کیسا لگتا ہے۔'' رزاق رکشے والا مغلی کا ہم نوا تھا۔ رات کو گرم دودھ اور لچھوں کی سحری کھاتا، کہ گلی رمضان میں رات بھر جاگتی تھی۔ لانبی نوکیلی مونچھوں سے دودھ چاٹ کر صبح کو روزے کی نیت کرتا لیکن اگر سویرے رفع حاجت کو چلا جاتا تو روزہ توڑ دیتا تھا، یا یوں کہیے کہ نہیں رکھتا تھا۔ ''اب بھیا، پیٹ خالی ہو گیا تو بڑے زور کی بھوک لگتی ہے، پھر ہم سے رکشا نہیں کھنچتا۔ ایک سے ایک موٹی موٹی سواریاں چڑھ جاتی ہیں۔ ایک دن تو ڈاکٹر صاحب کی بی بی چڑھیں۔ ایک ماما، ایک چھوکری، ایک کوئنٹل کی خود، بیس کلو پھل، پانچ کلو مرغا، ڈھائی کلو سوئیں۔ کتنا کھاتے ہیں یہ لوگ رمضان میں! محلے داری ہے، منع بھی نہیں کر سکتے کہ اتنا سامان اور دو دو نوکرانیاں نہ چڑھائیں۔ پست ہو کے پڑ گئے۔ روزہ توڑنا پڑا۔'' لیکن گلی میں پھل والا اشرف، ماسٹر ساجد علی، غلام علی باربر، اشرف کا بھائی مشرف، زبیر میوے والا، سب کے سب پکے روزے دار تھے۔ رکشہ اسٹینڈ کے چار مسلمان رکشے والے بھی پابندی سے روزے رکھتے تھے۔ رزاق ان سب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ''اے بھیا، جنت میں زیادہ جگہ ملے گی تمھیں، تھوڑی ہم لے

لیں گے۔ ''حنیف گھوم گھوم کے سلائی مشین کی مرمت کرتا پھرتا۔ آوازیں بھی لگاتا جاتا، ''سلائی مشین مرمت!'' لیکن کیا مجال جو روزہ قضا ہو۔

''ہردیال چاچا جس دن افطار پارٹی دیں گے، اس دن ہم بھی روزہ رکھیں گے،'' ابھئے نے اعلان کیا۔

''ابے کیوں، ہم لوگوں کو بدنام کرائے گا۔ ویسے بھی روزہ رکھ یا مت رکھ، جائے گا تو جہنم میں ہی۔'' دانش نے اس کا منھ چڑھایا۔

''ہی ہی ہی... سب اچھے لوگ وہیں ہوں گے۔ تم رہیو ڈاڑھی والے بیوقوف امام صاحب کے ساتھ۔ مائیک پر پڑھ رہے تھے وہ کیا کہیں کہ خطبہ۔ ترکیب بتا رہے تھے کہ بیوی کو کیسے ماریں کہ چہرے پر نشان نہ پڑیں۔''

دانش کھسیانا ہو گیا۔ ابھئے اور چندن نے اس رات ڈھول دھپے، شور شرابے کے ساتھ سحری کھائی اور دوسرے روز روزہ رکھا۔

''اب سالے کہیں مسجد میں نماز پڑھنے مت آ جائیو!'' اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لالہ ہردیال افطار پارٹی تو دے دیں گے لیکن اس کے بعد ایک عدد فساد کرا ڈالیں گے۔ امتحان قریب ہیں، سب بن جاؤ گے ڈاکٹر انجینئر!'' ابھئے نے منھ اٹھا کے جواب دیا، ''ہی ہی ہی!''

اسی جمعے کو رکشہ اسٹینڈ کے رکشے والوں نے چاروں مسلمان رکشہ والوں کے لیے افطار کا اہتمام کیا۔ اس دن شرما حضوری رزاق نے بھی پورا روزہ رکھ لیا۔ تیج ناتھ گھر سے بہت سے پکوڑے بنوا کے لایا، لکھن نے کھیر رکھی، شرما نے پھل، اور پاسوان نے حاجی کے یہاں سے گھگھنی خریدی۔ شام کو جگہ صاف کر کے ان سب نے پرانے اخبار بچھائے جو وہ رڈی بیچنے والے بڑھؤ سے مانگ لائے تھے۔ (بڑھؤ کا کوئی نام نہیں تھا، وہ صرف بڑھؤ کہلاتے تھے۔ اللہ جانے پیدا ہی بوڑھے ہوئے تھے یا کبھی کوئی اور نام بھی تھا۔)

تیج ناتھ نے کہا، ''نمک کا بھگوان مالک ہے۔ گھر والی بولی ہے کہ بھگوان جی کا پرساد چکھا نہیں جاتا، اس لیے بیسن گھولتے وقت نمک نہیں چکھا ہے۔''

اذان ہوئی تو سر پر گمچھے باندھ کے سب گھیرا بنا کے بیٹھ گئے۔ ''اس سے اچھے پکوڑے ہم نے

پہلے نہیں کھائے!'' نور محمد نے کہا۔ ان کی آواز میں ہلکی سی نمی تھی۔ اچانک سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سرمست لاج کے سارے کے سارے اٹھارہ لونڈے ہاتھ میں افطار کی پلیٹیں اٹھائے وہیں چلے آ رہے تھے۔ چندن کے ہاتھ میں چٹائی بھی تھی۔ سب وہیں پھیل کے بیٹھ گئے۔

''چلو مومنو، اللھم لک صمت۔ ابے جلدی افطار کر، ابھئے!''

معلوم ہوا کہ اس افطار کی خبر اکبر نے دی تھی۔ صبح وہ رزاق کے رکشے سے کہیں نکلا تھا۔ اسے رزاق نے بتایا تھا۔ لڑکوں نے ایکشوٹی یہ کی کہ افطار لالہ ہردیال کے یہاں سے اٹھایا اور یہاں آن پہنچے۔ اس دن وہ مسجد نہیں گئے، وہیں چٹائی بچھائی اور نماز ادا کی۔ میاں نور محمد نے، کہ ان کی ڈاڑھی بھی تھی اور عمر دراز تھے، امامت کی۔

رمضان کا ایک اور دن تمام ہوا۔

❁❁

ذکیہ مشہدی

لپا گو

''اماں، آم دو! اماں، آم دو!'' پنجرے میں مٹھو گھوم گھوم کے چلایا۔

آموں کا موسم تو کب کا جا چکا۔ ہمیشہ کی طرح۔ دودھیا مالدہ، لال منھ والا گلاب خاص، سنہرا دسہری، سب بازار سے اٹھ گئے۔ برسات شباب پر آئی ہمیشہ کی طرح۔ پھر جاڑے کی آمد ہو گئی۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح۔ کتنے موسم آئے، کتنے موسم گئے۔ اب کیا گنتی کرنے کا کچھ فائدہ ہے؟ دن ٹپ ٹپ کر کے گرے، مولوی چچا کے باغ میں پکے آموں کی طرح زمین پر بچھ گئے، ٹوٹی مالا کے منکوں کی طرح مٹی میں رل گئے — اتنے سارے دن۔

جمعہ آتا تھا، جمعہ جاتا تھا۔ اماں بھیا کے لیے کلف لگا، چکن کا لکھنوی کرتا اور علی گڑھی پاجامہ نکال کر بستر پر رکھتیں۔ بھیا کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتا۔ ''آج پھر مصیبت ہے!'' اماں جھٹے سے اکھڑ جاتیں۔ ''کمبخت صرف ایک دن تو مسجد جا کر نماز پڑھتا ہے اور اسے بھی مصیبت گردانتا ہے۔''

''جمعہ ہفتے میں کے بار آ جاتا ہے اماں؟'' بھیا انتہائی معصومیت سے سوال کرتا۔ اب کی اماں اس قدر ناراض ہو جاتیں کہ ان کی بولی نہ نکلتی۔ بس گھور کے دیکھتیں اور منھ پھیر لیتیں۔ اور تب تنویر فاطمہ عرف تنو سوچا کرتی تھی کہ جمعہ جلدی کیسے آ سکتا ہے؟ وہ تو اپنے وقت پر ہی آتا ہے، ہفتے میں ایک بار، اور اپنے وقت پر ہی آتا رہے گا۔ مگر تنو اب ایسا نہیں سوچتی۔ وہ تو سوچنے لگی ہے کہ جمعہ ہی نہیں، ہفتے کے سارے دن بہت جلدی آ جاتے ہیں۔ لو، ابھی تو آیا تھا اتوار، ابھی پھر آ گیا۔ دن ہیں کہ ساون کی جھڑی، کہ برسے جا رہے ہیں، برس برس کے بہے جا رہے ہیں اور بہائے جا رہے ہیں

Scanned with CamScanner

نہ جانے کتنا کچھ۔

''کھلک چھینا کال کا، کچھ مکھ میں کچھ گود... یہ تمھارے کبیر داس خاصے قنوطی واقع ہوئے تھے۔'' جمیل بھائی 'کھلک' کو بڑی زور سے ڈپٹنے والے انداز میں ادا کرتے اور تنو اور قبل ازیں دوسرے افراد ان سے خوب ہی تو چڑتے۔ نیاز احمد عرف جمیل ان میں سب سے بڑے تھے۔ سائنس کے طالب علم تھے لیکن زیادہ تر اردو، ہندی کی ادبی کتابیں اٹھا اٹھا کے پڑھتے رہتے۔ ایک دن بایولوجی کے پریکٹیکل میں گلہری کاٹنے کو ملی تو کلاس چھوڑ کے بھاگ آئے۔ پھر ہفتے بھر نہیں گئے۔

''یہ حضرت فاطمہ کی گڑیا ہے،'' اماں گلہری کے بارے میں کہا کرتی تھیں۔ ''انھوں نے اس پر پیار سے ہاتھ پھیرا تھا، اس لیے اس کی پیٹھ پر نشان بن گئے۔''

''اماں، ہندوؤں کے یہاں مشہور ہے کہ گلہری کی پیٹھ پر سیتا جی نے ہاتھ پھیرا تھا۔'' بھیا اور بولے بغیر مان جائے!

''ارے تو دونوں نے پھیرا ہوگا۔'' اچھن جھٹ سے سمجھوتا کر لیتے۔ ویسے بھی اچھن کو بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ مثلاً یہ کہ آم اگر کترا ہوا ہے تو وہ طوطے نے کترا ہے یا کوئل نے۔ ایک بار جمیل بھائی نے بڑے سے قلمی آم میں منھ مارا اور اچھن کے سامنے پیش کر کے پوچھا:

''اچھن بتاؤ یہ آم کس نے کترا ہے۔ طوطے نے یا کوئل نے؟''

اچھن نے آم کا بغور معائنہ کیا۔ سُوں سُوں کر کے سونگھا۔ کچھ دیر کچھ سوچتے رہے، پھر نہایت سنجیدگی سے بولے، ''ضرور کسی بیل نے کترا ہے۔'' اچھن اس دن سے گرو قرار پائے۔

اچھن گرو مان تو لیے گئے لیکن لوگوں نے انھیں چڑانا نہیں چھوڑا۔

اچھن کے وہ لچھن، بلیا کے دو کان
اچھن گئے باجار پٹک دِس شیطان

کئی اور باتوں کی طرح اچھن کو چڑانے کی ابتدا کا بھی لپا گو کے گاؤں جانے سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ وہ کوئی برس ڈیڑھ برس بعد گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو اچھن کو چڑانے کے لیے ایک کبت لے کر آیا — نہایت فصیح و بلیغ اور ذلت آمیز۔ دراصل جو اور بیجنل کبت تھا اس میں اچھن باز ار نہیں

بلکہ کھیت میں فراغت حاصل کرنے گئے تھے۔ اماں اور دادی کے ڈر سے لوگوں نے اسے تبدیل کر دیا تھا لیکن اکیلے دُکیلے، جب کوئی بڑا پاس نہ ہوتا تو یہ اپنی اصلی شکل میں دہرایا جاتا تھا۔ اچھن جائیں تو جائیں کہاں! چڑائے کوئی، لیکن پٹتا عموماً لپا گو ہی تھا۔ ایک تو یہ کہ سارے فساد کی جڑ وہی تھا، اوپر سے کمزور بھی کہ گھر کا ملازم تھا (پٹ جائے تو کوئی پرسانِ حال نہ ملے) اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ مسجع کلام اس نے اصل صورت میں لوگوں کو سکھایا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو بازار میں بھی شیطان کے ہاتھوں بیچ دیے جانے کی بات کچھ کم اہانت انگیز نہ تھی۔

انھی اچھن کا ای میل آیا تھا امریکہ سے۔ ہوائی جہازوں میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ذیابیطس کے مریض پہلے ہی تھے، اب دل کا عارضہ بھی ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نیگرو سے شادی کر لی ہے۔ کمبخت کو غیر مذہب، غیر ملک، غیر ذات میں ہی شادی کرنی تھی تو کم از کم کسی گوری چمڑی والے سے تو کرتی!

''اب بیٹے کی شادی جلد کر ڈالو، اس سے قبل کہ وہ بھی کوئی کالی پیلی نکٹی لے آئے،'' تنویر فاطمہ عرف تونے ہول کے عزیز احمد عرف اچھن کو جوابی ای میل کیا۔

اس بار اچھن میاں کا فون آیا (کہ ای میل میں کوئی دہاڑیں مار کے رو نہیں سکتا)۔ انھوں نے بات بعد میں کی، پہلے دہاڑیں مار کے روئے۔ ''آپا، ہم ہجرتوں کے نوحہ خواں، کون کون سی خبریں دے کر آپ کے دکھوں میں اضافہ کریں۔ بیٹا تو نہ جانے کب سے ایک لڑکی کے ساتھ یوں ہی رہ رہا ہے۔ لاکھ کہتا ہوں، اچھا چلو یہی سہی، شادی تو کر لو۔ جواب دیتا ہے، 'بہت شادیاں کر چکے آپ لوگ۔ اب اس دقیانوسی انسٹیٹیوشن کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔'''

تونسناٹے میں آ گئی۔ گناہ ثواب، اچھے برے کے معیار بھی کتنے بدلتے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا، کیا کہے۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ''آسیہ کے لیے رنج کرنا چھوڑ دو اچھن۔ آخر اس نے شادی کی ہے نا۔ بیٹی ذات — اگر وہ بھی شادی کے انسٹیٹیوشن کی قائل نہ ہوتی تو؟ اور بھیا اچھن، انسان تو سب انسان ہی ہیں۔'' پھر اس خوف سے کہ کہیں اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن اسے خود دہاڑیں مار کر رونے پر مجبور نہ کر دے، اس نے یکلخت فون بند کر دیا۔

یہ چپ تنویر پر کئی دن اتری رہی۔ خود اس کا بڑا بیٹا زیادہ سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں اپنے

Scanned with CamScanner

بال بچوں کو لے کر اڑ چکا تھا۔ لاکھوں میں کھیل رہا تھا لیکن اس کے باپ مکان بنوانے میں مقروض ہو گئے تھے، اس نے کبھی چار پیسوں کو نہ پوچھا۔ تنو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتی تھی کہ چلو، وہ تو خوش ہے، لیکن بیٹی جو ایم ایس ڈبلیو کر کے بمبئی جیسے جنگل میں نوکری کر رہی تھی۔ 'گھر کی آدھی اور باہر کی ساری' جیسا محاورہ اس کی سمجھ سے کوسوں دور تھا۔ جو بھی رشتہ آتا اس میں عیب نکال کر اسے رد کر دیتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کا انسٹیٹیوشن اس کی بھی سمجھ سے پرے ہو جائے۔ تنو کا دل بیٹھنے سا لگتا۔

اس سے چھوٹا سلمان ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی امتحان میں بیٹھتا تھا یا انٹرویو دیتا تھا۔ ہزاروں روپے فارم بھرنے، فیس دینے اور سفر کے اخراجات پر خرچ ہوتے رہے تھے۔ نتیجہ ابھی تک ڈھاک کے تین پات تھا۔ معمولی نوکری ملنے کا امکان تھا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ چھوٹے موٹے بزنس کا تو خیال ہی اہانت انگیز تھا۔ وہ اپنی ساری ناکامیوں کا ذمے دار والدین کو ٹھہراتا تھا۔ ''ابا اگر مکان نہ بناتے، وہی روپیہ خرچ کر کے کہیں مجھے ملازمت دلا دیتے، تو آج میری حالت یہ نہ ہوتی،'' اس نے کئی بار کہا تھا۔ ابا کچھ دن ہوئے کہ تمام الزامات سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ جب تک جیے، اپنی ساری نامرادیوں اور بچوں کی نافرمانیوں کا ذمے دار تنو کو ٹھہراتے رہے۔ تنو پر کوئی ردعمل نہ ہوتا۔ وہ پتھر بنی سنتی رہتی تو وہ اپنا سب سے نوکیلا حربہ آزماتے جو سیدھا دل میں اتر کر ایک چھید بناتا۔ ''اور یہ لڑکی... رابعہ... یہ بے شرم۔ اس نے تو حد ہی کر رکھی ہے! یہاں اسکول میں پڑھانے کی نوکری مل رہی تھی وہ نہیں کی، چل دی بمبئی۔ اکیلی رہتی ہے اور منھ کھول کر اپنی شادی کی باتیں کرتی ہے۔ ننیہال پر گئی ہے ننیہال پر!''

فقیر ایسے وقت میں آتا کہ گھر میں لڑکے بالے یا لپاگو، کوئی نہ ہوتا تو دادی یا اماں بند دروازے تک آتیں۔ پیالے میں آٹا رکھ کر کنڈی کھڑکاتیں اور جھپ سے واپس ہو جاتیں کہ فقیر ہاتھ بڑھا کر اندر سے آٹا لے لے۔ وہ جھولی میں آٹا ڈال کے دروازہ اچھی طرح بند کرتا اور واپس کنڈی کھڑکا کے چلا جاتا۔ محلے کے فقیر اس معمول کے عادی تھے۔ ان کے اور گھر کی بزرگ خواتین کے درمیان کنڈی کا یہ رابطہ ہمیشہ چلتا رہا۔ ان کا آنچل کبھی کسی نے نہیں دیکھا، نہ ان کی آواز سنی۔ اماں اور دادی کے درمیان کوئی 'جنریشن گیپ' نہیں تھا۔ دادی کو حضرت رابعہ بصری سے سخت عقیدت تھی۔ اماں نے ان کی عقیدت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پہلی نواسی کا نام رابعہ رکھا تھا، جو نواسی کو سخت ناپسند تھا۔

Scanned with CamScanner

ان نیک بیبیوں کو دنیا کی خبر کبھی نہ ہوئی۔

چند سال پہلے تنو گھر آئی تھی۔ بہری بھنڈ دادی اب اپنے کھٹولے پر پڑی رہتی تھیں۔ اماں کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے لیکن بینائی برائے نام رہ گئی تھی۔ مولوی چچا کا آموں کا باغ کٹ گیا تھا۔ وہاں چمڑا بنانے کا کارخانہ لگ گیا تھا۔ گرمیوں میں امرائیاں بوراتیں تو بھینی بھینی خوشبو ہر طرف چکراتی پھرتی — اب چمڑا مہکتا تھا۔ کئی فرلانگ دور سے اس کی بو محسوس کی جاسکتی تھی۔ دادی بڑی نفاست پسند تھیں؛ دادا کے انتقال کے بعد بھی سفید کپڑوں پر ہلکا سا عطر ضرور لگاتیں۔ اماں کانوں میں بیلے کی کلیاں چاندی کی بالیوں میں پرو کر پہنتیں۔ اچھا ہے، دادی کے سارے حواس جاتے رہے، خوشبو بدبو کا بھی کوئی احساس نہیں۔ زندگی الٹے گوپال، آموں اور اچھن پر بنائے گئے کبت کی جگہ بالکل چڑیل صورت ہوگئی ہے — دانت نکوسے۔ دل ہر وقت ڈوبتا سا رہتا۔ کسی روبوٹ کی طرح اکیلی تنو سارے گھر میں گھومتی پھرتی تھی۔

اماں اور دادی سے یہ تنو کی آخری ملاقات تھی۔ دونوں آگے پیچھے اپنی اپنی نیکیوں کا اجر سمیٹنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ اماں اگر دادی کی عمر پاتیں تو ابھی اور بہت دن جی سکتی تھیں۔

جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو اسٹیشن پر اندھیرا تھا۔ بجلی چلی گئی تھی اور آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی برسات کا ہی موسم تھا۔ سلمان کو اس کے باپ نے دھکا دے کے بھیجا تھا کہ جا کے تنو کو لے آئے۔ وہ نہایت خراب موڈ میں تھا۔ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالے، جوتے کی نوک سے خیالی کنکروں کو ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ بارش کے اندیشے سے تنو ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے آ گئی۔ یکا یک ٹپ سے وہ کچھ گرا جو پانی نہیں تھا۔ پھر کچھ دیر بعد ٹپ سے کچھ اور۔ ٹاٹپ جاری رہی۔ تنو ذرا سا ہلی تو چپل کے نیچے کچ سے کچھ آیا۔

''کاہے کا درخت ہے سلمان؟ اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

''اور جیسے میں تو روشنی میں کھڑا ہوں!'' وہ دھیرے سے بدبدایا، پھر بولا، ''مولسری کا درخت ہے، پھل گر رہے ہوں گے۔''

''پھل یا پھول؟''

''پتا نہیں،'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ پھر مزید جھنجھنایا، ''بال کی کھال نکالنے لگتی ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''اب سب ایک دوسرے سے بیزار کیوں رہا کرتے ہیں؟'' تنو نے اداسی سے سوچا۔ پھر اسے یاد آیا ایسے تو مہوے کے درخت کے نیچے مہوا ٹپکا کرتا تھا — ٹپ ٹپ ٹپ۔ سنہرے رس بھرے انگوروں جیسے پھول۔ تنو انھیں پھل سمجھتی تھی، ناگوار حد تک تیز میٹھی خوشبو والے؛ سوکھیں تو جیسے کشمش۔ لپاگو نے بتایا تھا، اس کی دادی خشک مہوے اور گیہوں کے موٹے پسے آٹے سے بڑی مزیدار لپسی پکاتی تھی۔ مولسری نے ایک اور پھل ٹپکایا — ٹپ۔

ٹیپ سے ٹپاک سے کپار کاہے پھوڑے رے
ہینگر ایسا ڈینگر ایسا رات کاہے ڈولے رے

''تنو منی، بوجھیے تو جانیں!'' لپاگو نے پہیلی بجھائی۔

''جانے کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے،'' اچھن نے منھ چڑایا۔

''بکواس نہیں اچھن بھیا، بوجھیے نا۔ بجھول ہے۔''

''ارے یہ کیسی بجھول! تیری الٹی کھوپڑی جیسی۔''

''اچھا کہیے، ہاری۔''

تنو کی انا پر تجسس حاوی ہو گیا۔ ایک بار میں ہی 'ہاری' بول دی۔

''دیکھیے تنو منی، ایک تھا مہوے کا پیڑ۔'' اچھن نے گردن ٹیڑھی کی۔ لپاگو نے ٹیڑھی گردن کو یکسر نظر انداز کر دیا اور یوں گویا ہوا۔ ''ایک تھا مہوے کا پیڑ۔ اس کے نیچے رات کو ایک سانپ آن کے بیٹھ گیا۔ پھن کاڑھے کالا سانپ... شوٗاوں...'' لپاگو نے آواز نکالی اور ہاتھ سے سانپ کا پھن بنایا۔ ''مہوے کا پیڑ بھلا کاہے کو ڈرے! اس نے تاک تاک کے سانپ کے پھن پہ اپنے سنہرے رسیلے پھول ٹپکائے — ٹپاٹپ، ٹپاٹپ۔ سانپ جھونجھل کھا کے بولا:

ٹیپ سے ٹپاک سے کپار کاہے پھوڑے رے؟

پیڑ کاہے کو چوکتا! ترسے جواب دیا:

ہینگر ایسا ڈینگر ایسا رات کاہے ڈولے رے''

لپاگو نے ہاتھ سانپ کی طرح بنا کے پھر لہرایا۔ ''بغیر ہڈی والا جیو، سل سل کرتا سانپ، ارے تو اتنی رات کو ڈولتا ڈالتا بھلا میرے نیچے آیا ہی کیوں؟ اب تیرا سر پھوڑوں کہ نہ پھوڑوں؟ اب کیا ہے اچھن

بھیا، کہ سانپ کو ایسا دوٹوک جواب کسی نے کاہے کو دیا ہوگا۔ وہ کھسیا کے وہاں سے بھاگ گیا۔"

سانپ کے کھسیانے کی بات نے سب کو خوب ہی تو محظوظ کیا۔ لپا گو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ایک تو اس کی پہیلی کوئی بوجھ نہ پایا: اس پر سے پہیلی میں پوشیدہ کہانی سب کو خوب ہی تو بھائی۔ وہ کہانی دہرا دہرا کے گھر کی بزرگ خواتین کو خوب ہی تو عاجز کیا کرتا۔ لاکھ دادی چلاتیں اور اماں نصیحت کرتیں کہ رات میں نام مت لیا کرو، ماموں کھو یا رہتی، لیکن کوئی کاہے کو سنتا۔ سب ایک دوسرے کے سر پر ٹیپ مارتے اور کہتے، "ڈھینگر ایسا ڈینگر ایسا رات کاہے ڈولے رہے۔"

کچھ عرصے بعد جمیل بھائی اپنے لانبے قد اور دبلے پتلے جسم کی وجہ سے مستقل طور پر 'ڈھینگر ڈینگر' کہلانے لگے۔

ڈھینگر ڈینگر جمیل دلّی کے کسی آرکیٹیکٹ سے ایک دوست کے مکان کا نقشہ بنوانے کو جاتے ہوئے کار کے حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ بس مہینے بھر پہلے بڑی اچھی ملازمت ملی تھی۔

کبیرا گرب نہ کیجیے، کال گہے کر کیس
کیا جانیے کِت مارِیے، کیا گھر کیا پردیس

ارے میاں کبیر، کبھی تو کوئی دل خوش کن بات کر لیتے! اب دیکھو نا، ایسا لگتا ہے جیسے ایک مہیب صورت، سیاہ فام، دیو قامت انسان لوگوں کے بال پکڑے گھسیٹتا لیے چلا جا رہا ہے۔ لوگ گھس گھسا کے چنوں جیسے ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں ایک بڑے سے ٹوٹے پھوٹے بدرنگ پیالے میں ڈالتا ہے، پھر مٹھی بھر کے منھ میں — کڑ کڑ کڑاک! کھلک چبینا کال کا... تنو رونکھی ہوگئی تھی۔ ڈر کے مارے اس نے آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ لی تھیں۔ تب جمیل بھائی نے نظیر اکبرآبادی کی نظم 'ریچھ کا بچہ' سنا کر اسے ہنسایا تھا۔ وہ منھ سے بڑی عمدہ ڈگڈگی بجایا کرتے تھے۔ ان کی ڈگڈگی کی تال پر لپا گو ریچھ کا بچہ بن کر ناچا تھا اور تنو کی ساری کلفت دور ہوگئی تھی۔ ہنسی اب اتنی جلدی کیوں نہیں آتی؟ رونے اور ہنسنے کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ کیوں گئے ہیں؟ قہقہے کہاں گم ہو گئے؟

بھاری دل کے ساتھ تنو نے بیلے کا گملا سرکایا۔ پودا کلیوں سے بھرا ہوا تھا۔

تنو نے ایک رسالے میں ایک پنجابی گیت کا ترجمہ پڑھا جس میں محبوب کے دانتوں کو بیلے کی کلیوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اپنی قابلیت بگھارنے کے لیے اس نے اسے اپنی 'لوک سبھا' میں دہرایا

Scanned with CamScanner

اور مطلب بیان کیے۔ لپا گو نے اس حسین تشبیہ کا تیاپانچا کر کے رکھ دیا۔ دانت نپور کر بولے، ''اب اگر بتیسی کی جگہ بیلے کی کلیاں ہوں اور جو کہیں گنا مل جائے چھیل کے کھائے کو؟ یا ہڈی چباوے کو پڑے، وہ بھی تنو منی کی طرح؟... ایسے چباتی ہیں کہ کتے کے کھانے کے لائق نہ رہ جائے! تو بھیا، دانت تو کچ کچ کر کے باہر۔ ہیں ہیں ہیں... باہر بھی نہیں، سیدھے پیٹ کے اندر۔ اور منھ ایسا جیسے ابھی پیدا ہوئے ہوں۔''

کمبخت، اوندھی کھوپڑی... جو بات کرے گا سو الٹی! مارے غصے کے تنو رونکھی ہو گئی۔ گرچہ اراکین کو اس تشبیہ کی درگت، جو دراصل تنو کی درگت تھی، بہت پسند آئی تھی لیکن وہ اس بات سے بھی خاصے خوش ہوئے کہ گوپال کی کھوپڑی اوندھی ہے۔ اس لیے اراکین نے گوپال کو، جو اس وقت تک لپا گو کے درجے پر فائز نہیں ہوئے تھے، الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ اچھن تو بھاگ کے سلیٹ اور چاک بھی اٹھا لائے اور نفیس احمد عرف بھیا کا فیصلہ آخری مانا گیا۔ اس طرح گوپال بن گئے 'لپا گو'، اور تنو ان سب میں سب سے زیادہ ہنسی۔ بقول دادی 'ڈھینگ کی ڈھینگ' اور بقول بھیا 'لمڈھگ' اور بقول جمیل بھائی 'ٹنڈا'— بانس بانس بھر اچھلتی تنو یقیناً یہ سب لگی ہوگی، بلکہ ان سب کا امتزاج۔

''کیا واقعی میں کبھی اس طرح ہنس سکتی تھی؟ دل کے اندر کی گہرائیوں سے؟ وہ بھی ایسی فضول باتوں پر؟'' تنو نے گملے کو پرلی طرف رکھا اور مرچوں بھرا سوپ اٹھایا۔ آج دن بھر دھوپ نکلی تھی— برسات کی صاف ستھری چٹک دھوپ۔ جی چاہے، مرتبان میں بھر کے رکھ لو کہ جھڑی لگنے کے وقت کام آئے۔ ساری مرچیں سیلی جا رہی تھیں۔ وہ بیچ بیچ ہنس پڑی۔ پھر شرمندہ ہو اٹھی۔ کہیں کوئی اسے یوں اکیلے میں ہنستے تو نہیں دیکھ رہا! کہیں کوئی مرتبان میں دھوپ بھرنے کا احمقانہ خیال تو نہیں پڑھ لے رہا! کیا ہی اچھا ہے کہ سائنس نے ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا جس سے دوسروں کے خیالات پڑھے جا سکیں۔

وہاں کوئی نہیں تھا، علاوہ اس بلی کے جو دیرے سے منڈیر پر ساکت بیٹھی ایک چوہے پر گھات لگا رہی تھی۔ نیچائی سے تنو کو اس کے صرف دو کان نظر آ رہے تھے، نوکیلے زرد پتوں کی طرح۔ یکلخت وہ دھب سے کودی۔ ایک موٹا چوہا جان بچا کے بھاگا۔ مٹھو نے پھر چک پھیریاں لیں اور چلایا:

''بل بل بل... ہش ہش...''

Scanned with CamScanner

لپا گو نے بتایا تھا کہ اس کے پڑوس میں ایک مولی ساب رہا کرتے تھے۔ ایک دن مولویائن نماز پڑھ رہی تھی کہ بلی آ گئی۔ دودھ کی پتیلی منھ میں ڈالنے ہی والی تھی کہ مولویائن زور سے بولیں: ''الحمد اللہ ربل...'' اور سورہ فاتحہ کا باقی حصہ حسبِ دستور زیرِ لب پڑھا۔ بلی بھاگ نکلی، قصہ رہ گیا۔

''ارے کمبخت لپا گو! بچوں کو یہ کیا سکھادیا ہے۔ بے ادبی کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں بلی دیکھی 'الحمد اللہ ربل...' کا ورد شروع۔'' ''خیر سے آس پاس بلیاں تھیں بھی کئی عدد۔'' ''یہ مٹ گیا اللہ مارا مٹھو! 'بی جی بھیجو' سیکھنے میں اتنے دن لگادیے اور 'ربل بل' جھٹ سے ازبر۔''

جمیل بھائی نے دادی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''دادی، یہ قصہ تو لپا گو سے پہلے اس سرفراز لطیفے باز نے سنایا تھا۔ لپا گو نے تو محض اس میں یہ پھندنا ٹانکا ہے کہ مولویائن اس کے پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔ پتا نہیں ہر بات میں مذہب کہاں سے درآتا ہے۔ کہہ گئے ناداس کبیر کہ 'ہندوانداھاتڑ کو کانا'۔'' انھوں نے ایک آنکھ دبائی اور دیر تک کانے بنے رہے۔

جمیل بھائی کی خبر سن کے لپا گو کچھ دیر گم سم بت بنا بیٹھا رہا تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ برس بعد ادھر آیا تھا۔ ابا نے اسے زمانہ پہلے کسی کارپوریشن میں نوکری دلوادی تھی۔ اس کا بھٹہ بیٹھ گیا۔ ملازمین کو سالوں تنخواہ نہیں ملی تو لپا گو واپس گاؤں چلا گیا۔ تب سے وہ بس یوں ہی کبھی کبھار ہینگر ڈینگر سا آن نکلتا تھا، اور اس بار تو خیر بہت دن لگا دیے تھے۔

''تنومنی...'' (وہ سب چالیسویں پر اکٹھے ہوے تھے۔) ''ہم ہر گھٹنا پر یہی سوچتے ہیں کہ اس سے بھی برا ہو سکتا تھا۔ تب ہمیں تسلی مل جاتی ہے۔ اب دیکھیے نا، ہماری لگی لگائی نوکری چلی گئی۔ اگر ہاتھ پیر چلے جاتے تو ہماری لگائی کا کیا ہوتا؟ چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ کھیت مجوری کر کے سب کو پال لیا نا! دونوں لڑکے نکل لیے۔ ایک کلکتے میں ہے، ایک پٹنے میں۔ دو لڑکیاں تھیں۔ بیاہ کے اپنے اپنے گھر۔''

دھیا جنوائی لے گئے، بہویں لے گئیں پوت
داس کبیرا یوں کہیں، تو رہا اوت کا اوت

یہ جمیل بھیا بولتے تھے...'' اس نے جلدی سے کہا۔

''گوپال، جمیل بھائی کے ساتھ اس سے برا کیا ہو سکتا تھا؟'' تنو نے اندر امنڈتی برہمی کو پی کر کہا۔

''جمیل بھیا کا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اگر بیاہ ہو گیا ہوتا تو دلہن تو کم عمر رہتی نا۔ ابھی ایک آدھ بال بچہ رہتا۔ کون اگورتا، بتایئے تو؟'' لپا گو نے دنیا دیکھ کر جان لیا تھا کہ کسی کے گھر کوئی کسی کو اگورا نہیں کرتا۔ لپا گو نے آگے بھی بات جاری رکھی تھی، ''اور تنو منی، جو جمیل بھیا مرتے نہیں لیکن اپاہج ہو کر ایسے پڑ جاتے جیسے نسیم چچا کا بیٹا...''

تنو کانپ کانپ گئی تھی۔

''لڑکے بالے ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے اپنا دھیان بٹانے کو پوچھ لیا تھا۔

''ٹھیک ہی ہوں گے۔'' اس کی آواز میں تاسف کی آہٹ تھی لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا تھا۔

''دو جون کی نمک روٹی کا پیسہ ہو جاتا ہے۔ لگائی کا دماغ چل گیا ہے۔ پہلے بھی ماتھا کمزور تھا۔ جو اناج کما کے لاتے ہیں خود ہی ٹھوکنا بھی پڑتا ہے۔ مگر ہم سوچتے ہیں تنو منی، کہ جیسی بھی ہے، ساتھ تو ہے۔ نہیں تو جھونپڑی میں الو بولتا۔ جب کام نہیں ملتا تو اس کی سیوا کر کے وقت کاٹ لیتے ہیں۔''

تنو نے دیکھا، گوپال کی قمیص کئی جگہ سے گونتھی ہوئی تھی۔ اس کے پیر میں چپل نہیں تھے۔ جب وہ ان لوگوں کے ساتھ تھا، اس کا حلیہ کہیں بہتر ہوا کرتا تھا۔ صحت بھی اچھی تھی۔ اب وہ بالکل گھسا ہوا لگ رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی صورت چنے جیسی ہو جائے گی اور وہ اس پچکے ہوئے مہیب المونیم کے پیالے میں جا پڑے گا۔ تنو نے ہول کر سوچا کہ وہ بھی جمیل بھائی جیسی بن گئی ہے۔

''ہونی کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی تنو منی، اور سمے کو کوئی نہیں روک سکا۔ باقی رہا یہ سنسار، یہ اپنی چال چلتا رہتا ہے،'' الٹی عقل والے گوپال نے مسرور لہجے میں کہا۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر کھلے دل کے ساتھ ہنسا۔ بھیا نے جھلا کے کہا، ''ابے، اب کیا ہوا؟''

''ہم سوچ رہے تھے بھیا، کہ آپ جس تخت پر بیٹھے ہیں یہ اگر سونے کا ہو جائے تو... بس ہمیں ہنسی آ گئی۔''

''دماغ تیرا چل گیا ہے، تیری بیوی کا نہیں۔ بلا وجہ بیچاری کو بدنام کر رکھا ہے۔''

اس نے بھیا کی تشخیص کو یکسر انداز کر دیا۔

''دیکھیے تنو منی... شاما آئی!'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کے کہا۔

اماں منڈیر پر کاکن اور پانی رکھا کرتی تھیں۔ ان کے اس لنگر خانے میں بہت سی چڑیاں آیا کرتی تھیں، لیکن تنو کو سب سے اچھی لگتی تھی سانولی سلونی شاما — لانبی پتلی، بے چین دُم والی شاما۔

شاما تو یہاں بھی آتی ہے اور گوریاں بھی اور آس پاس کے درختوں پر فاختہ آواز لگاتی ہے: 'اے دوست تو!' اور تمھاری چھت پر رکھے ان سوسوا سو گملوں میں پھول ہی پھول کھل جاتے ہیں، تو پھر تنو بی بی، تم دل گرفتہ اور اداس کیوں رہتی ہو؟ کیوں تم نے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو گرد کی طرح دامن سے جھاڑ رکھا ہے؟

گوپال نے صرف ایک بات اداس ہو کر کہی تھی: ''ہمیں اب کوئی لپا گو کیوں نہیں کہتا؟''

''ارے منواماٹی ملے ...'' سڑک سے گزرتی بچیا دھوبن نے اپنے لڑکے کو زور سے ڈانٹا جو گٹھری سر پہ رکھ کر ٹیڑھا میڑھا چل رہا تھا۔ پنجرے میں مٹھو نے نقل اتاری: ''ارے منواماٹی ملے۔'' تنو بے ساختہ ہنس پڑی — ایسی ہنسی جو دل کے اندر پھوٹتی ہے جس کے دیکھے سنے جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔

سڑک پر رام دھن کی گیتا رُنبھائی۔ بکری کے دو سیاہ مخملی بچے آڑے آڑے پھدکے۔ زینیا کے پودوں میں سے شوخ کلیوں نے جھانک کر دیکھا۔ آسمان میں پھر بادل اٹھے، ہاتھی جیسے سیاہ اور روئی جیسے ہلکے — قدرت کا تضاد۔ میناؤں کا ایک جھنڈ بھرّ امار کے اڑا۔ طوطوں کی ڈار نے سبز رنگ بکھیرا۔ پڑوسن کے ننھے پوتے نے پالنے میں 'غاؤں غاؤں' کی۔ اس کی خوبصورت کمسن ماں نے منڈیر سے جھانک کر کہا، ''تنو چاچی، اچھی ہیں نا؟ کوئی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔ اب کی آپ کے گل داؤدی ہمیشہ سے اچھے کھلیں گے۔ پودے خوب ہرے ہیں۔''

دنیا بہت حسین تھی اور ذہن کو منور کرنے کے لیے یادوں کے جگنو تھے اور فرد اپنی ذات میں انجمن تھا اور ہر کسی کی زندگی میں کہیں نہ کہیں کوئی لپا گو تھا اور کوئی اچھن، کوئی بھیا، کوئی جمیل بھائی اور دادی جیسی غیر مشروط محبت کرنے والی کوئی ہستی، اور خوش رہنے کی بھی اتنی ہی وجوہات تھیں جتنی اداس رہنے کے لیے — شرط صرف انھیں پلکوں سے چن لینے کی تھی۔

❁❁

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابیں

لغات روزمرہ
(اردو میں زبان کے غیر معیاری
استعمالات کی فہرست)
قیمت:250روپے

سوار اور دوسرے افسانے
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت:350روپے

ساحری، شاہی، صاحب قرانی
(داستان امیر حمزہ کا مطالعہ
جلد اول تا سوم
قیمت:1110روپے

آسماں محراب
(شاعری)
۱۹۷۶ سے ۱۹۹۶ تک کے کلام کا انتخاب
قیمت:315روپے

کئی چاند تھے سر آسماں
(ناول)
قیمت:600روپے

تنقیدی افکار
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت:250روپے

افسانے کی حمایت میں
(نظر ثانی اور اضافہ شدہ اشاعت
قیمت:240روپے

The Colour of Black Flower
(Selected Poems)
قیمت:250روپے

Scanned with CamScanner

شاعری

ریت پہ بہتا پانی
قاسم یعقوب
قیمت:160روپے

خودکشی کے موسم میں
زاہد امروز
قیمت:120روپے

مٹی کی کان
افضال احمد سید
قیمت:500روپے

مٹی کا مضمون
فرخ یار
قیمت:150روپے

سویرے کا سیاہ دودھ
پاؤل سیلان؛ ترجمہ: آفتاب حسین
قیمت:150روپے

جنگ کے دنوں میں
ذی شان ساحل
قیمت:125روپے

ای میل اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
قیمت:150روپے

نیم تاریک محبت
ذی شان ساحل
قیمت:100روپے

Scanned with CamScanner

سنیل گنگوپادھیائے

ہندی سے ترجمہ: شائستہ فاخری

کیرتی ناشا کے دو کنارے

دوپہر تک آندھی پانی کا کوئی گمان بھی نہیں تھا۔ دور نیلے آسمان میں سیاہ نقطے جیسا منڈلاتا چیلوں کا غول، نیچے کی طرف اڑتے بگلوں کا جھنڈ۔ پھاگن کا مہینہ اپنے اختتام پر تھا۔ اُتر کی سرد ہوا کے جھونکے تو نہیں تھے لیکن گرمی کی تپش کی شروعات بھی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

آگے پیچھے بھالا لیے ہوئے چھ پہریداروں اور ایک بندوق بردار سپاہی کے ساتھ شری پور سے ایک پالکی روانہ ہوئی۔ اس کو تال ہری گاؤں جانا تھا جہاں کی مسافت ڈھائی تین گھنٹے میں طے ہوتی تھی۔ پالکی کے دونوں طرف موٹے موٹے پردے پڑے تھے۔

انھوں نے آدھا راستہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورا کیا۔ ویسے کوئی رکاوٹ آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اُن دنوں بنگال میں لٹیروں ڈاکوؤں کی کارروائیاں عروج پر تھیں، لیکن سات ہتھیار بند محافظ ساتھ تھے، اور ان میں سے ایک تو بندوق بردار تھا جسے دیکھ کر لٹیروں یا ڈاکوؤں کے گروہ کی ان پر حملہ کرنے کی ہمت جواب دے دیتی۔

کہار دوڑے دوڑے چلتے ہیں، وہ اسی طرح چلنے کے عادی ہیں۔ پورا ایک پہر وہ اسی طرح راستہ طے کر سکتے ہیں۔ لیکن ان ساتھ چلتے پا پیادہ پہریدار اس طرح نہیں چل پاتے، وہ ہانپ جاتے ہیں، اس لیے ان کو بیچ بیچ میں رک کر آرام کرنا پڑ رہا تھا۔

ادھر کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ تھوڑی دوری پر پدما ندی تھی۔ کچھ کھنڈر نما گھر آنگنوں کو دیکھ کر

Scanned with CamScanner

اندازہ لگتا تھا کہ کبھی یہاں بھی گھنی آبادی تھی۔ شاید کسی مہاماری (وبا) میں اجڑ گئی۔ ندی کے کنارے بسے ہوئے گاؤوں میں فرنگی سمندری لٹیرے آ کر خوب تباہی مچاتے تھے۔ ان دنوں یہاں کی بستی اجڑ جانے کی وجہ سے وہ جزیرے کی طرف چلے گئے تھے۔

کھلے میدان میں شاخ در شاخ پھیلا پیپل کا ایک تناور پیڑ تھا۔ اس کے بالکل قریب تاڑ کے تین پیڑ تھے۔ وہیں پر کہاروں نے پالکی اتاری۔ کہار اپنی کمر میں کسے ہوئے انگوچھے کو کھول کر پسینہ پونچھنے لگے۔ کچھ قریب کے تالاب میں اپنے ہاتھ پاؤں دھو کر پانی پینے گئے۔

پالکی میں دو عورتیں تھیں۔ ایک اونچے خاندان کی باوقار جوان خاتون اور دوسری اس کی درمیانی عمر کی کنیز۔ وہ خاتون سفید لباس میں تھی۔ جسم پر ایک بھی زیور نہیں تھا۔ مانگ بھی سیندور سے خالی تھی۔ اس کا رنگ تپتے کندن جیسا تھا، اس لیے پیدا ہوتے ہی اس کا نام سُورن مئی رکھا گیا تھا۔ وہ بے حد پردہ نشیں تھی۔ اس کے لیے ایک کلش میں پینے کا پانی اور کچھ پھل وغیرہ لایا گیا۔ آرام کے وقت اس نے صرف پانی پیا۔ پھر کنیز کے بار بار کہنے پر ایک پیٹھی کھائی۔

اچانک ہی بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑی۔ آسمان میں کب بادل گھر آئے، کسی کو احساس ہی نہیں ہوا۔ جہاں تک نظریں دوڑتیں، دور، افق کے اس پار تک بادل ہی بادل چھائے تھے۔ ان کی گڑگڑاہٹ سے دل کانپ اٹھتا۔

جو بندوق بردار اس قافلے کا سربراہ تھا اس کا نام ولبھ رام تھا۔ وہ کھڑا ہو کر سمت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ علاقہ نہ صرف سنسان تھا بلکہ یہاں پیڑ بھی کم تھے۔ کچھ دور پر مندر کا گنبد نظر آ رہا تھا۔ ولبھ رام کو پتا تھا کہ وہ مندر بھی اب کھنڈر بن چکا ہے۔ ویسے اس کے پاس سے اگر نکل لیا جائے تو کچھ ہی دوری پر تال مچھری گاؤں جانے کا راستہ مل جائے گا، لیکن آسمان میں سیاہ بادل چھائے تھے۔ ایسے بادل چھانے پر گھنگھور بارش ہوتی ہے، ساتھ ہی بجلی بھی گرتی ہے، اس لیے ابھی تو پیڑ کے نیچے انتظار کرنا ہی بہتر ہوگا۔

کچھ دیر تک ہر طرف ایک عجیب سا سناٹا چھایا رہا۔ نہ بجلی کڑکی، نہ پتے ہلے۔ قدرت جیسے خاموش کھڑی تھی۔ پھر افق کے اس پار سے جیسے ایک ٹھنڈا جھونکا سا آیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے طوفان میں بدل گئے اور اس کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ کچھ دیر پہلے

Scanned with CamScanner

کہیں ہوا کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور اب اتنی تیز ہوا چل رہی تھی کہ کھڑے رہنا دوبھر لگ رہا تھا کہ کہیں ہوا اڑا کر نہ لے جائے۔ اب وہ طوفانی ہوا پیڑ کی موٹی موٹی شاخیں توڑنے لگی۔ اتنی تیز بارش تھی کہ مندر کا گنبد بھی اب صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ زوروں کی بجلی کڑک رہی تھی۔ تبھی پیپل کے پیڑ کی ایک بڑی سی شاخ چرمرا کر گر پڑی۔ فوراً پالکی کو کھلے آسمان کے نیچے لا کر رکھا گیا۔ اس بیچ بڑی بڑی بوندوں کے ساتھ اولے بھی برسنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کسی کی دردناک چیخ سنائی پڑی۔

پہلے اس زوردار بارش میں کوئی سمجھ نہیں پایا کہ یہ چیخ کہاں سے آئی۔ پھر اس بارش میں نظریں گڑا کر دو تین لوگ ایک ساتھ چلا پڑے۔ ''بجلی گری ہے، بجلی گری ہے، ملک چند ختم ہو گیا۔'' ملک چند نام کا پہریدار پانی سے سر چھپانے کے لیے ایک تاڑ کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ اسی کے سر پر بجلی گری تھی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کا مردہ جسم بری جھلسا ہوا تھا۔ سب تھوڑی دوری بنائے اس کی لاش کو گھیرے کھڑے تھے جس سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

بجلی کیسے گرتی ہے، یہ ابھی تک کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ کیا آسمان سے آگ کا گولہ گرتا ہے؟ خیر، ملک چند کی لاش کو اسی طرح چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ یہی اس قسمت میں تھا۔ قسمت سے بڑا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اس وقت یہاں کھڑے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کھلا میدان ہو یا پیڑ کی چھاؤں، بجلی کہیں بھی کسی وقت گر سکتی ہے۔ ایسے موسم میں ہر بار کچھ لوگ بجلی گرنے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی کہار اور پہریدار پالکی کو وہیں چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے کے لیے بے تحاشا بھاگ اٹھے۔ ان میں ولبھ رام ہی ذمے دار شخص تھا اس لیے وہ نہیں بھاگا۔ اس نے ایک بھاگتے کہار کی گردن دبوچ کر کہا، ''سؤر! رانی دیدی کو چھوڑ کر کہاں بھاگا جا رہا ہے؟ اس کے بعد تیری گردن صحیح سلامت رہے گی؟''

ولبھ رام اور اس کہار نے مل کر پالکی اٹھائی، پھر وہ دونوں اس کھنڈر نما مندر کی طرف لپکے۔ بندوق ولبھ رام کے پاس تھی لیکن اس کے کارتوس بارش میں بھیگ کر بیکار ہو گئے تھے۔ اس دھواں دھار بارش اور طوفان کو کاٹتے ہوئے مشکل سے پالکی کو لے کر دونوں اس ٹوٹے پھوٹے مندر کے اندر آئے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ دوسرے کہاروں اور پہریداروں نے بھی الٹے پاؤں لوٹ کر اس مندر کے اندر پناہ لی۔

Scanned with CamScanner

کبھی یہ ایک شوالہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ قدرت کے نہیں بلکہ انسان کے ہاتھوں اس کی بربادی ہوئی ہوگی۔ مندر میں شولنگ بھی موجود نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ 'کالا پہاڑ' نام کے کسی ظالم سیناپتی (سپہ سالار) نے اس علاقے کے بہت سارے مندروں کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ پالکی میں بیٹھی دونوں عورتوں میں ذرہ برابر بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ان کو یقین تھا کہ ساتھ میں آئے ہوئے کہار اور پہریدار اپنی اپنی ذمے داری نبھائیں گے، کیونکہ فرض نبھانے میں کوتاہی ان کی جان لینے کے لیے کافی ہے۔

کچھ ہی دیر میں طوفان تھم گیا۔ دھیرے دھیرے بارش رک گئی۔ اس کے بعد اس اندھیرے مندر میں سورج کی کرنوں کی روشنی آتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ آسمان اب صاف ہو چکا ہے۔ اس بیچ سبھی بھاگے ہوئے کہار اور پہریدار اپنی اپنی جان کی امان کی خاطر لوٹ آئے تھے۔ اب ولبھ رام کے حکم پر وہ پالکی اٹھا کر باہر آ گئے۔ اتنی تیز بارش کے بعد ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ ایک ساتھ ان گنت چڑیاں چہچہا رہی تھیں، شاید مصیبت ٹلنے کی خوشی میں۔ اس خاص شوالے کے آس پاس اور کئی کمرے بنے تھے۔ ان کی حالت بھی ویسی ہی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ ان میں سے ایک کمرے کے سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ شاید ان لوگوں نے بھی اس موسلا دھار بارش سے بچنے کے لیے یہاں پناہ لی تھی۔ ان میں سے ایک نے ولبھ رام کی طرف دیکھ کر کہا، ''کس طرف جایئے گا حضور؟ اف، کیسی مصیبت آئی تھی، باپ رے باپ!''

انجان لوگوں سے اپنی منزل کا ذکر کرنا مناسب نہیں، اس لیے ولبھ رام نے رعب دار آواز میں کہا، ''ہم پچھم کی طرف جائیں گے۔''

اس شخص نے کہا، ''ہم بھی تو اُدھر ہی جائیں گے۔ چلیے، ایک ساتھ چلتے ہیں، زمانہ اچھا نہیں ہے۔''

ولبھ رام نے ان دیہاتیوں کو اپنے منھ لگانے کے قابل نہیں سمجھا۔ سنجیدگی سے بولا، ''ہم راجہ کے سپاہی ہیں، ہمیں ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنا رستہ ناپو۔''

قریب ہی پیڑ سے ایک گھوڑا بندھا تھا۔ اس کے پیر کے دونوں طرف دو صندوق لٹک رہے تھے۔ وہ آدمی ایک ہی چھلانگ میں اس گھوڑے پر چڑھ بیٹھا، پھر ادھر آ کر کہنے لگا، ''آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں حضور؟ میں تو بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔ سب کے ساتھ چلنے سے اپنی طاقت بڑھتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے، گابائیا کے میدان میں ڈکیتی ہوگئی۔"

گھڑسوار اور پیدل کے رتبے میں ایک بڑا فرق رہتا ہے۔ پیدل آدمی کو نظر اٹھا کر بات کرنی پڑتی ہے، جس سے ولبھ رام خود کو کمتر محسوس کر رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس کی خواہش تھی کہ راجہ کے گھڑسواروں میں اس کا بھی نام آئے، مگر نہ جانے کون اس کو پیچھے سے لنگڑی مار رہا تھا، جس کی وجہ سے اس پر چھوٹے کمار کی خاص اچھی نظریں نہیں تھیں۔ بغیر کوئی جواب دیے اس نے بندوق کی لبلبی پر اپنی انگلی رکھی۔ کسی بھی ڈاکو کے گروہ کے پاس ایسا جدید ہتھیار نہیں تھا۔

اس کا اشارہ سمجھ کر وہ گھڑسوار ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا۔ "سپاہی جی، اس بارش میں آپ پوری طرح بھیگ چکے ہیں۔ مگر آپ کے پاس کارتوس تو صحیح سلامت ہیں نا؟ ان کو تو آپ نے سنبھال کر رکھا ہوگا۔ ارے، اس ڈال پر دو پرندے بیٹھے ہیں۔ ذرا آزما کر دیکھ لیجیے، نشانہ صحیح لگتا بھی ہے یا نہیں!"

اس کے اس باتونی پن کو نظر انداز کرتے ہوئے ولبھ رام نے اسی رعب کے ساتھ کہا، "سامنے سے ہٹ جا! ہمیں جانا ہے۔" پھر اس نے کہاروں کو ڈانٹتے ہوئے کہا، "تم لوگ منھ اٹھائے کیا دیکھے جا رہے ہو؟ چلو، چلو، دن ڈھلنے کو آیا۔"

اس گھڑسوار نے کہا، "ٹھہریے، ٹھہریے جناب۔ اتنی جلدی بھی کس بات کی؟ آپ عزت دار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کسی رشتے دار کے یہاں جا رہے ہیں کیا؟ ساتھ میں مٹھائی پکوان تو ضرور ہوں گے۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

ولبھ رام نے کہا، "نہیں، ساتھ میں وہ سب کچھ نہیں ہے۔ تیری ہمت تو کچھ زیادہ ہی ہے! تو ہمیں دیر کروا رہا ہے۔"

اس گھڑسوار نے بناوٹی رونی آواز میں کہا، "بہت بھوک جو لگی ہے، کچھ دیجیے تو سہی۔"

تبھی پالکی پر پڑے پردے ذرا کھلے، وہاں سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور اس گھڑسوار کی طرف کیلوں کا ایک گچھا پھینکا۔ وہ آدمی دوبارہ ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا۔ "کیلا؟ ہمیں کیا بندر سمجھ رکھا ہے؟" اس کے دوسرے ساتھی بھی اس بیچ اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس آدمی نے کہا، "ابے دیکھ، اس پالکی میں کیا ہے؟"

ولبھ رام نے کہا، "اے، بے ادب! ہوشیار!"

Scanned with CamScanner

ان لٹیروں نے ولبھ رام کی کوئی پروا نہیں کی۔ ان میں سے دو پالکی کی طرف بڑھے۔ اب پالکی کے ساتھ آئے ہوئے چھ بھالا دھاری پہریدار تن کر کھڑے ہو گئے۔

اُدھر گھوڑے کے دونوں طرف جو صندوق لٹک رہے تھے، دوسرے لٹیروں نے ان کو کھول کر خنجر، چاقو اور دو تلواریں نکالیں۔ ایک تلوار اس گھڑسوار نے ہاتھ میں لی۔ ولبھ رام کے پاس بندوق کے ہوتے ہوئے بھی وہ اسے کام میں نہ لا سکا۔ کارتوس بھیگ کر کاغذ بن چکے تھے۔ ان حالات میں گھڑسوار آسانی سے ولبھ رام کو قتل کر سکتا تھا، لیکن اس کے بدلے وہ ولبھ رام کے چاروں طرف چکر کاٹ کاٹ کر تلوار کی نوک سے اس کی گردن، کمر اور سینے کو چھو رہا تھا اور قہقہے لگائے جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے پالکی کے ساتھ آئے ہوئے ان بھالا دھاری پہریداروں سے کہا، ''ابے بغیر بندوق کے سپاہی کے بھائیو! اگر اپنی بیویوں کو بیوہ نہیں کرنا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ کر ایک کنارے کھڑے ہو جاؤ۔''

پہریداروں میں ایک شخص اس دھمکی سے نہیں ڈرا۔ وہ پالکی کی حفاظت کے لیے اکیلا وہیں جما رہا۔ ایک لٹیرے کے قریب آتے ہی اس نے اس لٹیرے کی جانگھ میں بھالے کی نوک چبھو دی۔ اس گھڑسوار نے اس کے نزدیک آ کر ڈراؤنی آواز میں کہا، ''ارے تو کس مائی کا لال! ذرا دیکھوں تو تیری گردن میں کتنی طاقت ہے؟'' اس نے تلوار سے اس پہریدار کی گردن پر ایک وار کیا۔ اس نے پوری طرح اسے مارا نہیں، صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ اب کوئی ان کو روکنے والا نہیں رہا۔ دو لٹیروں نے ایک ہی جھٹکے میں پالکی پر پڑے پردے ہٹا دیے۔ ان لوگوں کا اندازہ صحیح تھا۔ پالکی میں ان دو عورتوں کے علاوہ کچھ مٹی کے گھڑوں میں عمدہ پکوان، مٹھائیاں، اروا چاول، دو نئی دھوتیاں، پھل وغیرہ تھے۔ یہ دونوں کسی پُرسے کے لیے جا رہی تھیں۔ وہاں یہ ساری چیزیں لے جانے کا رواج تھا۔

لٹیرے ان پکوانوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لوگ گھڑوں کا ڈھکن کھول کھول بھکّوں کی طرح کھانے لگے۔ اس گھڑسوار نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی کہا، ''اب دیکھ، ان کے پاس کتنے گہنے ہیں؟ دونوں عورتوں کو کھینچ کر باہر نکال۔''

اب ولبھ رام نے ہاتھ جوڑ کر کانپتی آواز میں کہا، ''بھائی، سامان جو لینا ہو لے لو، مہربانی کر کے ہماری رانی دیدی کو ہاتھ مت لگاؤ۔ میں تمھارے پیر پڑتا ہوں، ان کی عزت پر ہاتھ مت ڈالو، بس اتنا سا رحم کرو۔''

Scanned with CamScanner

اس گھڑسوار نے بھنویں سکوڑ کر ولبھ رام کی منتیں سنیں، پھر اپنے گروہ کے لٹیروں سے بولا،

''نکال، نکال باہر اسے۔''

ایک لٹیرے نے جیسے ہی سورن مئی کا ہاتھ پکڑا، اس کی کنیز دہاڑیں مار کر رونے لگی۔ ''ان کو مت پکڑیے، مت چھوئیے ان کو! ہمارے ساتھ اور کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس لٹیرے نے اس کنیز کی آنسو بھری التجا کو نظر انداز کر کے سورن مئی کو باہر نکالنے کے لیے زور سے کھینچا۔ اتنا دیکھتے ہی ولبھ رام نے دوڑتے ہوئے آکر اس لٹیرے کو کس کر پکڑتے ہوئے کہا، ''چھوڑ، چھوڑ! کیا تجھے دین دھرم کا بھی ڈر نہیں ہے؟ ایک بیوہ کے جسم پر ہاتھ لگاتا ہے!'' اس لٹیرے نے مڑ کر ولبھ رام کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

دو لٹیروں نے سورن مئی کو پالکی سے باہر نکال کر اس گھڑسوار کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس بیچ اس نے گھونگھٹ میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ ایک بھی لفظ اس کے منھ سے نہیں نکلا تھا۔ چِنّا داسی چیخے جا رہی تھی۔ اس گھڑسوار نے کہا، ''ارے ذرا کوئی گھونگھٹ تو ہٹاؤ، اس کا چاند سا چہرہ تو دیکھوں ذرا۔''

سورن مئی پتھر کا بت بنی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر پڑا گھونگھٹ ہٹ گیا۔

وہ گھڑسوار آنکھیں پھاڑے اس کے بے مثال حسن کو دیکھتا رہا۔

پھر اس نے بے حد جوشیلے انداز میں چلّا کر کہا، ''تو تو چاند سے بھی سندر ہے! آج صبح صبح بھگوان کو پوجا چڑھا کر آیا ہوں، ان کی کرپا ہے۔ ایسا انمول رتن مل جائے تو اور سب کچھ بیکار ہے۔''

چِنّا داسی ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی، ''ہے بھگوان، ہماری رکشا کرو! ہماری عزت بچا لو، ان پاپیوں کو تم سزا دو، ہے بھگوان...'' روتے روتے اس کی آواز رندھ گئی۔

لٹنے والے اور لوٹے جانے والے دونوں بھگوان کو یاد کر رہے تھے۔

اب گھڑسوار نے کہا، ''اے دانو، اے بھاگو، اس عورت کو میرے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھا دو۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے، باقی کا سارا مال آپس میں بانٹ لو۔''

سورن مئی نے اس بار بھی اپنے بچاؤ میں کچھ نہیں کیا۔ اس کی دونوں آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ چِنّا داسی اس کو کس کر پکڑے تھی۔ دونوں لٹیرے اس کو کھینچ رہے تھے۔

مورتی کے بغیر ایک کھنڈر نما مندر، سنسان وسیع میدان، کچھ دور پر گھنے پیڑوں کا سلسلہ۔ اتنی

Scanned with CamScanner

گھنگھور بارش کے بعد ماحول میں خاموشی چھائی تھی۔ اب لگتا تھا کہ اس دنیا میں کہیں کوئی دکھ مصیبت نہیں ہے۔ ان دور کھڑے پیڑوں کے جھرمٹ سے دو گھڑسوار نکل کر ادھر ہی آ رہے تھے۔ دونوں جوان تھے، اچھے خاصے پہناوے میں سجے دھجے تھے۔ ان میں ایک ذرا موٹا سا گنجا، دوسرا نوجوان، چھریرا، مضبوط، جیسے فولاد سے بنا ہو۔ دونوں کے چہروں پر کالی، گھنی قرینے سے بنی ڈاڑھی تھی۔ آہستہ آہستہ گھوڑوں کو آگے بڑھاتے ہوئے دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ دونوں مندر کی جانب نہیں بلکہ اس کی مخالف سمت کو بڑھ رہے تھے کہ تبھی کچھ لوگوں کی بات چیت اور خاص کر ایک عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس موٹے گھڑسوار کا نام داؤد تھا اور دوسرے کا نام عیسیٰ۔ داؤد نے کہا، ''وہاں کیا گڑبڑ ہو رہا ہے؟ اس مندر میں تو کوئی پوجا وجا کرنے یا کچھ چڑھانے کو نہیں آتا۔''

عیسیٰ نے کہا، ''میں اس راستے سے اکثر آتا جاتا ہوں۔ آج تک وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔''

داؤد نے کہا، ''چلو ایک بار چل کر دیکھ لیں۔''

عیسیٰ نے کہا، ''ضرورت کیا ہے؟ مجھے جلد سے جلد گوجھا باڑی پہنچنا ہے۔''

تبھی دور سے آتی ہوئی رونے کی وہ آواز اور تیز ہو گئی تو داؤد سے رہا نہ گیا۔ ''نہیں، چلو ایک بار چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں۔''

اس بیچ دو لٹیرے چنّا داسی کو زمین پر گرا کر سورن مئی کو گھوڑے پر چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھڑسوار اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر سورن مئی کو اوپر کھینچ رہا تھا۔

وہاں قریب پہنچ کر دونوں پورا ماجرا سمجھ گئے۔ داؤد نے گرج کر کہا، ''اے، رک! رک، اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو...''

وہ گھڑسوار لٹیرا سورن مئی کو پانے کی لالچ میں پاگل ہوا جا رہا تھا، اس نے داؤد کی للکار کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ اس عورت کو گھوڑے پر چڑھانے میں لگا ہوا تھا، چنّا داسی کو ایک لٹیرے نے اپنے پیروں تلے دبا رکھا تھا۔ وہ اس حالت میں بھی ان دو اجنبی گھڑسواروں کو دیکھ کر پھپھک پڑی۔ ''بچا لیجیے، ہماری رکشا کیجیے!''

داؤد اور عیسیٰ نے اپنی اپنی میان سے تلواریں نکالیں۔ اب جنگ چھڑ گئی۔ ان لٹیروں میں گھڑسوار کو تلوار بازی آتی تھی لیکن عیسیٰ کی چابک دستی کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ تھوڑی ہی دیر میں

عیسیٰ نے اس کے تلوار پکڑے ہاتھ پر ایسا وار کیا کہ اس کی دو انگلیاں کٹ گئیں اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ داؤد دوسرے لٹیروں کا سامنا کر رہا تھا۔ یکا یک ان لٹیروں میں سے ایک عیسیٰ کو پہچان کر چیخ پڑا، ''ارے باپ رے، کس سے پالا پڑا ہے! اے یون، یہ تو ملک الموت ہے... بھاگ، بھاگ!'' فوراً ہی وہ لٹیرے بغیر کچھ کہے بے تحاشا بھاگنے لگے۔

داؤد اور عیسیٰ اپنے اپنے گھوڑوں پر سے زمین پر اترے۔ اس قافلے میں ان لٹیروں کے ہاتھوں کسی کی جان نہیں گئی تھی، ہاں دو گھائل ضرور ہو گئے تھے۔ جو صحیح سلامت لیکن خوف کے مارے سہمے ہوئے تھے، وہ اب آگے بڑھ کر ان دو اجنبیوں کو گھیرے ان کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ داؤد اور عیسیٰ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ داؤد نے کہا، ''بزدل کہیں کے! ان کو اور سزا ملنی چاہیے تھی۔ تمھاری شکل دیکھتے ہی ڈر کے مارے سب بھاگ گئے۔''

سورن مئی ساکت کھڑی تھی۔ چِنتا داسی اٹھ کر آگے آئی اور بولی، ''آپ دونوں کو اوپر والے نے بھیجا ہے۔ میری دعا ضائع نہیں گئی۔ آپ فرشتے ہیں۔ خدا کی مہربانی سے آپ دونوں کو دین دنیا کی دولت خوب ملے۔''

کوروؤں کی سبھا میں دروپدی کے وستر ہرن کے وقت کرشن نے آ کر اس کی عزت بچائی تھی، شاید یہی سوچ کر چِنتا داسی نے یہ بات کہی تھی، حالانکہ اس بار کرشن کے روپ میں دو مسلمان آئے تھے۔ ان تعریفوں اور قصیدہ گوئی کو درکنار کر کے عیسیٰ نے پوچھا، ''آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟''

ولبھ رام اپنے زخم کی تکلیف کو برداشت کرتا ہوا ان دونوں کے پاس آیا اور کہا، ''حضور، ہم شری پور کے راج محل سے آ رہے ہیں۔ یہ خاتون راجہ چاند رائے کی بیٹی ہیں۔ کمسنی میں بیوہ ہو گئیں۔ ان کو ہم ان کی سسرال لے جا رہے تھے۔ ان کے سسر کا دیہانت ہو گیا ہے۔ بہت دھوم دھام سے ان کا شرادھ سنسکار ہو رہا ہے۔ وہاں شامل ہو کر دس دنوں کے بعد لوٹنا ہے۔ ایسی بارش نہ ہوئی ہوتی تو ڈکیتوں کا گروہ ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ پاتا۔''

چِنتا داسی سورن مئی کی بکھری ہوئی ساڑی کو سمیٹ کر اس کے چہرے پر گھونگھٹ کاڑھ رہی تھی، تبھی عیسیٰ کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، نہ ہی شکریہ ادا کیا تھا، لیکن

اس کی خاموش نگاہوں میں بہت سی باتیں تھیں، ان باتوں میں بہت جادو تھا، اور اس جادو میں بھی گھنے جنگل کا راز چھپا تھا۔

عیسیٰ نے ایک بار سوچا کہ اگر وہ خود کچھ کہے، کیا تب بھی یہ خاتون کوئی جواب نہیں دے گی؟ اس نے کہا، ”اب آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پالکی میں آ کر بیٹھیے۔“ اس بار بھی وہ کچھ نہ بولی۔ ولبھ رام نے بہت مشکل سے سیدھے ہو کر پوچھا، ”حضور، آپ لوگ کون ہیں؟ ایسے بہادر شخص کا تعارف حاصل ہو سکتا ہے؟“

داؤد نے کہا، ”ہم کوئی خاص آدمی نہیں ہیں، یوں ہی راہ چلتے گھڑسوار ہیں۔ اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔ مگر تم پیدل کیسے چلو گے؟ وہ لٹیرے اپنا گھوڑا چھوڑ گئے ہیں، تم کسی طرح اس پر سوار ہو جاؤ۔“

ولبھ رام نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”میری ایک گزارش ہے... ہماری رانی دیدی اونچے خاندان کی ہندو بیوہ ہیں۔ ہندو بیوہ کو اگر کوئی غیر مرد چھو لے تو اس کی جان چلی جاتی ہے۔ اگر آج کے واقعے کے متعلق کسی کو بھنک بھی مل گئی... اب میں آپ دونوں سے کیا کہوں...“

عیسیٰ نے کہا، ”میں سمجھ گیا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تم لوگ بے فکر رہو۔“

اب داؤد اور عیسیٰ نے بغیر وقت ضائع کیے اپنی راہ پکڑی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد عیسیٰ نے کہا، ”داؤد، میں نے تو سنا تھا، ہندو عورت کے بیوہ ہونے پر سسرال سے اس کے سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی سسرال کیوں جا رہی ہے؟“

داؤد نے کہا، ”کیا معلوم! ہندوؤں کے رسم و رواج کا ہمیں کچھ زیادہ پتا نہیں ہے۔“ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے کہا، ”دوست، تم نے اس عورت کا چہرہ دیکھا ہے۔ وہ چہرہ اگر دل میں بس گیا تو تمھارا سارا امن چین چھن جائے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اسے بھول جاؤ۔ ہمارے سامنے ڈھیروں کام پڑے ہیں۔“

گوڑ بنگال میں ہندو سلطنت کے زوال کے بعد لمبے عرصے سے پٹھان سلطان حکومت کرتے آئے تھے۔ اس کے بعد مغلوں نے اپنی حکومت قائم کرنی چاہی۔ پٹھان اور مغلوں کی لمبی جنگ چلی۔ ہمایوں بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کا اکبر نام کا کم عمر بیٹا دلّی کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں پورے ہندوستان میں مغل سلطنت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ بنگال میں مغلوں کے لیے حکومت

Scanned with CamScanner

قائم کرنا آسان نہیں ہوا۔ مغلوں کی فوج بہت طاقتور تھی لیکن جنگ پر جنگ ہار کر بھی پٹھانوں نے اپنی ہار پوری طرح نہیں قبولی۔ وہ اڑیسہ اور بنگال کی طرف بھاگ کر پہاڑی جنگلوں میں چھپ جاتے، پھر یکا یک مغل فوج پر چور حملہ بول دیتے۔ حالانکہ مغلوں نے قلعے بنوائے تھے لیکن وہ اس ندی نالوں کے دیش کے مزاج سے ناواقف تھے۔ یہاں کی ندیوں کا جغرافیہ بے حد پیچیدہ ہے۔ گرمی میں تو یہ ایسی سوکھی پڑی رہتیں کہ انھیں پیدل ہی پار کیا جاسکتا تھا۔ مگر برسات کے موسم میں یہی سوکھی ندیاں ایسی خوفناک شکل اختیار کر کے تباہی مچاتیں کہ مغل فوجوں کو بھاگنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ یہاں کے راجہ نواب دریائی فوج کے ذریعے دشمن کا مقابلہ کرتے جبکہ مغل گھڑسوار ان کا پیچھا کرنے میں ناکام ہو جاتے۔ ان کی لگاتار لوٹ مار، جنگ، دغابازی، بے وجہ بے رحم قتل عام سے پانی، پھل پھول سے ہری بھری اس زمین پر تشدد چھایا ہوا تھا۔ عام آدمی کی زندگی اور جائیداد کی کوئی حفاظت نہیں تھی۔ چاروں طرف دہشت کا ماحول تھا۔

مغلوں اور پٹھانوں میں اِدھر اُدھر جنگ تو ہوتی ہی رہتی تھی، اس کے علاوہ یہاں اور بھی کچھ ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ دور سمند پار کر کے فرنگی چاٹگام میں ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ بھی بنگال کے گاؤوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوے تھے۔ آراکان کا راجہ تھا تو بودھ، لیکن بنگال کے کچھ حصے پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے وہ اپنی فوج کے ساتھ اکثر گوڑ بنگال پر دھاوا بول دیتا تھا۔ یہ لوگ بودھ دھرم کے نام پر کلنک تھے، دشمنوں کے فوجیوں کو بلی چڑھا کر ان کا گوشت کھاتے تھے۔ برہمن کے سوا ان کے پاس کسی کے لیے رعایت نہیں تھی۔

اب شورش کا فائدہ اٹھا کر اس راج کے مختلف علاقوں کے کچھ زمیندار بھی اپنا سر اٹھانے لگے تھے۔ اپنی زمینداری اور اپنی رعایا کی جان و مال کی حفاظت کی خاطر ان لوگوں نے اپنا گڑھ بنالیا تھا اور اپنی فوج کی طاقت بڑھانے میں لگے ہوے تھے۔ مغل اور پٹھانوں کے مقابلے میں ان زمینداروں کی فوج میں زیادہ تر بنگالی تھے۔ ان میں بہت سے دریائی جنگ میں فرنگیوں سے زیادہ ہوشیار تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سمندری بیڑے بنا کر پرتگالیوں کے سمندری بیڑے سے بھی ٹکر لے لیتے۔ ان زمینداروں کا مشہور نام 'بارو بھوئیاں' تھا۔ بھوئیاں یا بھومیں ہر یعنی زمیندار۔ ان کی تعداد ہمیشہ بارہ رہی ہو، ایسا نہیں ہے؛ کبھی کم تو کبھی زیادہ۔ ان میں سے کوئی ہندو تھا تو کوئی مسلمان۔ پہلے یہ

Scanned with CamScanner

اپنے راجاؤں اور نوابوں کو محصول اور خراج پیش کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان حاکموں کی حکومت پر پکڑ ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے ان لوگوں نے محصول نہ دینے کا فیصلہ کیا اور آزاد ہو گئے۔ اپنی اس حاصل کی ہوئی آزادی کو بنائے رکھنے کے لیے ان کو لگاتار جنگ بھی کرنی پڑتی تھی، حالانکہ ان کے نزدیک آزادی کا مطلب صرف اپنے مفاد کو آگے رکھنا تھا۔ یہ اپنے کو راجہ کہتے تھے۔ بارو بھوئیاں لوگوں کی آپس میں بھی ایکتا نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی زمینداری پر قبضہ کرنے کے لیے نہ جانے کتنی بار ایک دوسرے سے جنگ کی تھی۔ جنگ میں ہار کر معاہدہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی شرطوں کو توڑنے میں بھی دیر نہیں لگتی تھی۔

بادشاہ اکبر کی حکومت کے دوران بنگال کے بھوئیں ہروں میں تین قابلِ ذکر تھے: یشور یا جیسور علاقے کا پرتاپ اُدھت، سونار گاؤں اور بھاٹی علاقے کا عیسیٰ خان، اور وِکرم پور کے باپ بیٹے چاندرائے اور کیدار رائے۔ پرتاپ ادھت کی زمینداری اور اس کی فوج بڑی اور طاقتور تو تھی لیکن اس کے بے حد ظالمانہ مزاج، غرور اور کڑوی زبان کی وجہ سے دوسرے بھوئیں ہر اس سے الگ رہنا پسند کرتے تھے۔ ادھر عیسیٰ خان کے بے حد معمولی آغاز سے تیزی سے دور دور تک اپنا قبضہ اور دبدبہ پھیلانے کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ چاندرائے کی راجدھانی وکرم پور ایک خوشحال نگر تھا۔ وہاں کی عمدہ ململ چین تک جاتی تھی۔ شری پور کے لوہار بڑی بڑی توپیں بنا سکتے تھے۔ ان توپوں سے چاندرائے نے کئی جنگوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔

اب چاندرائے بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی اکلوتی پیاری بیٹی سورن مئی کا اونچے کائستھ گھرانے میں مالکھا کے مشہور بسو خاندان میں بیاہ ہوا تھا۔ مگر چھ مہینے کے اندر اس کے شوہر کی سانپ کے کاٹنے سے موت ہو گئی۔ نو سال کی عمر میں بیوہ ہو کر سورن مئی اپنے میکے لوٹ آئی۔ اپنی معصوم بیٹی کی بیوگی دیکھ کر راجہ چاندرائے صدمے سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی حالت پوری طرح سے نہیں سدھری تھی۔ زیادہ تر بستر پر پڑا رہتا تھا۔

وہیں سورن مئی اپنی عمر کے شباب پر پہنچ رہی تھی۔ بڑی پاکیزگی اور پردہ داری میں وہ زنان خانے میں رہتی اور اپنے باپ کی خدمت کرتی تھی۔ ہندو بیواؤں کے رواج کے مطابق وہ دن بھر میں اجالا رہتے بس ایک ہی بار کھانا کھاتی تھی اور ہر رات کو فاقہ کرتی تھی۔ بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر جہاں

Scanned with CamScanner

باپ کا دل بھر آتا، وہیں اس کو سماجی اصولوں اور رواجوں کی پاسداری کرتے دیکھ کر اسے اطمینان ہوتا تھا۔ رات کو اس نے بھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔

اب حکومت کی باگ ڈور اس کے لائق بیٹے کیدار رائے کے ہاتھ میں تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے دراصل وہی راجہ کے عہدے پر تھا، مگر باپ کے زندہ ہونے کی وجہ سے رعایا اس کو کمار کہتی تھی۔ گٹھیلے قد کاٹھی کا خوبصورت کیدار رائے جنگی فن میں شہرت رکھتا تھا۔ لوگ عیسیٰ خان سے اس کی برابری کرتے تھے۔ عیسیٰ خان کیدار رائے کا ہم عمر تھا۔ کیدار رائے کی طرح اس کی شخصیت پرکشش اور قد کاٹھی گٹھیلی تھی لیکن تلوار بازی میں اس کی مہارت کہیں زیادہ تھی۔ یہاں کا کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار اسی عیسیٰ خان نے اکبر کے سیناپتی مان سنگھ کو تلوار بازی کے مقابلے میں مات دی تھی۔

اس زمانے کا یہ واقعہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ دونوں طرف سے ہونے والی جنگ کے بیچ عیسیٰ خان نے مان سنگھ کو مقابلے کے لیے للکارا۔ مغل سیناپتی مان سنگھ بھلا راضی کیوں نہ ہوتا! گھوڑے پر سوار دونوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مان سنگھ کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ وہاں موجود ناظرین ڈر کے مارے ہائے ہائے کر اٹھے۔ مقابلے میں ہارنے کا مطلب ہے فاتح کے ہاتھوں اپنی جان گنوانا۔ لیکن عیسیٰ خان نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی تلوار مان سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''مہاراج، اسے پکڑیئے۔ میں اپنے لیے دوسری لانے کو کہتا ہوں۔ مقابلہ پھر سے شروع ہوگا۔'' اس پیشکش کو سن کر مان سنگھ بے حد متاثر ہوا۔ اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر عیسیٰ خان کو گلے لگا لیا۔ دونوں فریقوں کے بیچ معاہدہ کرنے کی پیشکش رکھ کر وہ شہنشاہ اکبر سے اس بہادر نوجوان کو ملوانے لے گیا۔ بادشاہ اکبر نے بھی آگرے میں اس کی خوب خاطر داری کر کے اس کو بہت سے تحفے تحائف دیے۔

اس واقعے کو گزرے ہوئے کئی برس بیت گئے تھے۔ اب اس معاہدہ نامے کے چیتھڑے ہو چکے تھے۔ احسان اور انسانیت جیسی باتوں کو یاد رکھنا بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا۔ دوسری بار اکبر بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور باغی زمینداروں کو شکست دے کر اپنا غلام بنانے کے لیے صوبہ بنگال بھیجا۔ مان سنگھ اس بار بارہ بھوئیں ہیروں کو سبق سکھانے آیا تھا جن میں عیسیٰ خان بھی تھا۔

عیسیٰ خان اور کیدار رائے کے علاقے متصل تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان دنوں پڑوسی

راجاؤں میں جنگوں کا معمول ہونے کے باوجود ان دو پڑوسی راجاؤں میں کسی قسم کی دشمنی کا رشتہ نہیں تھا۔ آراکان راجہ کے مخالف کیدار رائے اور عیسیٰ نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر جنگ کی تھی۔ جنگ کے علاوہ بھی دونوں دوستوں میں بیچ بیچ میں میل ملاپ اور ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔

ان دنوں جھنڈ کے جھنڈ ہندو اپنا مذہب تبدیل کر رہے تھے۔ کچھ ظلم اور ڈر سے، کچھ مسلمان حاکموں کی مہربانی حاصل کرنے کے لیے، کچھ اپنے مذہب کے ٹھیکیداروں کے ظلم اور ان کی ذات پات اور چھوا چھوت سے تنگ آ کر مسلمان بن رہے تھے۔ گوڑ بنگال میں جس وقت پٹھانوں نے قبضہ کرنا شروع کیا اس وقت اس جنگ میں مٹھی بھر مسلمان تھے۔ بعد میں ان کی تعداد سو گنا بڑھ چکی تھی۔ جو ہندو اپنا مذہب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، وہ ڈرے سہمے اپنے دن گزار رہے تھے۔ ہندو راجہ آہستہ آہستہ اپنا اثر کھوتے جا رہے تھے اور ان کی رعایا کا دھرم بھی اب محفوظ نہیں تھا۔

مگر وکرم پور اور سونار پور گاؤں کا ماحول بالکل الگ تھا۔ دونوں حکمرانوں کے برتاؤ کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ دونوں کے علاقے کے راجاؤں کے الگ الگ مذہب پر ہونے کے باوجود ان دونوں میں محبت اور بھائی چارے کا رشتہ دیکھ کر رعایا میں بھی ایک دوسرے کے مذہب کے لیے نفرت نہیں تھی۔ یہاں مندر، مسجد، ٹول مدرسہ ایک ساتھ بغیر کسی جھمیلے کے چلتے تھے۔ اگر کوئی اپنا مذہب بدلنا چاہتا تو اس میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ حالانکہ مذہب کی تبدیلی ایک طرفہ تھی، ہندو سے مسلمان بننے کی، کیونکہ اگر کوئی مسلم چاہتا بھی تو ہندو نہیں بن سکتا تھا۔ ہندو سماج اسے اس کا حق تو دینے والا تھا نہیں۔ دھرم سے ذرا بھی چوک ہندو پروہتوں سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ فوراً اس چوک کرنے والے کو اپنے دھرم اور جات سے باہر کر دیتے۔ کچھ مٹھی بھر با اثر اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے ہندو سماج اب ٹوٹنے کے لگار پر تھا۔ سارے ملک کے سامنے سونار گاؤں اور وکرم پور مثال تھے، لیکن کب تک؟

سندیپ کے جزیرے پر اپنا اپنا قبضہ جمانے کے لیے نہ جانے کتنے مختلف فریقوں نے حملے کیے تھے۔ کبھی اس جزیرے پر کیدار رائے کا اثر و رسوخ رہا، کبھی پرتگالیوں کا، کبھی آراکان راجہ کا۔ آراکان کی فوج کے سامنے پرتگالی فوج نہیں ٹھہر پا رہی تھی۔ آخر کار پرتگالی سپہ سالار کاربالو کچھ جنگی سامان لے کر چاندرائے کی فوج میں شامل ہو گیا۔ عیسیٰ خان اور کیدار رائے دونوں آراکان راجہ کے حریف تھے۔ آراکان راجہ کی للچائی نگاہیں جزیرے کے بعد اب گوڑ بنگال کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

ادھر تریپورہ اور کوچ بہار کے راجہ بھی آراکان راجہ کے خلاف تھے۔ ان آراکان باشندوں کو بنگال میں 'مگ' کہا جاتا تھا۔ کہیں بنگال بھومی پر ان بے رحم مگوں کا راج نہ قائم ہو جائے، اس لیے عیسیٰ خان اور کیدار رائے نے یکجا ہو کر پرتگالی سپہ سالار کاربالو کی رہنمائی میں آراکان فوج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں ہی راجاؤں کی فوج کے لڑاکے بنگالی تھے۔ یہ زمینی اور دریائی جنگ میں ماہر تھے۔ جہاں یہ تلوار لاٹھی چلانے میں مہارت رکھتے تھے وہیں توپ اور کشتی چلانے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بنگالی فوج کی جنگی مہارت کے سامنے مگ فوج ٹک نہیں پائی اور پیچھے ہٹ گئی۔

عیسیٰ خان خوشی خوشی کیدار رائے کے ذاتی سمندری جہاز میں آ کر اس کے پانا بار جشن میں شامل ہو گیا۔ دوسرے جہازوں پر بھی جیت کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ اس جہاز میں مانجھیوں، ملاحوں، خانساماؤں اور دوسرے خدمتگاروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس جہاز میں دو خوبصورت سجی ہوئی آرام گاہیں اور ایک وسیع و عریض بیٹھک تھی۔ بیٹھک کے فرش پر مخملی قالین بچھا تھا جس پر کئی تکیے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں طرف کے دریچے سے ندی کے دونوں کناروں کے منظر دکھائی دے رہے تھے۔

ان کی فتح کی کہانی پھیلتے ہی دور دور سے لوگ ان دو بہادر بنگالی راجاؤں کے نام کی جے جے کار لگانے چلے آئے تھے۔ سپہ سالار کاربالو بغیر وقت گنوائے شراب سے اپنی پیاس بجھانے بیٹھ گیا۔ عیسیٰ خان پکا مسلمان تھا، وہ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ کیدار رائے بھی تیوہار وغیرہ کے موقع پر تھوڑی بہت پی لیتا تھا لیکن اس کو شراب کی لت نہیں تھی۔ اس وقت دونوں چاندی کے گلاس میں بادام پستے سے بنی ٹھنڈائی پی رہے تھے۔ دونوں راجہ مان سنگھ کا ذکر کر رہے تھے۔ اس بار مان سنگھ کس مقصد سے بنگال آیا ہے، یہ ان دونوں کو پتا تھا۔ اس بار اس کا لشکر تو بڑا تھا ہی، ساتھ ہی جنگی بیڑے بھی اس کے ہمراہ تھے، یعنی مغل فوج اس بار دریائی جنگ کے لیے تیار تھی۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس بار مغل سپہ سالار اپنا مقصد پورا کیے بغیر لوٹنے والا نہیں تھا۔

سیدھے سیدھے جنگ کے میدان میں مان سنگھ کو شکست دینا مشکل کام ہے، اس بات کا علم دونوں کو تھا۔ اس بیچ بارہ بھوئیں ہروں کے کچھ راجاؤں نے جنگ کیے بغیر ہی اپنی شکست مان لی۔ راجہ پرتاپ ادھت بھی اپنی عزت کے بدلے مغلوں سے دوستی کرنے میں ہی عافیت سمجھ رہا تھا۔ وکرم پور اور سونار گاؤں ہی اب مان سنگھ کا سر درد رہ گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

عیسیٰ خان اور کیدار رائے، دونوں برسوں سے آزادی کا ذائقہ لے رہے تھے؛ نہ کسی کو محصول دیا تھا نہ کسی راجہ یا بادشاہ کی اجازت سے حکومت کی تھی۔ ان دونوں دوستوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مان سنگھ کو شکست دینے کی قوت ان میں نہیں ہے، لیکن جنگ چھڑ جانے کے کچھ دن بعد ہی پیچھے ہٹنے کا ناٹک کرنا چاہیے۔ ایسا لگے کہ مغلوں سے ڈر کر بنگال کی فوج پیچھے ہٹ گئی ہے۔ پھر مغل فوج ضرور ان کا پیچھا کرے گی۔ اس وقت مغلوں کو گھنے جنگلوں اور گھاٹی کی طرف لے جانا چاہیے۔ کیدار اور عیسیٰ اپنی اپنی فوج لے کر دو طرف کے دو جزیروں پر چھپے تاک لگائے بیٹھے رہیں گے۔ کھاڑی کے آس پاس بہتے ندی نالوں تک آکر جب مغل فوج اپنے راستے سے بھٹک جائے گی اس وقت یہ دونوں بھوئیں ہر دو طرف سے ہلا بول کر مغل فوج کو نیست و نابود کر دیں گے۔ کچھ ہی دنوں بعد برسات کا موسم بھی شروع ہو جائے گا۔

ادھر پہلی دفعہ میں زوروں کی بارش ہوتی ہے جس کے نتیجے میں حالات بے قابو ہو جاتے ہیں اور خطرناک حد تک سیلاب آجاتا ہے۔ بنگالی ان حالات کا آسانی سے مقابلہ کر لیتے ہیں لیکن شمالی ہند کے رہنے والے مغل فوجیوں کے لیے ان حالات کا سامنا کرنا قطعی ممکن نہیں ہے۔ کھاڑی اور جنگل کے علاقوں میں باگھوں اور مگرمچھوں کا راج ہوتا ہے۔ ان حالات میں مغل فوج کا ٹک پانا مشکل ہے۔ وہ جنگ کرنے کے بجائے محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں رہیں گے۔ صرف اسی ہوشیاری سے مغل فوج کو ان کے سپہ سالاروں کے ساتھ بنگال سے کھدیڑا جا سکتا ہے۔ کم سے کم کچھ دنوں کے لیے تو ان سے راحت ملے گی۔

کچھ دیر تک اسی موضوع پر تبصرہ ہوتا رہا۔ بیچ بیچ میں دوسرے موضوع بھی چھڑ جاتے۔ عیسیٰ خان کو بچپن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر جنگی مہارت میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کیدار رائے کو سنسکرت، عربی، فارسی کی تعلیم ملی تھی۔ عیسیٰ خان کو اس سے رامائن اور مہابھارت کے قصے سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ خاص کر شری رام چندر کے بھگت ہنومان کے قصے وہ بار بار سننا چاہتا تھا۔ آج یکایک اس نے کیدار رائے سے پوچھا، ''راجہ رام چندر نے بانر راجہ بالی کو جس طرح چھپ کر قتل کیا تھا، آپ اسے غلط کیوں مانتے ہیں؟ جنگ کے وقت تو دشمن کو کسی طرح بھی ختم کرنا چاہیے۔ ہم بھی تو پیچھے سے وار کرتے ہیں، اور آپ بھی تو کرتے ہیں۔''

کیدار رائے نے کہا، ''اس زمانے میں جنگ کے الگ اصول ہوتے تھے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی شرطیں طے کر لی جاتی تھیں۔ کبھی آمنے سامنے جنگ کریں گے، شام کے بعد کوئی جنگ نہیں کرے گا، عورتیں اور بچے اس سے بری ہیں۔ ہاں، کہیں کہیں شرطیں توڑی بھی گئی ہیں۔''

عیسیٰ خان نے پھر سوال کیا، ''بالی کے قتل کے بعد تو اس کی بیوی بیوہ ہو گئی۔ پھر سگریو نے اس سے شادی کیسے کی؟ مہادھارمک ہنومان نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس زمانے میں کیا ہندو بیواؤں کی شادی ہوتی تھی؟''

کیدار نے کہا، ''وہ بانر تھے۔ کیا پتا ہندو تھے بھی یا نہیں۔''

عیسیٰ نے کہا، ''کیا وہ سچ مچ بندر تھے؟ پھر انسانوں کی زبان میں کیسے بول لیتے تھے؟ ان میں کچھ تو کافی عقلمند بھی تھے۔ کیا بندر کبھی انسانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ہتھیار پکڑ کر جنگ کر سکتا ہے؟''

کیدار نے کہا، ''پہلے میرے من میں بھی یہ سوال اٹھا تھا۔ پھر میں نے اپنے پنڈت جی سے پوچھا۔ انھوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ وہ پیڑوں پر اچھلنے کودنے والے بندر نہیں تھے۔ ان کے اپنے گھر بار ہوا کرتے تھے۔ وہ اناریہ تھے، جنگلوں میں رہتے تھے۔ یہ اناریہ بے حد کالے ہوا کرتے تھے، اس لیے گورے آریہ ان کو بدصورت کہتے تھے، حالانکہ اناریہ ہونے پر بھی عقل اور سمجھداری کے معاملے میں وہ کچھ کم نہیں تھے۔''

''پھر رائے مہودے، میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ برا نہ مانیں۔ آپ لوگ بھی تو آریہ ہیں، ہیں نا؟''

''بالکل! آپ بھی ہیں۔ ہمارے دھرم الگ ہو سکتے ہیں لیکن ہندو مسلمان سبھی آریائی نسل کے ہیں۔ عرب دیش سے آپ لوگوں کا دھرم آیا ہے۔ عرب کے لوگ آریہ ہی ہیں۔''

''آپ لوگ بھارت کے ہندو آریہ ہیں۔ میرے خیال سے آپ لوگوں کے مقابلے میں اس زمانے کے اناریہ کہیں زیادہ ترقی یافتہ سوچ رکھتے تھے۔ ان میں بیواؤں کی شادی کا رواج تھا۔ ہم مسلمانوں میں بھی بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ خود ہمارے پیغمبر نے ایک بیوہ سے نکاح کیا تھا۔ آپ لوگ بیواؤں کو کیوں صحیح ڈھنگ سے جینے نہیں دیتے؟ ساری زندگی ان کو

Scanned with CamScanner

ظلم سہنا پڑتا ہے۔ آپ کے دھرم کا یہ کیسا انصاف ہے؟''

''کس نے کہا ہماری بیواؤں کو ساری زندگی ظلم سہنا پڑتا ہے؟ وہ پاکیزہ زندگی گزارتی ہیں، دن رات عبادت میں ڈوبی رہتی ہیں۔ میکے میں وہ بچوں اور بوڑھوں کی خدمت کی ذمے داری سنبھالتی ہیں۔ اصولوں پر کاربند رہ کر وہ اگلے جنم میں سکھی ہوتی ہیں۔''

''راجہ، ہندو بیوہ ایک غلام کی زندگی جیتی ہے۔ باہر کی کھلی ہوا روشنی اسے کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ کسی غیر مرد کو اپنا چہرہ بھی نہیں دکھا سکتی، اس سے بات کرنا تو دور کی بات ہے۔ زندگی کی ساری خوشیوں سے وہ محروم رہتی ہے۔ اسے دو وقت کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا، رنگین لباس یا زیور پہننا بھی منع ہے۔ مجبوراً اس کو دوسروں کی گرہستی میں پس پس کر مرنا پڑتا ہے۔ آپ اسے اصول کہتے ہیں؟ اس کا نام پاکیزگی ہے؟ کیوں؟ ہندو مرد تو اپنی بیوی کے مرنے کے بعد ان اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔''

کیدار رائے ذرا گرم لہجے میں بولا، ''میں آپ سے اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے مذہبی سنسکاروں کو لے کر آپ دماغ نہ ہی کھپائیں تو بہتر ہے۔ لیکن ہاں، ہندو بیواؤں کے بارے میں آپ کو اتنی معلومات ملی کیسے؟''

عیسیٰ نے کہا، ''کیوں نہیں؟ میری رگوں میں بھی تو ہندو کا ہی خون ہے۔''

''کیا؟ کیا کہا آپ نے؟''

''آپ کو میرے والد کا نام معلوم ہے؟''

''نہیں... اوہ، یاد آیا، آپ شاید قاسم خان کے بیٹے ہیں۔''

''نہیں، قاسم خان میرے چچا ہیں۔ ان کی میں اپنے ابا جیسی ہی عزت کرتا ہوں، لیکن میرے ابا کا نام تھا کالی داس گزدانی۔ ہمارے آباواجداد اودھیا کے راجپوت تھے۔ میرے ابا ایک خوبصورت پنڈت تھے۔ میں نے بچپن میں ہی ان کو کھو دیا تھا۔ ان کی بات مجھے کچھ زیادہ یاد بھی نہیں ہے۔ ہندو پنڈت ہو کر انھوں نے اسلام کیوں قبول کیا، اس کے دو قصے ہیں۔ ایک، کسی پٹھان سلطان کی بیٹی نے ان کی خوبصورتی پر نثار ہو کر ان سے نکاح کرنا چاہا لیکن میرے ابا اس بات پر راضی نہیں تھے۔ تب ان کو زبردستی اٹھا کر گائے کا گوشت کھلا دیا گیا۔ اس پر ان کو مجبوراً اسلام دھرم اپنا کر اس لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ دوسرا، کالی داس پنڈت ایک بار مسلمان مولویوں کے ساتھ ہونے والی

مناظرہ بازی میں ہار گئے اور دین اسلام کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمان بن گئے۔ ہمارے خاندان میں اس دوسری کہانی کو ہی صحیح مانا جاتا ہے۔ خیر، انھوں نے کسی سلطان کی بیٹی سے نکاح کیا اور وہ سلیمان خان بن گئے۔ اس سلطان کے زمانے میں ان کی بہت ترقی ہوئی۔ بعد میں وہ پٹھانوں کی طرف سے مغلوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ میں اور میرا بھائی اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ آگے سننا چاہتے ہیں؟''

''ضرور! مجھے تو ان باتوں کی جانکاری ہی نہیں تھی۔''

''اس جنگ میں سبھی اپنی اپنی جان بچانے میں لگے تھے۔ اس وقت کسی نے ہم دو بھائیوں کو یتیم ہندو بچے سمجھ کر غلام بنا کر بیچ دیا۔ میں فارس بھیج دیا گیا۔ وہاں کچھ برس ہم نے امیر لوگوں کے گھر پر نوکروں کا کام کیا۔ پھر یہاں کے حالات پرسکون ہونے کے بعد میرے ہمدرد چچا نے آدمی بھیج کر ہمیں کھوج نکالا اور واپس لے آئے۔ میرا بھائی اسمٰعیل زیادہ دن نہیں بچا۔ خوش قسمتی سے مجھے تریپورہ کے راجہ امر مانکیہ کی فوج میں نوکری مل گئی۔ میں نے اس بار تریپورہ کی طرف سے سپہ سالار شہباز خان کو شکست دی۔ مہاراج اور امر مانکیہ کی رانی نے خوش ہو کر مجھے سرگائل پرگنہ بطور تحفہ دے دیا۔ میں ان کو ماں کہتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بیٹے جیسا پیار کرتی تھیں۔ ان سے ہی مجھے مسند علی کا خطاب ملا۔ اور پھر میں نے اپنی فوج تیار کی۔ شہباز خان اپنی بے عزتی نہیں بھولا تھا، بار بار میرا پیچھا کرتا رہا، اس لیے میں نے سرگائل چھوڑ کر کشور گنج کے جنگل باڑی میں اپنی نئی راجدھانی قائم کی۔ آپ نے وہ راجدھانی نہیں دیکھی ہے۔''

کیدار رائے نے تعجب آمیز لہجے میں کہا، ''یہ تو روپ کتھا ہے! ایک معمولی غلام سے آپ آج اس پورے کھاڑی علاقے کے راجہ ہو گئے ہیں۔ مغل بھی آپ کو سمجھ کر چلتے ہیں۔ آپ نے وراثت میں نہیں بلکہ اپنی طاقت، عقلمندی اور ہوشیاری سے سب کچھ حاصل کیا ہے۔''

عیسیٰ خان نے کہا، ''بس ایک پیڑھی ہوئے ہم نے اپنا مذہب بدلا ہے۔ میرے چچا بھی پہلے ہندو ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی آج بھی ہندوؤں کے رسم و رواج مانتی ہیں۔ ان کو قرآن پڑھنا بھی آتا ہے اور ہندوؤں کے برت اُپواس کا بھی پالن کرتی ہیں۔ میں نے ان سے ہی ہندو بیواؤں کی دردناک زندگی کے بارے میں سنا ہے۔ ایکادشی کے دن ان کو ایک بوند پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔''

Scanned with CamScanner

کیدار رائے بولا، ''رمضان کے مہینے میں آپ لوگ بھی تو دن بھر کچھ کھاتے پیتے نہیں۔''

اب عیسیٰ خان نے سامنے آکر کیدار رائے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہا، ''رائے، رائے! کیدار راج! میری آپ سے ایک گزارش ہے۔''

کیدار رائے بولا، ''یہ کیا، آپ اس طرح کیوں کہہ رہے ہیں؟ اٹھیے، بھلا مجھ سے آپ کی کیا گزارش ہو سکتی ہے؟''

عیسیٰ خان نے اسی طرح نیچے بیٹھے بیٹھے کہا، ''ہم لوگ دونوں ہی مغلوں کے خلاف یکجا ہو کر جنگ کرنے لیے معاہدے میں ہیں۔ اگر ہم دونوں کے خاندانوں کے بیچ بھی اٹوٹ رشتہ قائم ہو جائے تو ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔ ایسا رشتہ صرف بیاہ کے بندھن سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر کیدار رائے ہکا بکا رہ گیا۔ اس کو گہرا صدمہ پہنچا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کہا، ''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں خان صاحب! آپ مجھ سے مانگتے تو میں اپنی جان بھی آپ کو دے دیتا، لیکن شادی۔۔۔ ہم وکرم پور کے کائستھ سبھا کے سب سے بڑے عہدیدار ہیں۔ ہمارے خاندان میں آج تک ہندو شاستر کے خلاف شادی نہیں کی گئی۔ اگر کوئی چھوٹی ذات کا راجہ بن جائے تو ہم اسے اپنے گھر کی بیٹی نہیں دیتے، مسلمان تو دور کی بات ہے۔''

عیسیٰ خان نے کہا، ''راجستھان کے خاندانی راجپوت راجہ تو مغلوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے قائم کرتے ہیں۔''

کیدار رائے بولا، ''مہارانا پرتاپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کھو دی لیکن اپنی ذات دھرم کو نہیں گنوایا۔ دوسرے راجپوت راجاؤں نے مغلوں سے جنگ میں بار بار مات کھا کر ان کی غلامی کو قبول کر لیا۔ پھر مغلوں کی مہربانی حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر کی بیٹیوں کو ان کے حرم میں بھیجنے لگے۔ اس مان سنگھ کو ہی کو دیکھ لیجیے، مغلوں کی جوتیاں چاٹ کر سپہ سالار بن بیٹھا۔ میں چھوٹا زمیندار سہی، لیکن کسی بھی طرح لالچ میں مبتلا ہو کر اپنا دھرم نہیں گنوا سکتا، بلکہ اپنی جان دے دوں گا۔ پھر میری بہن بیوہ ہے۔ ہندو بیوہ کی شادی کے بارے میں سوچنا گناہ ہے۔''

عیسیٰ خان نے ہاتھ جوڑ کر کہا، ''مہاراج، آپ اپنی بہن کو آزادی دیجیے۔ ہر عورت مرد کا سکھ

Scanned with CamScanner

چاہتی ہے۔ اولاد کے جنم دینے میں ہی اسے خوشی ملتی ہے۔ آپ کی بہن ان سب خوشیوں سے محروم رہی ہیں، اس لیے اگر آپ چاہیں تو۔۔۔"

اب کیدار رائے گرج اٹھا، "عیسیٰ خان، دوبارہ آپ کی زبان سے اگر اس بارے میں ایک بھی لفظ نکلا تو میں پھر کبھی آپ کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ میری بہن کا کردار بے داغ ہے۔ آپ کی ایسی بات سن کر وہ اپنی جان دے دے گی۔ میں آپ کو ہوشیار کر دیتا ہوں۔ آپ نے پھر کبھی اگر۔۔۔"

عیسیٰ خان کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی نرم روی سے اپنی گزارش پیش کی تھی جس کے جواب میں اس ہندو راجہ نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی۔ عیسیٰ خان کے اندر اگر غصے کا شعلہ بھڑک اٹھا تو اس کے انجام سے شاید کیدار رائے واقف نہیں ہے۔ وہ اسی پل اپنی میان سے تلوار نکال کر اس راجہ کو ختم کر سکتا ہے۔

بڑی مشکلوں سے اپنے غصے پر قابو پا کر عیسیٰ خان کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت ندی کے کنارے سنسان تھے۔ اُدھر گھنے جنگل تھے۔ ایک مچھیرا اکیلے پانی میں جال پھینک کر مچھلی پکڑ رہا تھا۔ کیا اسے پتا نہیں کہ کسی بھی وقت وہ باگھ کا شکار بن سکتا ہے؟ اپنا چہرہ گھما کر عیسیٰ خان نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا، "مہاراج، آپ اس جہاز کو یہاں لگانے کے لیے کہیے۔ میں یہیں پر اترنا چاہتا ہوں۔ یہ جنگل قلعہ بنانے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں ذرا گھوم کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کیدار رائے سر جھکائے رہا۔ وہ بھی اپنے غصے کو قابو میں کر رہا تھا۔

عیسیٰ خان کا قریبی دوست داؤد خان گڑھ جر۔پہ شیر پور میں رہتا تھا۔ وہ اس قلعے کا راجہ تھا۔ عیسیٰ خان کبھی کبھار جنگل محل چلا آتا تھا۔ وہاں دوست کے ساتھ گپ شپ کر کے دو چار دن بعد لوٹ جاتا۔ اس بار بہت دنوں سے عیسیٰ خان کا کوئی پتا نہیں تھا۔

ادھر مان سنگھ خود راج محل میں رہ کر اِدھر اُدھر بکھرے پٹھانوں کو سبق سکھانے میں مصروف تھا۔ پٹھان ہمیشہ سے مغلوں کے دشمن رہے ہیں۔ گوڑ بنگال پر اپنی حکومت کھو کر بھی وہ چپ نہیں بیٹھے۔ کچھ دنوں تک اِدھر اُدھر چھپے رہ کر وہ مغلوں پر دھاوا بول دیتے۔ اس بار مان سنگھ نے پٹھانوں کو جڑ سے مٹانے کی ٹھانی تھی۔ خود بیمار تھا اس لیے اس نے اپنے دونوں بیٹوں اور ماہر سپہ سالاروں کو

جنگ کے میدان میں بھیجا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پٹھانوں کا خاتمہ کر کے وہ پرتاپ ادھت اور دوسرے بارو بھوئیاں کو سبق سکھائے گا۔ فی الحال ادھر مغلوں کے حملے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

دوست کے بلاوے پر بھی عیسیٰ خان چپ سادھے بیٹھا رہتا، رنی واس سے نکلتا ہی نہیں۔ ایک شام اپنے دوست کے برتاؤ سے حیران داؤد خان نے باغیچے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا کہ جھیل کے کنارے کسی گہرے خیال میں ڈوبا اکیلا بیٹھا ہے۔ داؤد اس کے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد عیسیٰ خان کی طرف منھ گھما کر اس نے کہا، ''مجھے پتا ہے، تم مجھ سے کٹ کر چلنا چاہتے ہو۔ جب بھی ملتا ہوں، بس نصیحت ہی کرتا ہوں۔ مگر اب کچھ نہیں کہوں گا۔''

عیسیٰ خان نے آہستہ سے کہا، ''میں لگاتار اپنے دل سے جوجھ رہا ہوں لیکن کسی طرح اپنے کو سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔ اندر ہی اندر جھلس رہا ہوں۔''

داؤد نے پوچھا، ''تم کس آگ میں جھلس رہے ہو؟ کیا وہ حسن کی پیاس ہے یا محبت کی؟ یا پھر ٹھکرائے جانے کی بے عزتی؟''

عیسیٰ خان بولا، ''صرف حسن کی پیاس کیوں ہوگی؟ کیا عورت کا حسن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟ اور محبت کسے کہتے ہیں، مجھے پتا نہیں۔ میرا سروکار صرف جنگ کرنے اور جسم کو تسکین دینے سے رہا ہے۔ لیکن اس عورت نے صرف ایک بار اپنی نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کیا تھا، اس کا مطلب میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔ بس وہ آنکھیں مجھے بار بار یاد آتی ہیں اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔''

داؤد نے کہا، ''چلو، ہم کہیں شکار پر جاتے ہیں یا پھر کوئی شہر لوٹ لیتے ہیں۔ تم کو اپنا دل اور دماغ دوسری طرف موڑنا چاہیے، ورنہ مصیبت آنے میں دیر نہیں ہے۔''

''مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہی۔ میں بس ایک دفعہ ان نگاہوں کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں، بس ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔''

''دوست، میں نے پہلے تم سے جو کہا ہے، اب بھی کہے بنا نہیں رہا جاتا۔ اس عورت کو تم اپنے ذہن سے نکال دو۔ کیدار رائے کی اور تمھاری فوج کے یکجا ہوئے بغیر ہمارے مغلوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ہندو مسلم فوجی کندھے سے کندھا ملا کر جنگ کریں گے، یہ کیا کم بڑی بات ہے؟

ایک عورت کی خاطر یہ سب کچھ برباد ہو جائے؟ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے چھوٹی موٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں اس سے بھی حسین عورتیں تمھیں پیش کر سکتا ہوں۔''

''داؤد، تم نے جو کہا، کیا میں اس کی اہمیت نہیں سمجھتا؟ لیکن مجھے بار بار یہی لگ رہا ہے کہ اس سے ایک بار پھر ملے بنا میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں؟ لگتا ہے اس کے سامنے سب کچھ حقیر ہے۔ میری سلطنت، جنگ میں حاصل ہونے والی جیت ہار، سب کچھ بے معنی ہے۔ مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔''

''یا اللہ، یہ محبت نہیں، جنون ہے۔ چاہو تو میں اس کا علاج کروا سکتا ہوں۔ کان کھول کر سنو، کیدار رائے ہرگز اپنی بیوہ بہن کی شادی تم سے کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔ اس وقت تمام ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ کسی زمانے میں یہ ملک ان کا ہی ہوا کرتا تھا لیکن آج وہ سب مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں، پھر بھی اپنا وقار اور اپنے اصول نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ہندو بیوہ کے دماغ میں اس قدر اندھا عقیدہ بھر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی غیر مذہب والا اسے بیوگی کی ذہنی اذیتوں سے آزادی بھی دلانا چاہے تو وہ اس بات کو نہیں قبول کرے گی بلکہ خودکشی کرنا بہتر سمجھے گی۔''

''تم کو یاد ہے، اس دن وہ لٹیرے اس عورت کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ اگر ہم صحیح وقت پر نہ پہنچ گئے ہوتے تو وہ اسے اٹھا کر لے جاتے۔ وہ آدمی ہندو تھا یا مسلمان؟ اس وجہ سے تو بعد میں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''ارے وہ خبر کیا باہر پھیلی ہے؟ بس کوئی جان نہ پائے تو سارے قصور معاف۔ یہ ہندو چاہے بیواؤں کی پاکیزگی پر کتنا ہی فخر کیوں نہ کریں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کتنی ہی بیوائیں اپنے رشتے داروں کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ حمل بھی ٹھہر جاتا ہے۔ یہ خبریں اندر ہی دبا دی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ان بیواؤں کو مار بھی ڈالا جاتا ہے۔''

عیسیٰ خان نے کھڑے ہو کر جھیل کے پانی سے اپنا چہرہ صاف کیا، پھر ٹکٹکی باندھے اس ٹھہرے پانی میں اپنی پرچھائیں دیکھنے لگا۔ پھر داؤد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا، ''دوست، مجھے کچھ پرکھنا ہے۔ تم چلو گے میرے ساتھ؟''

اس بیچ عیسیٰ خان نے اپنے مخبروں سے سورن مئی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کروالیا تھا۔

Scanned with CamScanner

ویسے تو سورن مئی اپنے میکے میں رہتی ہے لیکن سسرال میں بھی اس کا آنا جانا ہے۔ حال ہی میں اس کی ساس گزر گئی تھی۔ سورن مئی سے ان کی ساس کا رشتہ بڑا اچھا تھا، بالکل ماں بیٹی کی طرح۔ اس نے ہی سورن مئی کو اس کے سسر کے شرادھ میں بلوا بھیجا تھا۔ وہاں دس دن رہ کر سورن مئی کو اپنے میکے لوٹنا تھا لیکن اس بیچ اس کی ماں جیسی ساس بیمار پڑ گئی تو سورن مئی اس کی خدمت کے لیے رک گئی۔ اس کی موت کے بعد اس کا شرادھ سنسکار کر کے آج دو مہینے کے بعد سورن مئی اپنے میکے لوٹ رہی تھی۔

آج کوئی آندھی پانی نہیں تھا، ساتھ میں بارہ پہریدار تھے۔ ولبھ رام کا گھاؤ بھی گہرا نہیں تھا۔ علاج سے پوری طرح ٹھیک ہو کر اب وہ بھی ساتھ چل رہا تھا۔ آج کسی مصیبت کا اندیشہ نہیں تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے مندر کے نزدیک آنے پر چنتا داسی نے پالکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکتے ہوئے کہا، ''اجی! رانی دیدی کہہ رہی ہیں، یہاں کچھ دیر رکو، ذرا آرام کر لو۔''

ولبھ رام نے دوڑتے ہوئے آ کر کہا، ''چنتے، رانی دیدی سے کہو کہ یہ جگہ منحوس ہے۔ یہاں ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی تھی۔ اچھا ہو کہ ہم لوگ یہاں سے جلدی جلدی چل کر کالی گنگا ندی کے کنارے ستالیں۔''

چنتا نے اپنے ہونٹ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا، ''یہ جگہ منحوس ہے؟ یہیں پر ہم پر آئی کتنی بڑی مصیبت ٹلی تھی، یاد ہے یا نہیں؟ یہی سب سے مبارک جگہ ہے۔''

مجبوراً ان کو وہیں پالکی اتار کر آرام کرنا پڑا۔ اس کے کچھ ہی دیر کے اندر پاس والے جنگل سے قریب پچاس فوجوں کی ایک ٹولی ان کی طرف بڑھنے لگی جس میں دس بندوق دھاری تھے۔ فوج کی وہ ٹولی اس قافلے سے دوری بنا کر ایک قطار کی شکل میں کھڑی رہی، صرف ان میں سے ایک گھڑسوار دھول اڑاتے ہوئے سامنے آیا۔ وہ گھڑسوار جنگی فوجی کے بھیس میں تھا۔ سر پر پنکھ لگا لوہے کا ٹوپ تھا۔ قریب آتے ہی اس گھڑسوار کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا۔ وہ تھا عیسیٰ خان۔ ولبھ رام اس گھڑسوار کو پہچان کر ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

عیسیٰ خان نے کہا، ''میں تم لوگوں کا کوئی برا نہیں کروں گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں صرف اس پالکی میں بیٹھی راجکماری سے دو چار سوال پوچھوں گا۔''

ولبھ رام نے کانپتے لہجے میں کہا، ''حضور، رانی بی بی کسی غیر مرد کے ساتھ بات نہیں کرتی۔''

Scanned with CamScanner

عیسیٰ خان بولا، ''وہ میں سمجھ لوں گا، تم سب اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا، اتنا یاد رکھنا۔ اور اگر چپ چاپ رہو گے تو آرام سے گھر واپس جا سکو گے۔''

پالکی کے پاس آکر اس نے کہا، ''اندر جو ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ میں سونارگاؤں کا منصب دار عیسیٰ خان ہوں، شری پور کی راجکماری سے دو چار باتیں کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔''

پردہ سرکا کر چِتنا نے کہا، ''حضور کو میرا پرنام سویکار ہو۔ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔ اس بار آپ نے ہماری جان اور عزت بچائی تھی۔ اس کے لیے ہم سبھی آپ کے شکر گذار ہیں۔ گستاخی معاف ہو، میں ادنیٰ سی ایک کنیز ہوں، پھر بھی آپ سے میرا اتنا کہنا ہے کہ ہماری رانی دیدی کسی غیر مرد سے بات نہیں کرتیں۔''

عیسیٰ خان نے کہا، ''ٹھیک ہے، مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف کچھ سوال پوچھوں گا اور تم ان سے پوچھ کر جواب دے دینا۔ راجکماری جو بیوہ کی زندگی جی رہی ہیں، کیا وہ ایسی زندگی سے آزادی چاہتی ہیں؟''

تھوڑی دیر بعد چِتنا بولی۔ ''حضور، راجکماری نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔''

عیسیٰ خان نے کہا، ''ٹھیک ہے۔ اب میرا دوسرا سوال ہے: اگر کوئی شخص ان کو عزت کے ساتھ اپنی بیوی بنانا چاہے، کیا تب بھی وہ راضی نہیں ہوں گی؟ دوسرے مذہب میں اس طرح کی کوئی مناہی نہیں ہے۔ کیا وہ صرف ہندو دھرم کا سنسکار بنائے رکھنے کے لیے ساری زندگی دکھ جھیلتی رہیں گی؟''

چِتنا نے کہا، ''حضور، راجکماری آپ کے اس سوال کا بھی جواب نہیں دیں گی۔''

عیسیٰ خان نے کہا، ''اچھی بات ہے۔ میرا تیسرا اور آخری سوال: اگر کوئی ان کی محبت میں دیوانہ ہو کر انھیں زبردستی اٹھا لے جائے تو وہ کیا کریں گی؟''

کچھ دیر بعد چِتنا نے کہا، ''حضور، راجکماری اس بار بھی آپ کے سوال کا جواب نہیں دیں گی۔ اگر اجازت ہو تو کیا میں خود آپ سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟ جہاں تک مجھے پتا ہے، کیدار رائے آپ کے دوست ہیں۔ کیا آپ اپنے دوست کی بہن کے ساتھ اس طرح پیش آئیں گے؟''

اب عیسیٰ خان نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا، ''ہاں، یہ صحیح ہے کہ کیدار رائے میرے دوست

ہیں۔تم نے مہابھارت کی وہ کہانی سنی ہوگی۔ شری کرشن کے ساتھ بھی تو ارجن سے دوستی تھی، پھر بھی ارجن شری کرشن کی بہن سبھدرا کو اٹھالے گئے تھے۔اگر میں بھی۔۔۔''

چنتا نے کہا،''حضور، ہم لوگ بے بس عورتیں ہیں۔ اگر ہمارے پہریداروں اور محافظوں نے آپ کو روکنا چاہا تو ہم ان سے کیا کہیں گے؟'' چنتا کے لہجے میں نہ ڈر تھا، نہ ہی شک۔

عیسیٰ خان نے کہا،''پھر تو میں تمھاری مذہبی کتابوں کے مطابق شری پور کی راجکماری کو اٹھالے جانا چاہتا ہوں۔ اس بات پر کہیں وہ خودکشی تو نہیں کرلیں گی؟''

اس بار بھی چنتا چپ رہی۔

عیسیٰ خان نے کہا،''سنو، تمھارے پہریداروں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہمیں روک سکیں۔ نہ ان میں اتنی ہمت ہے۔ پھر میں خود تم لوگوں کو پالکی سے نہیں نکالنا چاہتا۔ اگر راجکماری خود باہر آجائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

ان کے اتنا کہتے ہی چنتا کا ہاتھ پکڑے راجکماری سورن مئی باہر نکل کر کھڑی ہوگئی۔ چہرے پر پڑا گھونگھٹ ہٹا کر اس نے عیسیٰ خان کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ پراسرار نگاہیں!

عیسیٰ خان نے کہا،''چنتا، میں ایک مسلمان ہوں، ان کے لیے اچھوت۔ میں خود پہلے ان کو نہیں چھونا چاہتا۔ تم ان کو میرے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھادو۔ دیکھو، کہیں ان کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

چنتا نے بڑی آسانی سے سورن مئی کو گھوڑے پر سوار کردیا۔ عیسیٰ خان نے ایڑ لگا کر گھوڑا سرپٹ دوڑایا۔ تھوڑی دیر بعد سورن مئی نے آہستہ سے پہلی بار اپنی آواز کھولی،''کیا آپ مجھ سے سچ مچ شادی کریں گے؟ اپنی بیوی کا درجہ دیں گے؟''

چہرہ گھما کر عیسیٰ خان نے کہا،''ضرور۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ ہی میری خاص بیگم یعنی پٹ رانی بنیں گی۔ اللہ اور چاند سورج کو گواہ مان کر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم دونوں کا اگر بیٹا ہوا تو وہی ہماری گدی کا وارث ہوگا۔''

یہ خبر جب راجدھانی تک پہنچی تو کچھ دنوں تک چاند رائے سے چھپا کر رکھی گئی، لیکن بھلا کب تک چھپائی رکھی جاسکتی تھی۔ چاند رائے کو اپنی بیٹی کے لوٹنے کا انتظار تھا۔ اندر محل میں یہ خبر پہنچتے ہی چاند رائے آہ آہ کرکے کراہنے لگا، جیسے کسی نے اس کی چھاتی میں بھالا گھونپ دیا ہو۔ وہ بے ہوش

Scanned with CamScanner

ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کو ہوش آیا تو وید حکیم اس کو گھیرے بیٹھے تھے۔ پاؤں کے پاس کیدار رائے بیٹھا تھا۔ چاند رائے نے کیدار رائے کی طرف ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا، ''جو سن رہا ہوں کیا وہ سچ ہے؟''

کیدار رائے نے بغیر کچھ کہے، سر ہلا کر 'ہاں' کہا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے چاند رائے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، ''دور دیش سے یہ یون (مسلمان) ہندوؤں کو برباد کرنے آئے ہیں۔ یہ ہمارے راج ہڑپ لیں گے، ہمارے مندر توڑ دیں گے، ہمارے گھروں کی بیٹیوں کو اٹھا لے جائیں گے۔ اب ایک بھی ہندو نہیں بچے گا، ہمارا پراچین دھرم ختم ہو جائے گا۔ شاید یہی ہمارا مقدر ہے۔'' پھر کیدار رائے سے بولے، ''مسلمانوں پر کبھی اعتماد نہ کرنا۔ تو نے اس نرادھرم سے دوستی کی تھی، اب دیکھ لیا نا اس دوستی کا نتیجہ؟ کیا قیمت دی اس نے؟ میں سمجھ رہا ہوں کہ اب میں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ ان آخری دنوں میں میرے سامنے اس سونائی کا نام بھی نہ لینا۔ آج سے وہ ہمارے لیے مر گئی۔ کیدار، تو میرے سامنے قسم کھا، تجھے اس کا بدلہ لینا ہوگا۔ جب تک تیرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی رہے گا تب تک تو اس یون کے راج کو تباہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اگر تو اس پاپی کا قتل کر پایا تبھی میری آتما کو پرلوک میں شانتی ملے گی۔''

اس کے تین دن بعد چاند رائے نے آخری سانس لی۔

کیدار رائے نے اپنے باپ کے سامنے قسم کھائی تھی اور خبر پاتے ہی اس نے خود بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ عیسیٰ خان کو تباہ کر کے چھوڑے گا، چاہے اس کے لیے اسے اپنا راج ہی کیوں نہ کھونا پڑے۔

باپ کے شرادھ سنسکار کے ختم ہوتے ہی جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کیدار رائے نے عیسیٰ خان کے راج کے خضر پور شہر پر حملہ کیا۔ دونوں فریقوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ لیکن حیرت کی بات تھی، جنگ کے میدان میں عیسیٰ خان کہیں نظر نہیں آیا؛ کوئی دوسرا سپہ سالار اس کی فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آخر کار کیدار رائے نے فتح حاصل کی۔ اس نے خضر پور کو لوٹ کر اسے اجاڑ ڈالا۔ اس کے بعد کیدار رائے کیل گا چھا گڑھ کی طرف بڑھا۔ وہاں بھی عیسیٰ خان کی غیر حاضری میں کیدار رائے نے آسانی سے اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد کیدار رائے کے پاس یہ خبر آئی کہ اس کے راج کے دوسرے کنارے پر عیسیٰ خان نے اپنی فوج کی دوسری ٹولی لے کر اس کے دو

Scanned with CamScanner

قلعوں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ کیدار رائے کے راج میں تباہی مچی تھی۔ عیسیٰ خان فی الحال کیدار رائے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی بھرپور طاقت کا احساس اس کو اچھی طرح دلانا چاہتا تھا۔

ان آپسی حملوں میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ دونوں فوج کی تعداد میں کمی آ گئی۔ ان دو بھوئیں ہروں کی فوج کی یکجائی کی امید پوری طرح سے ختم ہوگئی۔ ہندو اور مسلمان عوام میں بھی بے اعتمادی اور شک کا بیج پھوٹ پڑا۔

کیدار رائے اپنے دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔ دیر تک بحث مباحثہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے کہا، ''مہاراج عیسیٰ خان کی طاقت کو ہمیں کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ جنگی منصوبہ بندی میں مہارت رکھتا ہے۔ اس کو پوری طرح سے ختم کرنے کے لیے ہمیں اپنی طاقت اور بھی بڑھانی ہوگی۔ دریائی فوج کو اور مضبوط کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں وقت چاہیے۔ ادھر آراکان راجہ یہاں حملہ کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے، جبکہ عیسیٰ خان نے اس سے معاہدہ کرلیا ہے۔ اس لیے اس وقت ہمیں بچاؤ کے لیے سب سے پہلے آراکان راجہ کو روکنا ضروری ہے۔''

کیدار رائے نے وقت کے تقاضے کو سمجھا۔ اس نے اپنے پرتگالی سپہ سالار کاربالو کو جیسور کے راجہ پرتاپ ادھت کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے بھیجا۔ مہینے بیت گئے، جیسور سے کوئی خبر نہیں آئی۔ ادھر آراکان کی فوج لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرنے لگی۔ پرتاپ ادھت اپنے مفاد کی خاطر کوئی بھی غلط کام کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ اس نے کاربالو اور اس کے ساتھ آئے سپاہیوں کو مہینوں بٹھائے رکھا، اور اس دوران آراکان راجہ کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھی۔ 'مگ' فوج جیسور تک آ ہی نہیں سکتی تھی اس لیے ان کے خلاف جانے میں کوئی سمجھداری نہیں تھی۔ بلکہ آراکان راجہ کو خوش کرنے لیے اس نے ایک آسان راستہ اختیار کیا۔ بہت دن انتظار کروانے کے بعد ایک شام اس نے صلاح مشورے کے بہانے کاربالو اور اس کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلوایا۔ کاربالو کے اپنی نشست پر آنے کے بعد کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ پرتاپ ادھت کے اشارے پر بارہ چھپے ہوئے حملہ آوروں نے کاربالو اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا اور پل بھر میں کٹے ہوئے سر زمین پر لوٹنے لگے۔ یہ خبر مگ سینا تک پہنچتے ہی وہ اور بھی بے خوف ہو کر وکرم پور کی طرف بڑھنے لگے۔ کیدار رائے کو ان کے خلاف اکیلا ہی لڑنا پڑا۔ عیسیٰ خان اپنے ہاتھ سمیٹے دور کھڑا دشمن کی بربادی کا تماشا دیکھتا رہا۔ مگوں کو راج پر

Scanned with CamScanner

قبضہ کرنے کے بجائے لوٹ مار میں زیادہ دلچسپی تھی، اس لیے یہ جنگ چلتی رہی۔

ادھر مان سنگھ نے پٹھانوں پر پوری طرح قابو پا کر اپنا سارا دھیان ان بارہ بھوئیں ہروں پر لگا دیا۔ پرتاپ ادھت کا راج ان میں سب سے بڑا تھا مگر اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے مغلوں کے خلاف جنگ میں اترنے کی بجائے اسے اپنی عیاشی اور غلامی کی زندگی زیادہ پسند تھی۔ مغل فوج کے آگے بڑھتے ہی اس نے بہت سارے تحفے تحائف بھیجے اور مان سنگھ کے آگے بغیر جنگ کے ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ مان سنگھ نے ان کو خراج ادا کرنے والوں میں شامل کر لیا۔

ان بارہ بھوئیں ہروں میں صرف دو شخص ہی اپنی آزادی سے پیار کرتے تھے اور ساتھ ہی مغلوں کے خلاف تھے۔ ان میں ایک مسلمان تھا، دوسرا ہندو۔ دونوں میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ نڈر جنگ باز بھی تھے، مگر دونوں یکجا ہو کر لڑنے والے نہیں تھے۔ اس کی خبر مان سنگھ کو پہلے ہی لگ گئی تھی۔ ان کو ایک ایک کر کے ختم کرنا ہی ٹھیک رہے گا، یہ سوچ کر وہ دھیرے دھیرے سونار گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

کبھی عیسیٰ خان کے ساتھ معاہدہ کر کے مان سنگھ اس کو دلی لے گیا تھا، لیکن عیسیٰ خان نے اپنی آزادی پر قائم رہتے ہوئے کبھی بھی دلی کے بادشاہ کو خراج نہیں دیا تھا۔ مان سنگھ کی فوج نے سونار گاؤں کی طرف دھاوا بول دیا۔ اس بار کیدار رائے منھ پھیرے بیٹھا رہا۔ اس نے سوچا کہ دونوں ہی اس کے دشمن ہیں؛ اب اگر جنگ میں دونوں کی فوج کم ہوتی ہے تو فائدہ اسی کا ہے۔ کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ اس جنگ میں اچانک دشمن کے گولے سے عیسیٰ خان کی موت ہو گئی۔ ادھر مان سنگھ نے سونار گاؤں کو چھوڑ کر جزیرے پر قبضہ کرنے کے لیے مگوں کا پیچھا کیا۔ کیدار رائے نے دیکھا، سونار گاؤں پر قبضہ کرنے کا یہ سنہرا موقع ہے۔ عیسیٰ خان کے بغیر اس کی فوج کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ عیسیٰ خان سے وہ سیدھے تو بدلہ نہ لے سکے گا لیکن اس کے راج کو تہس نہس کر کے کچھ تو تسلی ملے گی، یہ سوچ کر کیدار رائے نے کچھ ہی دنوں بعد اپنے پرانے دوست کے راج پر حملہ کیا۔

لیکن جتنی آسانی سے اس راج پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، ویسا ہوا نہیں۔ عیسیٰ خان کی تتر بتر ہو جانے والی فوج پھر سے یکجا ہو گئی۔ کیدار رائے حالانکہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا لیکن جنگل محل کے قریب آتے ہی عیسیٰ خان کی فوج جم کر کیدار رائے کی فوج کا مقابلہ کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس

Scanned with CamScanner

راج کے جنگی اب پیچھے نہ ہٹنے کے لیے پوری طرح سینہ سپر ہوں۔ شام کو کیدارارائے اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے بیٹھا۔ انھوں نے سوال اٹھایا کہ عیسیٰ خان کے نہ رہنے پر بھی کون شخص اس راج کا سپہ سالار ہے، جو جنگی داؤں پیچ میں اتنا ماہر ہے۔

کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ لہروں کی طرح فوج اس پر ٹوٹ پڑتی ہے مگر آج تک کسی کو سامنے سے رہنمائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ سپہ سالار کے بغیر اس جنگ کی اتنی کامیاب منصوبہ بندی کون کرسکتا ہے؟ کیدارارائے بولے، ''جاسوس بھیجو۔ اس راج میں عیسیٰ خان کا وارث کون ہے؟ اس کا جاننا ضروری ہے۔''

تینوں سمتوں کی طرف تین جاسوس بھیجے گئے۔ ان میں دو کو تو کوئی خبر ہاتھ نہیں لگی لیکن آدھی رات گئے، تیسرا ایک ناقابل یقین خبر لے کر آیا۔ وہ بھیس بدل کر دشمن کی فوج کے اندر گھس کر خود اپنی آنکھوں سے سپہ سالار کو دیکھ آیا تھا۔ اس نے کہا، ''مہاراج، اس راج کی سیناپتی ایک عورت ہے۔''

عورت؟ بھلا بنگالی عورت نے جنگی داؤں پیچ میں کب مہارت حاصل کی؟ وہ تو جنگ کے میدان کے آس پاس پھٹکتی بھی نہیں۔ کیدارارائے نے پوچھا، ''کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا پھر اڑتی باتیں سنی ہیں؟''

جاسوس نے کہا، ''میں نے سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کا نام سونائی بی بی ہے۔ لوگ اس کو نعمت بی بی بھی کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسلحے میں لیس رہ کر فوج میں جوش بھرتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جنگ کے نازک دنوں میں بھی وہ خود ہاتھی پر سوار ہوکر آگے کی قطار میں آکر مورچہ سنبھالتی ہے۔'' پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا، ''مہاراج، میں نے جہاں تک سنا ہے، یہ عورت مرحوم عیسیٰ خان کی بیوی اور آپ کی سگی بہن ہے۔''

کیدارارائے کچھ پل کے لیے حیرت زدہ رہ گیا، پھر دھیرے سے بولا، ''سونائی، میری بہن! وہ اتنی شرمیلی تھی کہ بات کرنے سے بھی لجاتی تھی۔ کبھی کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ وہی سونائی اب ہتھیار لے کر مردوں کی فوج میں گھومتی ہے؟''

جاسوس سے اور کچھ دیر جرح کرنے کے بعد اس نے اپنے دوسرے سپہ سالاروں کو حکم دیا، ''جنگ نہیں کی جائے گی، سفید جھنڈا لہرایا جائے گا۔ مخالف فوج کے سپہ سالار کے پاس ایلچی بھیجا

جائے گا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

رات بھر کیدار رائے کو نیند نہیں آئی۔ اس نے سمجھا تھا کہ ضد میں آ کر عیسیٰ خان نے اس کی بہن کو اغوا تو کر لیا لیکن کچھ دنوں تک اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر اس نے اس کو حرم بھیج دیا ہوگا۔ عیسیٰ خان پر کیدار رائے کا غصہ ذرا بھی کم نہیں ہوا تھا مگر وہ سورن مئی کو بھول چکا تھا، جیسے کہ وہ مر گئی ہو۔ سورن مئی کو دوبارہ وہاں سے اپنے محل میں لانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہندو عورت کو اگر کوئی غیر مرد چھو بھی لے تو پھر اس کا اپنے گھر لوٹنا ناممکن ہے، اس لیے خاندان کے دوسرے افراد اسے مرا ہوا مان لیتے ہیں۔ چاند رائے کی اس لاڈلی بیٹی اور نہایت پر سکون اور نرم مزاج لڑکی میں ایسا بدلاؤ کیسے آیا کہ آج وہ اپنے ملک اور بڑے بھائی کے خلاف ہتھیار لے کر جنگ کے میدان میں اتر آئی؟

اگلے دن سفید جھنڈا لہرانے کے بعد پیغام رساں مخالف خیمے میں گیا مگر فوراً ہی ملاقات کا فیصلہ نہیں لیا گیا۔ طرح طرح کی شرطوں کو لے کر دونوں فریقوں میں کھینچا تانی چلنے لگی کیونکہ حریف راجہ سے ملنے کے بہانے اس کو قتل کرنے کی ان گنت مثالیں تھیں۔ جہاں بھائی کو بھائی پر بھروسا نہیں ہے وہاں بھائی اور بہن میں کیسا بھروسا؟ دن کے آخر میں طے ہوا کہ دونوں فریقین کی فوج سے کچھ دور بیچوں بیچ ایک جگہ پر ایک نیا خیمہ گاڑا جائے گا جہاں دونوں فریق کے دس دس چنے گئے سپاہی پہرے پر رہیں گے۔ خیمے کے اندر صرف اس فریق کا راجہ اور دوسرے فریق کی رانی ہوگی۔

دن ڈھلنے کو تھا، سانجھ ہونے کو تھی۔ کیدار رائے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں۔ آمنے سامنے دو سنگھاسن رکھے ہوئے تھے۔ کیدار رائے ایک پر بیٹھ گیا۔ رانی کے اندر آنے کے بعد کیدار رائے کچھ پل اس کی طرف ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا۔ وہ پہچان میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ جس کو ہمیشہ سفید لباس میں دیکھا تھا، آج وہی رنگین مسلمانی لباس میں، سر پر پنکھ لگائے، سونے کا تاج پہنے سامنے کھڑی تھی۔ رانی نے ہی بات کرنے کی پہل کی۔

"دادا، مجھے تمھاری قدم بوسی کرنی چاہیے تھی لیکن کہیں میرے چھونے سے تمھاری ذات نہ چلی جائے، اس لیے میں دور سے آداب کر رہی ہوں۔"

طنز کے ساتھ کیدار رائے نے کہا، "رہنے بھی دے، بہت ہو چکا۔ تو کیا سچ مچ ہماری سونائی ہے؟ اپنا دھرم گنوا کر تو ایسے خراب لباس میں میرے سامنے آئی ہے۔ اس سے پہلے تو مر کیوں نہیں گئی؟"

Scanned with CamScanner

رانی نے صاف صاف کہا، ''جو مذہب عورت کو صرف مرنے کے لیے کہتا ہے، میں اس مذہب کو نہیں مانتی۔''

کیدار نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، ''ہمارا دھرم کہاں عورت کو مرنے کے لیے کہتا ہے؟ باپ کی سیوا، شوہر کی سیوا، بیٹے کی سیوا، ایسی عظیم سیوائیں عورتوں کے لیے ہی ہیں۔ وہی ان کو انجام دیتی ہیں۔ بیوہ عورت عمر بھر پاکدامن رہتی ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی عبادت کر کے کتنے پُن کماتی ہے۔ دوسرے جنم میں بھی اس لیے وہ سدا سہاگن رہتی ہے۔''

رانی سنگھاسن پر بیٹھی نہیں بلکہ کھڑی رہی اور بولی، ''پاکدامن کا مطلب ہے، اس دنیا کے سارے عیش و آرام سے اپنے کو دور رکھنا۔ سیوا کا مطلب ہے سسرال یا میکے میں دوسروں کی کنیز یا غلام بن کر رہنا۔ مجھے اپنے پہلے شوہر کی شکل تک یاد نہیں۔ میں ایک دن بھی اس کے ساتھ بیاہتا جیون نہیں جی، پھر بھی ساری عمر اس کا ہی دھیان کرنا پڑے! تم لوگوں نے تو کبھی مجھے چین سے سانس بھی لینے نہیں دیا۔''

آواز رندھنے لگی تھی لیکن رانی اس وقت اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اپنے پر قابو پاتے ہوئے وہ کہنے لگی، ''دوسرے جنم میں تو تم لوگ یقین کر سکتے ہو۔ میں اب مسلمان ہوں، میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ انسان کو اپنی خواہشیں، اپنی چاہتیں اسی جنم میں مٹا لینی چاہییں۔''

کیدار رائے بولا، ''چھی! خود کو مسلمان کہنے میں تجھ کو ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ تو ہمارے خاندان کا کلنک ہے۔ ایک احسان فراموش لٹیرے نے تجھے اغوا کیا تھا۔ اپنا مذہب چھوڑنے سے پہلے تو مری کیوں نہیں؟ کم سے کم اس سے بھی ہم خوش ہوتے۔''

''دادا، تم کو یا تمھارے خاندان کو خوش کرنے کی ذمے داری اب میری نہیں رہی۔ میرے شوہر نے مجھے جو عزت دی ہے...''

''عزت؟ اس کے حرم میں تیرے جیسی اور کتنی بیویاں ہیں؟''

''جتنی بھی ہوں... کیا ہندوؤں کی آٹھ دس بیویاں نہیں ہوتیں؟ یہ لوگ تو پھر بھی حرم میں اپنی بیویوں کو کھانے پہننے کو دیتے ہیں، اور ہندو؟ وہ تو ایک کے بعد ایک شادی کرتے ہیں اور بیوی کو اس

کے میکے چھوڑ آتے ہیں اور اوپر سے جہیز مانگتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات کیا ہے، دادا، میرے شوہر نے مجھے بھرپور آزادی دی ہے۔ مجھے گھڑسواری سکھائی ہے، تلوار چلانا...''

''یہ فالتو باتیں رہنے دے، اب کام کی بات کرتے ہیں۔ تو میرے ساتھ کس بوتے پر جنگ کرنے آئی ہے؟ تیرا راج میں چاہوں تو مسل کر رکھ دوں۔ مان سنگھ نے میری آدھی فوج کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کل تو اور تیری فوج ہتھیار ڈال دے۔ دونوں راج ایک ہو گئے تو ہم ڈٹ کر مان سنگھ کا مقابلہ کر سکیں گے۔ عیسیٰ خان سے میں نے کئی بار اس بابت کہا تھا لیکن اس نے معمولی عیش و آرام کے لالچ میں میرے ساتھ احسان فراموشی کی۔ میں تجھے وچن دیتا ہوں کہ تجھے یا تیرے بچوں کو کوئی چھو بھی نہیں سکے گا۔ میں تیرے لوگوں کے لیے ماہانہ خرچ بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔ باقی کی زندگی آرام چین سے بسر کرنا۔''

تھوڑی دیر خاموش رہ کر رانی بولی، ''میرے شوہر آخری سانس تک آزادی کے لیے لڑتے رہے۔ ان کی موت پر ہمیں ناز ہے۔ انھوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ زندگی کے رہتے میں اس راج کی آزادی کو داؤں پر نہ لگاؤں، میرے دو بیٹے کسی کے غلام نہ بنیں۔ اب تم میرے دشمن ہو۔ میں اپنی آخری سانس تک ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔ میرے ہر سپاہی نے یہ عہد کیا ہے۔''

''اس جنگ میں تو تجھے ہارنا ہی ہے۔ اس کے بعد میری فوج جب لوٹ مچائے گی تو میں ان کو روک نہیں پاؤں گا۔ کم سے کم اپنے بیٹوں کے بارے میں تو سوچ...''

تبھی باہر سے کسی نے بے قراری کے لہجے میں آواز لگائی: ''مہاراج! مہاراج!''

کیدار رائے نے گرج کر کہا: ''آہ، میں نے کہا تھا نا کہ اس وقت مجھے کوئی تنگ نہ کرے؟ دور ہو جاؤ!''

اس آدمی نے پھر بھی کہا، ''مہاراج! مہاراج! بہت ضروری خبر ہے۔ آپ کے لیے ابھی جاننا ضروری ہے۔ مہاراج...''

کیدار رائے نے خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا کہ باہر سامنے اس کے تین بہت ہی بھروسے مند معاون سپہ سالار گھبرائے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا، ''مہاراج، راجدھانی سے خبر آئی ہے کہ مہاراج مان سنگھ نے آپ کے پاس ایک ایلچی بھیجا ہے۔ ایلچی کے پاس ایک خط بھی

Scanned with CamScanner

ہے۔ تین دن کے اندر اگر اس خط کا جواب نہیں ملا تو وہ لوٹ جائے گا۔‘‘

کیدار رائے تھوڑی دیر بھنویں سکوڑے رہا کہ یہ مان سنگھ کی کوئی نئی چال ہے۔ ’’یہ ایلچی ویلچی تو اس نے پہلے کبھی نہیں بھیجا۔ سرحد پر آ کر بگل بجا کر جنگ کا اعلان ہی اس کا طریقہ ہے۔‘‘

اب دوسرے آدمی نے کہا، ’’مہاراج، اس وقت ہماری راجدھانی محفوظ نہیں ہے۔ آپ کو اسی وقت وہاں لوٹ جانا چاہیے۔‘‘

دوبارہ خیمے میں آ کر کیدار رائے نے سنجیدہ لہجے میں کہا، ’’سونائی، میں نے بھی پتا جی کے سامنے قسم کھائی ہے کہ عیسیٰ خان کا راج تہس نہس کیے بنا میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔ فی الحال وہ کام میں ٹال رہا ہوں۔ اس وقت میں مان سنگھ کی فوج کو اچھی طرح سے سبق سکھانے کے قابل ہوں۔ میری دریائی فوج مغلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اب تو زمینی جنگ میں میرے پاس ہاتھی سینا بھی ہے۔ مان سنگھ نے اگر اپنی جان بچا بھی لی تو بھی اسے پیچھے تو ہٹنا ہی ہے۔ اس کام کو انجام دے کر میں پھر یہاں آؤں گا، اس بات کو یاد رکھنا۔‘‘

اسی رات اپنی ایک گھڑ سوار ٹکڑی کے ساتھ کیدار رائے فوراً راجدھانی کے لیے روانہ ہو گیا۔ مغل سپہ سالار کے ایلچی کے ساتھ دوسرے ہمراہیوں کی طرح ملا تو نہیں جا سکتا تھا۔ اگلے دن راج سبھا کو نئے ڈھنگ سے شان و شوکت کے ساتھ سجایا گیا۔ ایک اونچے تخت پر نگینوں سے جڑا سونے کا راج سنگھاسن رکھا گیا۔ درباریوں کو خبر دے کر بلوایا گیا۔ صدر دروازے کو پھولوں سے سجایا گیا۔

صبح کو دربار شروع ہوا۔ مان سنگھ کے ایلچی کو مجلس میں بیٹھا کر کیدار رائے درباریوں کے ساتھ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے میں مشغول ہو گیا، یہاں تک کہ اپنے میر دربار کے ساتھ مہابھارت میں دشینت کی زبانی شکنتلا کے بیان اور کالی داس کے ابھیگیان شاکنتلم میں کہاں کہاں کیا فرق ہے، اس پر بات چیت چھیڑ بیٹھا، جیسے جتانا چاہتا ہو کہ مان سنگھ کا بھیجا ہوا ایلچی اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، نہ گھبرانے کی کوئی وجہ ہے۔ پھر کچھ وقت گزر جانے کے بعد جیسے اچانک یاد آ گیا ہو، اس ڈھنگ سے اس نے وزیر سے پوچھا، ’’ارے ہاں، میں نے سنا ہے کہ مہارانا مان سنگھ کی طرف سے کوئی ایلچی آئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ ذرا بلایئے ان کو۔‘‘

وزیر نے کہا، ’’مہاراج، وہ سبھا میں حاضر ہیں۔ اس سنگھاسن پر بیٹھے ہیں۔‘‘

Scanned with CamScanner

اب ایلچی نے پاس آ کر مہاراج کو نہایت ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا، ''مغل سپہ سالار مان سنگھ نے کالی ندی کے اس کنارے اپنا خیمہ ڈالا ہے۔ وہ جنگ اور خون خرابے سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ جو بھی زمیندار شہنشاہ کی ماتحتی قبول کرنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ راجہ مان سنگھ دوستانہ رشتہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آپ کے لیے ایک خط اور نذرانے بھیجے ہیں۔''

دور بیٹھے دوسرے ایلچی نے سامنے آ کر ایک صندوق کھول کر اس میں سے ایک تلوار اور لوہے کی ایک زنجیر نکالی۔ ایلچی نے کہا، ''جناب عالی، آپ ان دونوں میں سے کسی ایک کو قبول فرمائیں۔ ہم اسی سے آپ کے منشا سے واقف ہو جائیں گے۔''

ایلچی نے ابھی تک کیدار رائے کو راجہ یا مہاراجہ کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود ہی راجہ بن بیٹھا ہے، دلّی کے دربار سے سند ملے بغیر مغل اسے راجہ نہیں مانتے۔

اپنے سنگھاسن سے اتر کر کیدار رائے نے کہا، ''ہر زیور ہر انسان پر نہیں بجتا۔ یہ زنجیر مان سنگھ ہی کو مبارک ہو۔'' پھر ہاتھ میں اس تلوار کو اٹھا کر کہا، ''اس کی تو دھار ہی نہیں ہے، وزن بھی کم ہے۔ میرے راج میں اس سے کہیں زیادہ دھاردار اور وزنی تلوار تیار کی جاتی ہے۔ مہاراج مان سنگھ اگر ان تلواروں کا سامنا کرنا چاہتے ہیں تو ان کا سواگت ہے۔ ذرا ان کا خط لائیے۔''

اس خط کو پڑھتے پڑھتے کیدار رائے نے کہا، ''آپ کے مہاراج کے پاس تو کوئی ماہر مکتوب نگار بھی نہیں ہے۔''

سچ مچ خط کی زبان بے حد کمزور تھی۔ اس میں ایک جگہ پر لکھا تھا، ''تریپورہ واسیو، مگو، بنگالیو، سب بھاگ جاؤ۔ ہاتھی گھوڑوں، پیدل اور دریائی فوج سے یہ بنگال بھومی کانپ رہی ہے کیونکہ خطرناک سمر سنگھ، مان سنگھ اب آ چکے ہیں۔''

کیدار رائے تضحیک آمیز انداز سے اس خط کو اپنے میر دربار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، ''آپ خالص سنسکرت میں اس کا جواب لکھ دیجیے۔ اس میں یہ ضرور لکھیے گا کہ شیر اگر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو، پھر بھی وہ ایک جانور ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''یعنی سیدھے سیدھے جنگ کا بلاوا؟''

مان سنگھ نے اپنی فوج کے ساتھ ندی پار کرنی چاہی۔ کیدار رائے اس کو زمینی اور دریائی راستے

Scanned with CamScanner

سے روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ برسوں سے مان سنگھ کو ایسی کڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بنگالی فوج ہر روز جان کی بازی لگا کر جنگ کے میدان میں اتر رہی تھی۔ کیدار رائے بھی جیسے آسمانی طاقت سے بھرپور ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ کبھی وہ گھڑسوار فوج کے سامنے نظر آتا تو دوسرے ہی پل جنگی جہازوں میں کمان داغتا دکھائی دیتا۔ سب فوجی اپنے راجہ کو اپنے ساتھ پاتے۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ پورے جنگ کے میدان چھا گیا تھا۔ پہلے دن کی جنگ برابری پر رہی لیکن دوسرے دن مان سنگھ کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مغل فوج ان کے جنگی داؤں پیچ کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یہ بنگالی فوج سامنے سے زیادہ نہیں آتی لیکن اچانک ہی داہنے بائیں اور پیچھے سے ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں دھاوا بول دیتی ہیں۔ نہ جانے کیسے اتنی جلدی سمت بدل لیتے ہیں یہ بنگالی فوجی۔ ندی نالے والے دیش کے یہ لوگ پانی کے اندر دیر تک ڈبکی لگائے رہ سکتے ہیں۔ دور سے ڈبکی لگا کر تیرتے ہوئے آکر یہ کب دشمن کی بحری فوج کی ناؤ میں پانی کے اندر سے حملہ کر دیتے ہیں، اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔

مغلوں کی زمینی فوج اور کمان کیدار رائے کی فوج کے مقابلے کہیں زیادہ طاقتور تھی مگر کیدار رائے کی فوج میں حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جنگ کے نویں دن مان سنگھ پیچھے ہٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تبھی ایک خوفناک حادثہ ہوا۔

برسات کا موسم آنے والا تھا اس لیے کیدار رائے کی فوج کو اپنی فتح کا یقین تھا، لیکن یکا یک مغلوں کی فوج سے کسی سپہ سالار نے سیدھے کیدار رائے کے سر کو نشانے پر لے کر گولی چلا دی۔ نشانہ خطا نہ ہوا۔ کیدار رائے گھوڑے سے گر گیا۔ عیسیٰ خان اور کیدار رائے کی موت بالکل ایک ہی ڈھنگ سے ہوئی۔

بنگالی فوج میں ہاہا کار مچ گئی۔ اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر مغلوں نے اپنے حملے میں تیزی پیدا کر دی۔ کیدار رائے کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ مان سنگھ اپنی فوج کے ساتھ راجدھانی شری پور آیا۔ وہاں اس نے اپنی فوج کو لوٹ مار کی اجازت دے دی۔ خود اس راج کی دیوی شیلا مئی کی مورتی لے کر چلا گیا۔ سونے کا شری پور تباہ ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد عیسیٰ خان کا راج غیر محفوظ سمجھ کر مگوں نے پھر حملہ کیا مگر نعمت بی بی نے خود اپنی فوج کو یکجا کیا اور خود ہتھیار اٹھا لیا۔ پہلی دفعہ تو اس نے مگ سینا کو روکا، پھر حاجی گنج درگ میں جا کر پناہ

Scanned with CamScanner

لی۔دشمنوں کے ساتھ اس نے جو گھمسان کی جنگ کی، ایسا کبھی کسی بنگالی عورت نے شاید ہی کیا ہو۔ مگوں نے حاجی گنج قلعے کو باہر سے آگ لگادی۔نعمت بی بی یعنی سونائی بی بی نے دشمن کے ہاتھ نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔اس نے اسی آگ میں کود کر اپنی مرضی سے جان دے دی۔اس کا بدلہ اور اس کی قسم دونوں پورے ہو گئے۔

❁❁

بنگلہ زبان کے معروف شاعر اور فکشن نگار سنیل گنگو پادھیائے 1934 میں مشرقی بنگال کے شہر فرید پور میں پیدا ہوئے، اور 1954 میں کلکتہ سے اپنی تعلیم مکمل کی۔اس سے ایک برس پہلے انھوں نے کرتی باس کے نام سے شاعری کا ایک رسالہ جاری کیا جو آگے چل کر نئے تجربے کرنے والے شاعروں کا ایک اہم پلیٹ فارم بن گیا۔ وہ شاعری، فکشن، سفرنامے، مضامین وغیرہ کی دو سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی کئی کہانیوں پر بنگال کے عظیم فلم ساز ستیہ جیت رے نے فلمیں بنائیں۔ان کے تحریر کردہ بچوں کے فکشن میں معذور مہم جو 'کا کا بابو' کا کردار بے حد مقبول ہے۔سنیل گنگو پادھیائے 2008 سے ساہتیہ اکادمی کے صدر ہیں۔

کیرتی ناشا پدما ندی کا دوسرا نام ہے جو مشرقی بنگال میں واقع ہے۔ بنگال کے 'بارو بھوئیاں' کو تاریخ نے بھلا دیا ہے۔تاریخ میں مغلوں اور پٹھانوں کے ساتھ ساتھ دوسری ذاتوں کی جنگ کے متعلق جتنا لکھا گیا ہے، بارو بھوئیاں کے بارے میں اس کا ایک حصہ بھی نہیں لکھا گیا۔کچھ روایتوں اور لوک گیتوں میں آج بھی عیسیٰ اور سونائی کی محبت کی داستان بکھری بکھری سنائی پڑتی ہے۔مغربی بنگال کے برعکس مشرقی بنگال (سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش) میں یہ عشقیہ کہانی آج بھی گاؤں میں کہی اور سنی جاتی ہے۔ایک ہندو بیوہ خاتون کے ایک مسلمان راجہ کے ساتھ انوکھے عشق کے اس افسانے میں اندھے عقیدے اور دقیانوسی ہندو سماج کے خلاف ایک خاتون کی بغاوت ایک خاص معنویت رکھتی ہے۔(ش۔ف۔)

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت: 90 روپے

انیس
(سوانح)
قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 280 روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت: 70 روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

شنکھ گھوش

بنگلہ سے ترجمہ: لکشمن ہاجرا، افضال احمد سید

یہ دریا اکیلا

جسم سے کھُل جاتا ہے اگر بھی کچھ، پھر نئے سرے سے اُگ آنا
اس تازگی کا
اس میں ضرور ہے کچھ بات۔ مجرم؟ جو سارے جرم
کرتا ہوں ہر روز
کیا معلوم ہے تجھے؟
ان ہاتھوں کی موہومی میں جمع کر چکا ہوں کتنی بددعائیں
اتنا قریب یہ دریا
پھر بھی کھُل جاتا ہے سب کچھ، جانی پہچانی اس صبح سے دور
لہراتا ہوا سبز
اچھا لگتا ہے اس کے کنارے خود کو جھکانا کبھی کبھار
اے رس بھرے پودے
کیا معلوم ہے تجھے؟ یہ دریا، اکیلا
ڈوبتے سورج میں بہاتا ہے اپنی آنکھیں، اور کہتا ہے
کیا میں بہت دور نکل چکا ہوں؟

Scanned with CamScanner

جسم

جسم میں کچھ ہونے لگا ہے، اے چارہ گر میرے
معلوم نہیں
کیسے بتاؤں اس کا نام

آئینے کے روبرو بجھ جاتی ہیں بھاری پلکیں
رگوں میں درد
اندر سے نکل آتی ہے زرد رنگ روشنی

پر یہی تو ہے شام کی رنگت، کیا لہو میں
ہوتی ہے شام؟ ہونا چاہیے؟

جسم میں کچھ ہو چلا ہے، اے چارہ گر میرے
معلوم نہیں جس کا نام

زرہ بکتر

میرے گھر کے کھلے ہوئے دروازے تک جب وہ
لوٹ آتا ہے رات، اپنے چہرے پر لیے بے شمار زخم
کھڑا ہوتا ہے دہلیز پر، ساتھ لیے ساری کائنات کا سکوت

Scanned with CamScanner

خم کیے ہوئے جسم، افق سے اوجِ فلک تک
اور جھلکتی ہے چہرے پر بے شمار ستاروں کی جلن
جھک کر اس بے سہارا شان سے بھم ہوتا ہے
جیسے اسی پل شاید گر پڑے گا میرے قدموں کی
سجدہ گاہ پر یہ بد دیانت جسم
نیم شب کی دھڑکن میں خاموش ہوئی
عدم سے معدومیت تک بے شکل، مبہم سانس، پھر بھی وہ
پکارتے ہوئے کسی دور جگہ، دور زمانے میں، دور ایک دنیا کو
کہتا ہے: اتنی اگر صف بندی، ناوک اور ناوک انداز
پھر کیوں تم نے بس یہ جسم ہی دیا، اور بھول گئے
ساتھ میں دینا ایک
زرہ بکتر

بلاعنوان

آج کل کوئی بھی انسان جنگل میں نہیں بستا
کلکتے میں بستے ہیں انسان
اس نے میری بیٹی کو چرا لیا تھا
جو جابا کے پھولوں والی ایک پوشاک پہنے ہوئے تھی
الزام ہم کس پر لگائیں

بس سوچتا ہوں اس لڑکے کا اداس چہرہ

Scanned with CamScanner

ہر شام گلی کے کنارے
وہ اب بھی کیوں اس کا انتظار کرتا ہے
سب کچھ ہے آج کلکتے میں، الزام ہم کس پر لگائیں

مدہوش

اور، اور تھوڑا مدہوش بنادو اُسے
ورنہ یہ کائنات
آسانی سے شاید اسے سہہ نہ سکے

وہ جو ابھی جواں ہے، اے خدا
ابھی عمر رسیدہ بنادے اسے
ورنہ یہ زمیں
آسانی سے شاید اسے اٹھا نہ سکے

چپکے

دوپہر کی خشکی میں
سارے پتے اگر اپنی دھڑکنوں کی
نزاکتیں کھو بیٹھیں
ڈانٹیں گے، بہت ڈانٹیں گے تجھے

Scanned with CamScanner

چیکے

چاہیے فوراً جو چاہتے ہیں
ورنہ بیکار ہے یہ زندگی، ہر خواہش پر
اگر قانون ڈرائے ہمیں
جلتی ہوا کی ان بخیل انگلیوں سے
پھر بے وفا وہ زندگی خشک
خاک ایسی زندگی پر

نازک یہ اداس دوپہر بادلوں کی
سورج اگر انگلیوں سے چھو لے
ڈانٹیں گے، بہت ڈانٹیں گے تجھے
چیکے

پانی

کیا پانی محسوس کر سکتا ہے تمھارا درد، پھر کیوں، پھر کیوں
جاؤ گے پانی میں تم اس آبی قربت کو چھوڑ کے
کیا پانی ستاتا ہے تمھیں، پھر کیوں، پھر کیوں
چھوڑ جانا چاہتے ہو شب و روز کا یہ آبی وزن

Scanned with CamScanner

بھیڑ

چھوٹے ہو کر اُتر جایئے جناب
سکڑ کر اُتر جایئے
آنکھیں بھی نہیں کیا؟ دیکھ نہیں سکتے؟
سکڑ جایئے، چھوٹے ہو جایئے

اور کتنا چھوٹا ہو جاؤں، اے خدا
بھیڑ کے اندر کھڑے
کیا ہر لمحہ اپنے آپ کے بھی برابر ہوں میں
صدر میں، بازار میں، اکیلے میں

پتھر

پتھر، میں نے ہی چڑھایا تھا تجھے اپنے سینے پر
اور آج اتار نہیں پاتا

بد دعا دیتا ہوں آج، کہتا ہوں: غلط ہے، جا اُتر جا
پھر چاہتا ہوں شروع سے
چاہتا ہوں کھڑے ہونے کو، جیسے کھڑا ہوتا ہے انسان

Scanned with CamScanner

دنیا میں غائب دن، ہاتھوں کے سوراخ میں رات
کیوں سوچتے ہو کہ سمجھ جائیں گے لوگ تمھارے دل کی بات
پورے جسم میں کوئی نئی سوچ کبھی جاگی ہی نہیں
نظر نہ آنے والی روشنی سے ہر پل گھبرا ہوا
کس کو پوجا گیا تھا اتنے دن
اکیلے ہو جا، اکیلے ہو جا، اکیلے ہو جا

جوانی

شب و روز کے درمیان پرندوں کی اڑان کے سے سائے
ہماری آخری ملاقاتوں کی یاد

ایک نیگرو دوست کو خط

رچرڈ، میرے الفاظ میں ہے تیرا نام
رچرڈ، رچرڈ
کون ہے یہ رچرڈ؟ کوئی نہیں۔ رچرڈ میرا لفظ نہیں

رچرڈ، میرے خوابوں میں ہے تیرا نام
رچرڈ، رچرڈ
کون ہے یہ رچرڈ؟ کوئی نہیں۔ رچرڈ میرا خواب نہیں

Scanned with CamScanner

رچرڈ، میرے غموں میں ہے تیرا نام
رچرڈ، رچرڈ
کون ہے یہ رچرڈ؟ کوئی نہیں۔ رچرڈ میرا غم نہیں

باؤل[1]

کہا تھا تمھیں لے کر جاؤں گا اور دور کہیں
سوچتا ہوں میں اب بھی وہ بات
زندگی کے ساتھ۔ وہ مایا نکل جاتی ہے دور دراز
سوچتا ہوں میں اب بھی وہ بات
شکست جو تم سے ملی
زندہ وہ رہے گا پھر کیسے
اندر یا باہر دیکھو، نا آسودگی آسودگی
جوڑے میں ہی مل پاؤ گے ان سے

بے غرض تو نہیں ہو تم، سمجھتا ہوں
جس کے درد سے کھولتا ہے اپنا دل، جس کھولنے کے معنی ہیں
کچھ اور دیکھتا ہوں نیند میں، آسمانی رنگ
ڈوریوں میں روشنی کے پھول

---

1 باؤل: گاؤں گاؤں گھوم کر اپنا صوفیانہ اور عاشقانہ کلام گا کر سنانے والے شاعر۔

Scanned with CamScanner

باندھ نہیں پاتا کبھی جنھیں
کھلتے ہی نیند، عجیب سی بات، دیکھتا ہوں ایک بھی
داغ محبت کے بدن پر نہ تھا

کہا تو تھا، دور ہواؤں میں پھیلا کبھی دوں گا تجھے
سوچتا ہوں اب بھی وہ بات
دل کے تیرے اندھیرے میں مدہوش ہاتھ کی خوشی گونجی
صحیح کہا تھا بھائی
سوچتا ہوں میں اب بھی وہ بات

❁❁

نِلغجن ہاجرا

بنگلہ سے ترجمہ: نلغجن ہاجرا، افضال احمد سید

نظم

بغیر کسی بندرگاہ کا
بھوتوں کا جہاز
خطرناک طوفان میں نہیں ڈوبتا
پانی کے نیچے چھپی ہوئی
چٹان میں
نہیں پھنس جاتا
برف کے تودے سے ٹکرانے سے
دو ٹکڑے نہیں ہو جاتا

اس کے اشارے پر
کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا

اس کی یادداشت میں
کوئی ہیجان خیز مثلث نہیں ہے

Scanned with CamScanner

اس میں
ششدر کر دینے والے 70 ملی میٹر بوسوں
یا آنسوؤں کے ڈولبی ساؤنڈ کا
مال تجارت نہیں ہے

کہر میں
اچانک اس کو دیکھ کر ڈر مت جا
اس سے
پرچم اڑا کے
تباہ کن گولہ نہیں پھینکا جاتا

پرچم چھپا کے قزاق اس میں سے
کود کر نہیں نکل آتے
یہ غیر قانونی طور پر
افیم نہیں لے جاتا

یہ صرف
بغیر کسی بندرگاہ کا
بھوتوں کا جہاز ہے

Scanned with CamScanner

نظم

کیا کر رہے ہو؟
آسمان کو رنگ رہا ہوں

اتنی جرأت کیسے ہوئی؟
محبت کا پرچم اڑانا چاہتا ہوں

محبت کا کیا رنگ ہے؟
سیاہ، گہرا سیاہ

یہ رنگ کیوں چنا؟
تم نے جو آگ کا رنگ نفرت کو دے دیا ہے

اور کیا وجہ؟
اور آنسوؤں کو سبز کر دیا ہے

اور؟
بے شرم خاموشی کو تم نے نیلا بنایا ہے

اس کے علاوہ اور؟
ظلم کو بے داغ سفید کیا ہے

Scanned with CamScanner

محبت کا پرچم اڑانا چاہتا ہوں

نظم

میں نے سب کے ساتھ
آواز ملا کر گانا شروع کیا

سب نے تنگ آ کر کہا
تم نے گیت آخری بول سے کیوں شروع کیا

میں نے کہہ ڈالا
نفرت اور گیت دائرے کی طرح ہوتے ہیں

وہ لوگ
دو گروہوں میں بٹ گئے
دائرے کی ابتدا اور انتہا ڈھونڈنے لگے

دونوں گروہ ایک دن پہنچ گئے
تمھارے دل تک

Scanned with CamScanner

نظم

میں اُس سے باتیں نہیں کرتا
اس ٹالی گنج کے نالے کے پاس کی بستی کی
لڑکی سے
جو اوس میں ٹھنڈی آنکھیں لیے
ہسپتال کے موڑ پر کھڑی ہے
میں اس سے باتیں نہیں کرتا

اور شام بازار محلے کی
لڑکی سے
جس نے سالٹ سٹی کے نئے گھر میں محبت کی
اس کے ساتھ بھی میں کوئی باتیں نہیں کرتا

اور یہ ٹالی گنج کے نالے کے پاس کی بستی
ہٹ گئی ہے دوسرے نالے کے پاس
شہر اور میٹرو ریل کی سرحد میں
اضافہ کرنے کے لیے

اور شام بازار کا محلہ
کسی اور کنڈوِل میں کوئی محلہ
دریافت نہیں کر سکا

Scanned with CamScanner

اور یہ میٹرو ریل
مجھے جلد ٹالی گنج بازار پہنچا دے گی

اور یہ میٹرو ریل
مجھے کسی دن بھی نہیں پہنچا پائے گی
اسی ٹالی گنج کے نالے کے پاس کی بستی کی اُس لڑکی کے پاس
اور شام بازار محلے کی اُس لڑکی کے پاس
ایک بار
یا اور ایک بار

❊❊

Scanned with CamScanner

دوسری زبانوں کے ناول

قلبِ ظلمات

جوزف کونریڈ

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

Rs.80

تمس

بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی

Rs.100

نوکر کی قمیض

ونود کمار شُکل

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

Rs.75

بوفِ کور

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

(نیا ایڈیشن زیرِ طبع)

عمارتِ یعقوبیان

علاء الاسوانی

عربی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

خندہ اور فراموشی کی کتاب

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

کرپشن

طاہر بن جلون

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

زاہد امروز

غیر متوقع بچے کی متوقع موت

وہ عورت جسے ماں کہا جا سکتا ہے
ذرا سی زود عمل ہوتی
تو پہلی سانس سے پیشتر ہی
میں پانی میں بہہ گیا ہوتا

میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گا
جنھوں نے میری پیدائش پر چراغ جلائے
میری یہ الجھن ویسٹ بن نے سلجھائی
کہ میں سماعت سے محروم اور گویائی سے قاصر کیوں رہا
جنازہ گاہ میں پھیلی موت کی خوشبو
کبھی میرے لباس سے نہ گئی
عید گاہوں میں بغل گیر ہوتے ہوئے
مجھے ہمیشہ پھوٹ پھوٹ کر رونا آیا
اگر وہ میری پیدائش سے پہلے مر گئی ہوتی
تو تمام عمر مجھے مردہ گیت نہ سننا پڑتے

Scanned with CamScanner

مجھے بے مصرف لوگوں نے بتایا
یہ ملک بن مانگے بچوں سے بھرا پڑا ہے
جن کی ماؤں کو کبھی مخلص مرد نہ ملا
جہاں لمس ہمیشہ محبت کو ترستا رہا
کاش کبھی میرے بدن کی نیند بیدار ہوتی
میں اپنی تازہ قبر کی گداز حدت محسوس کر سکتا
جہاں ایک اپنائیت ہمیشہ میری منتظر رہی

مجھے خبر ہے
روایت کا تحفظ کرنے کے لیے
میں شناختی کارڈ بننے سے پہلے مار دیا جاؤں گا

جس رات مجھے قتل کر دیا جائے گا
وہ عورت، جسے ماں کہا جا سکتا ہے
پھر حفاظتی تدابیر کے بغیر
شناختی ادارے کے بڑے افسر کے ساتھ
بے ارادہ مدہوشی پہ رضامند ہو جائے گی

تم مسجد کے سائے میں سوکھ جاؤ گے

جب تم جمعہ پڑھ رہے ہوتے ہو
میں نفیس دن کی اجلی روشنی میں

Scanned with CamScanner

کائنات کے عظیم پھول سے خوشبو کشید کر رہا ہوتا ہوں
میں اپنی چھت سے دیکھتا ہوں
ایوانِ صدر کے باغیچے میں رنگ نہیں ہیں
کانٹوں کی زرخیز کیاری میں تمھاری دھڑکنیں دفن ہیں

آسمان پر ایک ہی درخت ہے
جسے تمھارے سجدے سیراب کرتے ہیں
اپنی جھولیاں جتنی بھی کشادہ کر لو
اس کے پھل ہمیشہ کائنات سے باہر گر جاتے ہیں
بار بار آسمان مت دیکھو
آنسوؤں کی پنیری کاشت کرنے سے آنکھیں نہیں اگتیں
فوجی وردیوں کے سائے میں پروان چڑھی
اس صدی کو کیا معلوم
کہ تم پچھلی نسل کا کمایا ہوا خسارہ ہو

میں سفید پھولوں کے اس باغ کا خدا ہوں
جو میرے وجود میں بے مہار اگ آیا ہے
پھر بھی آوازوں کے عجائب گھر میں
میرے آنسوؤں کی کوئی سمفنی نہیں

جب دھرتی مجھے واپس بلائے گی
میں اپنی بینائی ان پھولوں کو دے جاؤں گا
جو اس وطن کی زندہ قبر پر اگے

Scanned with CamScanner

اور میری اداسیوں پر مسکراتے رہے

سترہ کروڑ مینڈکوں کی دوستی اب بے مصرف ہے
تمھارے چہرے پر برص پھیل رہا ہے
آؤ، تمھاری بنجر روح میں بہار پھونکنے کے لیے
کچناروں کی تازہ کونپلیں چننے چلیں

شہری روشنیوں میں وحشی خواب

جب تمام روشنیاں سو جاتی ہیں
اور دوست نیند کی گٹھڑی اٹھائے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
نیلی شام اپنی آنکھوں سے نکل کر
اداس گلیوں میں بے لباس ہو جاتی ہے
ابلے انڈے کی زردی سا سورج
اڑتے پرندوں کے پروں میں ڈوب جاتا ہے
اور بلیاں اپنی جمائیوں میں کود جاتی ہیں
میں بھی کھڑکیوں سے جھانکتا ہوں
اور اپنے نیم وحشی خواب اٹھائے باہر نکلتا ہوں

مسکراتے بازاروں کی دھیمی بھنبھناہٹ سے گزرتے ہوئے
ساحل مجھے آوازیں دیتا ہے
جہاں، سمندر کے دوسرے کنارے پر

Scanned with CamScanner

میں اپنے تاریک وطن کو دیکھتا ہوں
میرا معصوم خواجہ سرا وطن
جہاں سوچوں میں گیدڑ چیختے ہیں
بے بسی اپنے باسی دانتوں سے ہمیں کاٹتی ہے
جہاں گھٹن ہر رات کئی جذبوں کا قتل کرتی ہے
ہوٹلوں کی غلیظ کرسیاں اپنی محرومی پر آزردہ رہتی ہیں
اور روزانہ ایک دہشت گلیوں میں لاشیں پھینک جاتی ہے
تب میں بے اختیار پانی کی گہرائی ماپتا ہوں

سمندر کا سریلا گیت
شانت لہجے میں تمھارا انتظار کر رہا ہوتا ہے
تمھارے آنے تک
میں ان گنت راستوں سے اپنا تعاقب کرتا ہوں
اور زخمی خواب لیے تمھارے وجود میں کود جاتا ہوں
یہاں ایک شانتی مجھے بار بار چومتی ہے
روشنی مجھے بانہوں میں بھر لیتی ہے
میں تمھاری عظیم دنیا کا باشندہ بن جاتا ہوں
تب کوئی دھن پرائی نہیں لگتی
کوئی سمت اجنبی نہیں رہتی
تمھاری سفید جلد میری آنکھوں کی چاندی بنتی ہے
اور میرا گندمی لمس تمھیں قوسِ قزح بنا دیتا ہے
اس نئی دنیا میں آزاد پھرتے ہوئے
ہم کئی منزلوں کی دریافت، کئی راستوں کا چاند بنتے ہیں

Scanned with CamScanner

مگر اچانک، میرے وطن میں غیر متوقع دھماکے کی آواز
ہمارے وجودوں میں لکیریں کھینچ دیتی ہے
میری سوچوں میں گیدڑ چیخنے لگتے ہیں
قبریں مجھ پر قہقہے لگاتی ہیں
اور میں پھر... تم سے دور کھڑا
اپنے نیم وحشی خواب کا ایندھن بن جاتا ہوں

ڈوبتا سورج اور خالی قبر

کوئی گیت مجھے نہیں گنگنا رہا
کوئی دھن میری ترجمانی نہیں کر رہی
کوئی خواب مجھے نہیں دیکھ رہا
مسکراتے لمس کے نیچے ایک بے اطمینان دھڑکن
ادھورے پن کے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہے

تمھاری لاش میرے وجود میں لیٹی ابھی تک سو رہی ہے
میں کسی سمت نہیں بھاگ سکتا
تم مجھے چاروں اطراف سے گھیر لیتی ہو
ایک غیر متوقع موت کی گود میں لیٹے ہوئے
میں بے قابو ہوتے ہوئے گہرے درد سے تڑپنے لگا ہوں

Scanned with CamScanner

ایک بے بسی مجھے دہرا رہی ہے
کون میری سانسوں کا چور
میرے برفیلے وجود میں اتر آیا ہے؟
جب آنسوؤں میں بھیگی گھٹنی
میرے برف ہوتے ارادوں میں گونج اٹھے گی
میں بہت قطرہ قطرہ
سانس کی آہستگی کے ساتھ
تمھاری لاش میں جذب ہو جاؤں گا

رات اور چاند کی سنگت میں

سوئے شہر کی زخمی روح میں
جب رات کی گہری خاموشی ٹرانے لگتی ہے
چوک کے روشن بلب کے نیچے
میں بھٹکے سایوں کو اپنی تنہائی کے گیت سناتا ہوں
اور بلب سے کہتا ہوں
دیکھ میرے شیشے کے مصنوعی چاند
دیکھ مجھے
بازاروں میں پھرتے پاگل بوڑھے کی دانش
اور سڑک پر گرے پڑے آوارہ لڑکے کی آنکھیں
جن میں چاند اور چرس کے مردہ خواب سلگتے ہیں
میرا درد سمجھتی ہیں

دروازے کے پاس گرے سنبل کے بوجھل پھولوں میں
میری مرجھائی آواز پڑی ہے
میں کیچڑ سے آلودہ جوتوں میں سوتا ہوں
اور اس لڑکی کو اپنانے کی خواہش کرتا ہوں
جس کے بدن میں داغی سیبوں کی باس رچی ہے
جو سبز پہاڑوں کے پیچھے ویران سڑک پر
بیوہ رات کے بنجر پن پر روتی ہے
تنہائی کی زہر بجھی سنگینوں میں اپنی آنکھ پروتی ہے

میرے شیشے کے مصنوعی چاند
دیکھ مجھے
میں پھولوں اور پرندوں کا ہم زاد
مٹی کی زرخیزی کا ہم راز
لیکن من مرضی سے دو لمحے بھی جی نہیں سکتا
دو روحوں کو ایک بدن میں سی نہیں سکتا

مکھن کی ٹکیا سا چاند
میں جس کی لو میں دیکھتا ہوں
جینے کی حسرت میری سانس میں درد کی چٹکی بوتی ہے
خوشی کسی آوارہ کتے کے خوابوں میں سوتی ہے

Scanned with CamScanner

قطب شمالی کا موسم سرما

(ہانس بورلی کے لیے)

اس دن، زندگی کو ہم نے
اپنے گرد جمتی سفید حقیقت میں دیکھا
دور افق تک پھیلی ایک سفید حسرت
ہمارے بے بس وجودوں میں گھاس کی طرح اگ آئی تھی

یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا
جمے ہوئے خاموش لمحے کے پاتال میں
کسی شکاری کی چاپ سنائی دی
اس دن کے بعد
ہم نے برفانی دنوں کی سردیاں
ایک بارہ سنگھے کے دل میں بسر کیں
اور باقی ماندہ زندگی
دور افق پر اڑتے سنہری پرندوں کے خواب میں

❁❁

Scanned with CamScanner

انیس اشفاق

اعراف

بتانے والے نے کسی کو یوں بتانا شروع کیا:

اس ہسپتال کو، جسے شہر سے دور ایک سنسان مقام پر زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر بنایا گیا تھا، بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا، لیکن جن لوگوں نے دیکھا تھا ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا بندوبست کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس ہسپتال میں الگ الگ امراض سے متعلق کئی وارڈ تھے؛ انھیں میں ایک ایسا وارڈ بھی تھا جس کی طرف بہت کم لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ وارڈ باہر سے بہت پرانا اور بوسیدہ نظر آتا تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس وارڈ میں صرف دو بستر تھے اور اُن دو بستروں پر دو ایسے مریض تھے جنھیں گمنام علاقوں سے لایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن مریضوں کو وہاں رہتے ہوئے زمانہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں، اور اسی لیے ابھی تک انھیں اس ہسپتال سے چھٹی نہیں دی گئی ہے۔ وارڈ کی طرف آنے جانے والے بتاتے ہیں کہ انھوں نے وہاں کبھی کسی معالج کو نہیں دیکھا۔ لیکن وارڈ کے مریض اپنے معالجوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ مریضوں کی نگہداشت کرنے والی نرسیں بھی وہاں کبھی نظر نہیں آئیں لیکن مریضوں کے آس پاس قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ نرسیں مریضوں کی نگہداشت کرتی رہتی ہیں۔ وارڈ کی صفائی کرنے والے ملازموں اور جمعداروں کو بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا لیکن وارڈ کے اندر کبھی گندگی نظر نہیں آئی۔

ان مریضوں کو جو گمنام علاقوں سے یہاں لائے گئے تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ انھیں یہاں

کیوں لایا گیا ہے۔ بیماروں کی طرح ایک زمانے تک وارڈ میں رہنے کے بعد بھی اُن کے معالجوں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے مرض میں مبتلا ہیں اور ان مریضوں نے بھی اپنے معالجوں سے کبھی نہیں پوچھا کہ ان کا مرض کیا ہے اور یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ انھیں یہاں سے کب چھٹی دی جائے گی۔ دونوں مریضوں نے اس وارڈ کو اپنا دائمی ٹھکانہ سمجھ لیا تھا اور اب انھیں اپنے شفایاب ہونے کی بھی کوئی فکر نہیں تھی۔

بتانے والے نے آگے بتایا:

اس وارڈ کی طرف کبھی کبھی آنے والے معالجوں میں سے ایک معالج نے اپنی یادداشتوں میں ان مریضوں کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''مجھے اس وارڈ کے معالجوں میں سے ایک معالج کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ پہلی بار جب میں اس وارڈ میں داخل ہوا تو میں نے دو بستروں پر دو بہت کمزور اور نحیف مریضوں کو لیٹے ہوئے پایا۔ میرے داخل ہوتے ہی دونوں نے ایک بیمار سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کی خیریت معلوم کی تو وہ خاموش رہے۔ میں نے ان کا معائنہ کیا، ضروری ہدایتیں دیں اور کچھ دوائیں تجویز کیں۔ میں جب تک ان کے پاس موجود رہا، وہ دونوں کوئی لفظ بولے بغیر مسکراتے رہے۔ معائنے کے بعد جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو دونوں میں سے کسی نے اپنی بیماری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ لیکن اگر وہ پوچھتے بھی تو میں انھیں کچھ نہ بتا پاتا، کیونکہ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کا مرض کیا ہے۔ جتنی دیر میں ان کے پاس بیٹھا رہا، ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ دونوں کی صورتیں الگ الگ تھیں لیکن دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی طرح کی چمک تھی۔ بیماروں کی آنکھوں میں اس طرح کی چمک دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ لیکن اس چمک کے پیچھے وہ اذیت بھی دکھائی دے رہی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ دونوں کے چہرے زردی مائل تھے اور ان پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان جھریوں پر بہت باریک لکیریں ایک دوسرے کو اس طرح کاٹ رہی تھیں کہ ان کے چہروں پر چھوٹے چھوٹے خانے بن گئے تھے۔ دونوں کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ صاف رنگتوں والی ان عورتوں کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ

Scanned with CamScanner

حلقے بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ان سیاہ حلقوں کو دیکھ کر مجھے وہ پھندے یاد آنے لگے تھے جنھیں ماہر شکاری خطرناک اور خونخوار جانوروں کو قابو میں کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فوراً اُن کی طرف سے اپنی آنکھ ہٹالی تھی۔ پھر میں نے ان کے جسموں پر نگاہ ڈالی، جہاں گوشت کے نام پر صرف ہڈیاں تھیں۔ ہڈیوں سے جھانکتے ہوئے ان کے جسم لوہے کی باریک تیلیوں سے بنے ہوئے کسی زنگ آلود پنجرے کے اندر قید نڈھال پرندوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ وارڈ سے باہر نکلتے وقت ایک بار پھر میں نے انھیں پلٹ کر دیکھا۔ میرے اس طرح پلٹ کر دیکھنے پر وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائیں۔ ان کی سرد اور سپاٹ مسکراہٹوں کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں تیزی کے ساتھ اس وارڈ سے باہر نکل آیا۔ اس دن کے بعد سے میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں ان مریضوں کو دیکھنے نہیں جاؤں گا۔ لیکن ہسپتال کے منتظمین کا حکم تھا کہ میں ان مریضوں کا خیال رکھوں اور انھیں یقین دلاتا رہوں کہ وہ جلد سے جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی ہسپتال کے منتظمین کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہاں کے دوسرے معالجوں کی طرح مجھے بھی روز کے روز ہدایتیں مل جاتیں کہ آج مجھے کن کن مریضوں کو دیکھنا ہے۔ لیکن ان مریضوں میں ہسپتال کے منتظمین کی خصوصی دلچسپی تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میری ہی طرح دوسرے معالج بھی اس وارڈ کے مریضوں کو دیکھنے آتے ہیں لیکن میں نے اپنے سوا کسی اور معالج کو وہاں کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی ان مریضوں نے مجھے بتایا کہ ان کے دوسرے معالج کون ہیں اور وہاں کب کب آتے ہیں۔ میں بہت دنوں تک اس ہسپتال میں معالج کے طور پر ملازم رہا اور جب میں نے وہ ہسپتال چھوڑا، اس وقت دونوں مریض اُسی وارڈ میں موجود تھے۔''

بتانے والے نے یہ باتیں جسے بتائیں، ایک دن یہ باتیں اس نے مجھے بتائیں۔ میں نے اس سے معالج کی یادداشتیں حاصل کر لیں اور انھیں پڑھنے کے بعد اُس معالج کو شہر میں بہت ڈھونڈا لیکن نہ تو وہ مجھے کہیں ملا اور نہ کسی نے اس کے بارے میں مجھے ٹھیک بتایا۔ البتہ اس تلاش کے دوران ایک دن اتفاقاً مجھے اُس ہسپتال کے معالجوں میں سے ایک اور معالج کے ہاتھ کے لکھے ہوئے

کچھ ورق مل گئے۔ یہ معالج بھی اس وارڈ کے لیے خصوصی طور پر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کے مندرجات میں ان مریضوں کا جو حال لکھا گیا تھا، وہ پہلے والے معالج کی یادداشتوں میں لکھے ہوئے احوال سے مختلف تھا۔ اس معالج نے لکھا تھا:

''میں جس ہسپتال میں معالج کے طور پر مقرر رہا ہوں وہاں ایک ایسا وارڈ ہے جو کسی مردہ گھر سے مشابہ ہے۔ باہر سے دیکھنے پر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر سانس لیتا ہوا کوئی مریض موجود ہے۔ میں نے اپنی پوری ملازمت میں کسی بھی ہسپتال کے کسی بھی وارڈ میں ایسی المناک ویرانی کبھی نہیں دیکھی۔ وارڈ کے آس پاس بہت سے درخت ہیں لیکن ان کی شاخوں پر پرندے کبھی نہیں بیٹھتے اور میں نے انسانوں کو بھی ان درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ وارڈ کے دوسری طرف ایک وسیع میدان ہے جس میں دور تک کوئی درخت نظر نہیں آتا۔ یہ میدان اگرچہ اسی ہسپتال کا حصہ ہے لیکن اس پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی ہے۔ ہسپتال میں کام کرنے والے بتاتے ہیں کہ رات ہوتے ہی اس میدان پر سائے رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں سایوں کے خوف سے دن میں بھی کوئی اس میدان کی طرف نہیں جاتا۔ لیکن وارڈ میں رہنے والے مریضوں کو اکثر میں نے اس میدان میں چہل قدمی کرتے دیکھا ہے۔ ایسا کئی بار ہوا کہ جب میں ان مریضوں کے وارڈ میں داخل ہوا تو انھیں وہاں سے غائب پایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ٹہلنے کے لیے میدان کی طرف گئے ہیں۔ دونوں مریض ایک ہی طرح کے تھے اور مرض کی تشخیص نہ ہونے کے باوجود ظاہری آثار کی بنا پر کہا جا سکتا تھا کہ دونوں ایک ہی مرض میں مبتلا ہیں۔ میں جب تک ان کے علاج پر مقرر رہا، ان کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکا۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے مرض کو سمجھتے تھے اور شاید وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے مرض کے بارے میں باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے اکثر انھیں ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھا تھا لیکن وارڈ میں داخل ہونے پر مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے انھوں نے اپنی گفتگو کا موضوع بدل لیا ہے۔ لیکن موضوع بدلتے بدلتے کچھ لفظ ان کی گفتگو میں ایسے آجاتے جن سے بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ ان کی پہلے کی گفتگو کا موضوع کیا تھا اور میں ان کی پہلے کی گفتگو کے موضوع کے بارے میں سوچ کر یہ سوچنے لگتا کہ یہ موضوع کیا رہا ہوگا۔ جو کچھ میں سوچتا وہ کچھ اس طرح ہوتا:

''دونوں اپنی لاعلاج بیماری کے بارے میں بات کر رہے ہوں گے اور ان معالجوں کا مذاق اڑا رہے ہوں گے جو ان کا مرض معلوم کرنے اور انھیں پوری طرح ٹھیک کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ لاعلاج مرض میں بہت جلد مرجانے کے خیال سے وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگیوں کے بارے میں بہت کچھ پوچھ رہے ہوں گے اور ایک دوسرے سے بات کر کے وہ یہ بھی اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ اس جان لیوا مرض میں ابھی وہ اور کتنے دن تک زندہ رہیں گے۔''

معالج کی یادداشتوں میں آگے لکھا تھا:

''میں جب جب اس وارڈ میں جاتا، دونوں مریضوں کو خوش خوش ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھتا۔ ان کی گفتگو کے موضوع بھی عجیب وغریب ہوتے۔ وہ عجیب الہیت جانوروں کے بارے میں باتیں کرتے، اُن خوفناک جنگلوں کا ذکر کرتے جہاں ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے اور جن کے گھنے اور لمبے درختوں سے خوفناک آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اور وہ ایسے سمندروں کے قصے سناتے جہاں ہر وقت سیاہ آندھیاں اٹھتی رہتی ہیں۔ میں نے انھیں ایسے پہاڑوں کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا جن کی چوٹیاں کٹے ہوئے سروں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی بات چیت میں ایسی زمینوں کا بھی ذکر آتا جن پر آسمان سے ہمیشہ خون برستا رہتا ہے''۔

دوسرے معالج نے اپنی یادداشتوں میں بس یہیں تک ان مریضوں کا حال لکھا تھا۔

مریضوں کا یہ حال جان لینے کے بعد پہلے کی طرح میں نے اس معالج کو بھی شہر میں بہت تلاش کیا، لیکن کوشش کے باوجود وہ کہیں نہ مل سکا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ دونوں معالج اسی شہر کے تھے لیکن شہر میں کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ معالجوں کی یادداشتوں میں لکھے ہوئے مریضوں کے احوال نے میرے اندر ان مریضوں کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا۔ میں اس ہسپتال کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا جہاں یہ مریض داخل کیے گئے تھے، اس لیے سب سے پہلے میں نے اس ہسپتال کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ ہسپتال شہر سے دور ایک غیر آباد علاقے میں واقع ہے لیکن بتانے والوں کو ٹھیک نہیں معلوم تھا کہ اس غیر آباد علاقے کی طرف شہر کا کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب مجھے ہسپتال کی طرف جانے والے راستے کا کوئی سراغ نہیں

Scanned with CamScanner

ملا تو میں اپنے آپ ایک طرف چل پڑا۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ دیر کی مسافت کے بعد میں اس غیر آباد علاقے میں پہنچ جاؤں گا جہاں وہ ہسپتال موجود ہے، لیکن بہت دیر تک چلنے کے بعد بھی وہ غیر آباد علاقہ نظر نہیں آیا۔ اور تب میں نے سوچا کہ میں شاید غلط سمت میں نکل آیا ہوں۔ یہ سوچتے ہی میں نے شہر کے دوسرے حصے کا رخ کیا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنا رخ بدلا مجھے کچھ سواریاں نظر آئیں جن میں کچھ ایسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن کی شکلیں بیماروں جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ سواریاں اسی راستے پر جا رہی تھیں جس پر میں پہلے چل رہا تھا۔ میں نے اپنی راہ بدلی اور ان سواریوں کے پیچھے پیچھے یہ سوچ کر ہو لیا کہ ہو نہ ہو، یہ اسی ہسپتال کی طرف جا رہی ہیں جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ سواریاں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی خاموش تھے اور انہیں چلانے والے بھی کچھ نہیں بول رہے تھے۔ بہت دیر بعد سواریاں ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئیں جہاں آبادی ختم ہو رہی تھی۔ اب دیر دیر بعد اکا دکا لوگ نظر آتے۔ چلتے چلتے سواریاں اس میدان میں پہنچ گئیں جو بہت دور تک ویران نظر آتا تھا۔ میں نے اس میدان میں بہت دور تک نظر دوڑائی لیکن بہت دور تک مجھے کوئی درخت نظر نہیں آیا۔ میں نے سوچا، میدان سے گزرنے والے تیز دھوپ میں کہاں قیام کرتے ہوں گے۔ سواریاں آگے بڑھتی رہیں اور میں سواریوں کے پیچھے چلتا رہا۔ شام ہوتے ہوتے بہت دور پر ایک چہار دیواری نظر آئی اور سواریاں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسی کے قریب جا کر رک گئیں۔ سواریوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا میں بھی چہار دیواری کے پاس جا کر رک گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ یہ چہار دیواری بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کے رقبے کا اندازہ لگانا آسان نہ تھا۔ چہار دیواری کے اندر عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ سواریاں چہار دیواری کے داخلی دروازے کی تلاش میں پھر آگے بڑھنے لگیں۔ کچھ دور چلنے کے بعد محرابی شکل کا ایک بہت بڑا آہنی پھاٹک دکھائی دیا۔ سواریاں وہاں جا کر رکیں تو دروازے پر موجود پہریداروں میں سے ایک نے وہ آہنی پھاٹک کھول دیا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ سواریوں میں بیماروں کو لایا گیا ہے۔ سواریاں اندر داخل ہو گئیں اور جب ان کے پیچھے پیچھے میں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو پہریداروں نے مجھے روک کر مجھ سے کہا:

''تم تو بیمار نہیں ہو؟''

Scanned with CamScanner

''نہیں،'' میں نے کہا۔

''پھر تم اندر نہیں جا سکتے، اندر صرف بیماروں کو لے جایا جاتا ہے،'' ان میں سے ایک پہریدار نے آگے بڑھ کر سختی سے کہا۔

''یہاں مریض کی دیکھ بھال باہری لوگ نہیں کرتے،'' پہریداروں میں سے ایک بولا۔

''میں باہری نہیں ہوں،'' میں نے کہا۔

''لیکن تم اندر کے بھی نہیں ہو،'' سب سے آگے والا پہریدار بولا۔

''مجھے ان مریضوں کے، جن کی دیکھ بھال کے لیے میں یہاں آیا ہوں، معالجوں نے بھیجا ہے،'' میں نے کہا۔ اور پھر ان پہریداروں کو مریضوں کی وہ تفصیل بتائی جو مجھے معالجوں کی لکھی ہوئی یادداشتوں سے حاصل ہوئی تھی۔ یقین کے ساتھ بتائی ہوئی میری تفصیل پر پہریداروں کو یقین آ گیا اور انھوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہسپتال کے اس حصے کو ڈھونڈنے لگا جس کا کچھ کچھ نقشہ معالجوں کی یادداشتوں میں پیش کیا گیا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد کچھ کچھ فاصلے پر بنی ہوئی ہسپتال کی عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہیں سے ایک بڑا میدان شروع ہوتا تھا۔ یادداشتوں کے مطابق اسی میدان کے بعد اُن دونوں مریضوں والا وارڈ تھا۔ میں نے میدان کے اس طرف نگاہ دوڑائی تو مجھے دھندلی سی ایک عمارت نظر آئی۔ میں نے جلدی جلدی اس میدان کو طے کرنا شروع کیا۔ جیسے جیسے میدان ختم ہوتا جاتا، مریضوں والی عمارت کے نقوش واضح ہوتے جاتے، یہاں تک کہ میں وارڈ کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اب میں نے دیکھا کہ گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے جو عمارت موجود ہے اس کی دیواریں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہیں اور ان پھٹی ہوئی جگہوں میں کچھ پیڑ اُگ آئے ہیں جن کی جڑوں نے ان پھٹی ہوئی جگہوں میں اور دراریں پیدا کر دی ہیں۔ وارڈ کی دیواروں پر جگہ جگہ کائی جمی ہوئی تھی اور جہاں کائی نہیں تھی وہاں چٹخی ہوئی دیواروں سے پانی رسنے کی وجہ سے نمی کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ وارڈ کا چوبی دروازہ بہت پرانے زمانے کا معلوم ہوتا تھا جس کے دونوں پلّوں کے درمیانی حصوں پر جہاں وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے، لوہے کے دو بڑے بڑے کڑے لٹک رہے تھے۔ انھیں کڑوں میں قفل پھنسا کر دروازے کو مقفل کیا جاتا ہوگا۔ دروازے کے دونوں پلّوں پر بہت عمدہ قسم

کی نقاشی کی گئی تھی لیکن اس کا بڑا حصہ مٹ چکا تھا۔ جو آدھی ادھوری نقاشی بچ رہی تھی، اسی سے اس کی عمر گی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہسپتال کی نئی طرز کی عمارتوں کے مقابل اس چہاردیواری میں یہ پرانی طرز کی عمارت عجیب سی معلوم ہوتی تھی اور اسی لیے یہ خیال گزرتا تھا کہ ہسپتال بننے سے پہلے یہ عمارت اس میدان میں موجود رہی ہوگی اور اسی عمارت سے چہاردیواری والے میدان کی شناخت کی جاتی رہی ہوگی، اسی لیے ہسپتال کے منتظمین نے میدان کی پرانی شناخت کو باقی رکھنے کی غرض سے اسے منہدم کرنے کے بجائے ایک وارڈ میں بدل دیا۔

وارڈ کے دروازے پر پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ عمارت کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک آنے والا اور یہاں سے آگے جانے والا راستہ خالی پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے اس طرف سے کسی کا گزر نہیں ہوا ہے۔ دروازے پر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد میں ڈرا ڈرا سا اندر داخل ہوا۔ اور اندر میں نے وہی دیکھا جو کچھ یادداشتوں میں دکھایا گیا تھا۔ دو الگ الگ بستروں پر وہ دونوں مریض لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید یہ ان کے آرام کا وقت تھا۔ صاف اور سفید چادروں پر لیٹے ہوئے وہ دونوں مریض دو مقدس پیروں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ مریضوں سے اپنی نگاہ ہٹا کر میں نے پورے وارڈ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وارڈ بہت بڑا تھا جس کے ایک حصے کے بیچوں بیچ دیوار سے لگے ہوئے دونوں مریضوں کے پلنگ تھے۔ دوسرے حصے میں ایک میز تھی جس کے ایک طرف تین کرسیاں تھیں اور دوسری طرف ایک بڑی کرسی۔ یہ نرسوں اور معالج کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ مریضوں کے بستروں کے پاس پلنگ کی اونچائی کی ناپ کی الماری تھی جو عموماً دواؤں اور مریضوں کے کھانے پینے کی چیزوں کو رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اسی الماری کے پہلو میں لکڑی کا ایک اسٹول بھی تھا جس کے اوپر کا گول حصہ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ اسٹول پر ایک طرف ایک کوری صراحی رکھی تھی جس کے منھ کو سفید رنگ کے ایک چھوٹے سے جالی دار کپڑے سے ڈھک کر اس پر خوبصورت نقش و نگار والے تانبے کے ایک کٹورے کو اوندھا رکھ دیا گیا تھا۔ اسٹول کے بقیہ حصے پر خوشنما بیل بوٹے والی چینی کی طشتریوں میں کچھ پھل اور میوے رکھے تھے اور وہیں پر ایک نقشی پاندان تھا اور اسی پاندان کے پاس ایک چھوٹا سا آئینہ، جس کی پشت پر کے بیشتر حصے کی پالش اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔ دونوں

مریضوں کے ایک ہی طرح کے ساز و سامان کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وارڈ کا پختہ فرش اگر چہ بہت پرانا تھا لیکن اس کی صفائی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اسے دن میں کئی بار صاف کیا جاتا ہے۔ معالج کی میز پر کچھ شیشیاں تھیں جن میں سے کچھ میں سفوف اور کچھ میں گولیاں تھیں جنھیں دواؤں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ معالج کی میز کے اس حصے پر جدھر اس کی کرسی تھی، کچھ کاغذ قرینے سے رکھے ہوئے تھے جن میں مریضوں کو دی ہوئی اور دی جانے والی دواؤں کی تفصیل تھی اور ان کی روز کی حالتوں کے اندراجات تھے۔

معالج کے آنے اور مریضوں کے بیدار ہونے کا انتظار کرتے کرتے میں نے وارڈ کو اندر سے اچھی طرح دیکھ ڈالا۔ ایسی بے رونقی اور اداسی میں نے بہت کم عمارتوں میں دیکھی تھی۔ وارڈ کے اندر کے حصے کو دیکھ کو مجھے یہ بات بار بار پریشان کر رہی تھی کہ اتنے بڑے حصے میں صرف دو مریضوں کو کیوں رکھا گیا ہے۔ وارڈ کا اچھا خاصا حصہ خالی تھا اور یہ خالی حصہ وارڈ کی ویرانی اور وحشت میں اور اضافہ کر رہا تھا۔ وارڈ کی چھت سے لٹکے ہوئے بہت پرانی وضع کے دو برقی پنکھے ایک خاص طرح کی آواز کے ساتھ اتنے آہستہ چل رہے تھے کہ ان کے پروں پر جمی ہوئی گرد صاف نظر آرہی تھی۔ سکوت اور سناٹے کی اس فضا میں پنکھوں کے پروں کی خاص طرح کی آواز نے ایک عجیب سا خوف پیدا کر دیا تھا۔ مریضوں کے روز کے معائنے کے لیے معالج کے آنے کا وقت قریب آچکا تھا لیکن معالج کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ معینہ وقت کے گزر جانے کے بعد بھی معالج کے نہ آنے سے مجھے پریشانی ہوئی۔ لیکن اسی درمیان دونوں مریضوں کی آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوتے ہی دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مجھے اور پھر دونوں نے ایک ساتھ مجھ سے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

''آپ کا معالج،'' میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔

''ہم اپنے معالج کو پہچانتے ہیں،'' ان میں سے ایک جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ''تم وہ نہیں ہو۔''

''میں آپ کا نیا معالج ہوں،'' اب کی میں نے اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے زور دے کر کہا۔

Scanned with CamScanner

''ہمارے مرض کو پہچانتے ہو؟'' دوسرا مریض بولا۔

''نہیں، ابھی میں نے آپ کو دیکھا ہی کہاں ہے،'' میں نے کہا۔

''دیکھنے کے بعد بھی نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مرض کیا ہے۔''

''لیکن...'' میں کہتے کہتے رکا۔ پھر کہا، ''تشخیص کے بغیر بھی بہت سے مرض ٹھیک کیے جا سکتے ہیں۔''

میری اس بات پر وہ دونوں ہنس دیے۔

''ہمارے پہلے والے معالج کہاں ہیں؟'' پہلے مریض نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

وہ پھر ہنس دیے۔ پھر ایک بولا، ''ہمارے بہت سے معالج بدلے گئے لیکن کوئی ہمارا مرض بتانے میں کامیاب نہیں ہوا۔''

''دیکھیے...'' اب میں نے سچ بتا دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ ''سچ بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا معالج نہیں ہوں۔''

''پھر کون ہو تم؟''

''میں صرف... یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ کے پہلے کے معالجوں نے...'' اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا، ''جو کچھ آپ کے بارے میں لکھا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔''

''لیکن پہلے والے معالج ہیں کہاں؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''کہا نا... مجھے نہیں معلوم، میں نے ان کی یادداشتوں میں آپ کا حال پڑھا ہے۔''

''انھوں نے ہمارے بارے میں کیا لکھا ہے؟''

''وہی جو انھوں نے یہاں دیکھا تھا۔'' یہ بتانے کے بعد میں نے کہا، ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''وہ کیا؟'' دونوں ایک ساتھ بولے۔

''ان معالجوں نے ایک سی بات نہیں لکھی ہے۔''

''ایک سی بات لکھ بھی نہیں سکتے،'' پہلا مریض بولا۔ ''دونوں الگ الگ وقتوں میں آتے

تھے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''آپ کے بارے میں ان کے بیانات الگ الگ ہیں۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ایک معالج کا بیان دوسرے سے مختلف ہے،'' میں نے کہا۔ پھر ان سے پوچھا:

''اچھا یہ بتائیے کہ وارڈ کے دوسری طرف کوئی میدان ہے؟''

''میدان؟'' دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں ایک ساتھ کہا۔ پھر بولے، ''میدان تو کوئی نہیں ہے۔''

''لیکن دوسرے معالج نے اس میدان کا حال لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ دونوں وہاں چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔''

''نہیں ہم کسی میدان ویدان میں نہیں جاتے۔ بستر سے کبھی اترتے بھی ہیں تو اسی وارڈ میں رہتے ہیں۔''

''تو دوسرے معالج کا بیان غلط ہے؟''

''یہ اس کے ذہن کی اپج ہے۔''

''خیر، چھوڑیے ان باتوں کو، یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کے لیے کوئی اور معالج مقرر ہوا؟''

''نہیں۔ مگر ہم نے آج سے تمھیں اپنا معالج مان لیا۔''

''علاج معالجے سے میرا کوئی تعلق نہیں،'' میں نے کہا۔ پھر کہا، ''آپ کہیں تو میں آپ کی تیمارداری کر سکتا ہوں۔''

''ہمیں کسی تیماردار کی ضرورت نہیں ہے،'' ان میں سے ایک بولا۔ پھر بولا، ''معالج ہی ہمارا تیماردار ہے۔''

''اور وہ ابھی مقرر نہیں ہوا،'' میں نے اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کہا۔

''ہو بھی گیا تو کیا فائدہ۔ مرض کا تو ہمارے پتا چلتا نہیں،'' دوسرے مریض نے بہت بیدلی

Scanned with CamScanner

سے کہا۔

''لیکن معالج کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ دوائیں آپ کو دی جاتی ہیں۔''

''دی جاتی ہیں، اور ہم یہ جانے بغیر کہ ہمارا مرض کیا ہے، انھیں استعمال بھی کرتے ہیں،'' پہلا والا بولا۔

''آپ دونوں یہاں کب سے ہیں؟'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن آنے جانے والے بتاتے ہیں کہ جب سے یہ ہسپتال بنا ہے ہم اسی وقت سے یہاں ہیں۔''

''اور آپ کی رہائش؟'' میں نے مزید پوچھا۔

''یہی، جہاں ہم ہیں۔ اور جب تک زندہ ہیں، شاید یہیں رہیں،'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ یہاں آئے کہاں سے؟''

''کہیں سے لایا گیا تھا ہمیں۔ کہاں سے لایا گیا تھا، یہ نہیں معلوم،'' اب کے دوسرا بولا۔

باتوں کے دوران وہ دونوں مریض اپنی دوائیں بھی کھاتے رہے اور دواؤں کی کڑواہٹ کو کم کرنے کے لیے وہ پان بھی کھاتے رہے جو اپنے پاندانوں میں انھوں نے پہلے سے بنا کر رکھ لیے تھے۔

میں بہت دیر تک اُن دونوں مریضوں سے باتیں کرتا رہا اور ان کے معالج کے آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی ان کا معالج نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے چلنا چاہیے، اور یہ سوچ کر جیسے ہی میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، دونوں مریض ایک ساتھ بولے:

''بیٹھو۔ اتنی جلدی کیا ہے''۔

''اب مجھے چلنا چاہیے،'' میں نے کہا۔

''تم یہیں رہ سکتے ہو، ہمارے ساتھ۔''

''لیکن...'' یہ کہہ کر میں نے پورے وارڈ پر اس طرح نگاہ ڈالی جیسے پوچھ رہا ہوں کہ رہوں گا کہاں۔

Scanned with CamScanner

''پڑ رہنا کہیں پر،'' ان میں سے ایک نے کہا۔ پھر دوسرا بولا، ''ہسپتال کے عملے میں سے کسی کو اعتراض ہوگا تو چلے جانا۔''

اور پھر انھوں نے مجھے ایک چٹائی اور ایک تکیہ دے دیا۔ اور اس دن سے میں اسی وارڈ میں رہ کر ان کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور جب مجھے ان کی دیکھ بھال کرتے کرتے کئی دن ہو گئے اور کوئی معالج نہیں آیا اور ان کی دوائیں ختم ہونے لگیں، تو مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ آگے کیا ہوگا۔ جب یہ اندیشہ بڑھنے لگا تو میں نے ان سے کہا:

''معالج نہیں آیا؟''

''آئے گا،'' وہ بولے۔

''دوائیں ختم ہو رہی ہیں،'' میں نے تشویش جتائی۔

''دوائیں ختم ہونے سے پہلے آئے گا، اور دوائیں بھی لائے گا،'' انھوں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''ہم ہسپتال کے کارخانے سے واقف ہیں، یہاں سب کام اسی وقت ہوتے ہیں جب انھیں ہونا چاہیے۔''

''تو معالج آئے گا؟''

''ضرور آئے گا۔''

یہ سن کر میں چپ ہو گیا۔ اب مجھے اس میدان کو دیکھنے کی فکر تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے معالج نے لکھا تھا کہ دونوں مریض اکثر وہاں چہل قدمی کے لیے جایا کرتے ہیں۔ لیکن جب سے میں اس وارڈ میں آیا تھا، یہ دونوں مریض اس میدان کی طرف نہیں گئے تھے۔ میں نے طے کیا کہ میں اس میدان کو اس وقت دیکھنے جاؤں گا جب یہ دونوں مریض آرام کر رہے ہوں گے۔ اور جب ان کے آرام کا وقت آیا، میں دوسرے معالج کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق اس میدان کو دیکھنے نکل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے واقعی ایک میدان نظر آیا لیکن یہ نظر نہیں آیا کہ وہ میدان کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ میدان کہاں ختم ہوتا ہے، میں اس میدان میں

Scanned with CamScanner

بہت دور تک نکل گیا، لیکن میدان کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آیا۔ میدان کا سناٹا دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی اور تب میں نے پلٹنے کا ارادہ کیا۔ اور جیسے ہی میں پلٹا، میں نے دیکھا کہ دونوں مریض میرے آگے آگے چل رہے ہیں۔ میں نے انھیں آواز دی لیکن انھوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر اچانک انھوں نے اپنی سمت بدلی اور اُدھر کا رخ کیا جدھر میدان دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ میں انھیں دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو میں وارڈ کی طرف چل پڑا۔ دیر تک چلنے اور طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد جب میں وارڈ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں مریض اپنے اپنے بستروں پر موجود ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی موضوع بڑی دیر سے چھڑا ہوا ہو۔

''کہاں تھے؟'' مجھے دیکھتے ہی دونوں نے پوچھا۔

''وہیں، جہاں آپ لوگ تھے،'' میں نے جواباً کہا۔

''ہم لوگ... کہاں تھے؟''

''میدان میں۔'' یہ سن کر وہ دونوں ہنس دیے۔

''ہم یہاں سے نکلے ہی نہیں۔''

''لیکن آپ وہاں تھے۔''

''جھوٹ۔''

''آپ وہاں تھے۔ میں نے آپ دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''ہم وہاں نہیں تھے،'' انھوں نے زور دے کر کہا۔ پھر مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا، ''اب اس میدان کی طرف مت جانا۔''

''کیوں؟''

''طلسم ہے۔ اس پورے میدان میں ایک طلسم ہے، اس طرف کوئی نہیں جاتا۔''

''لیکن میں تو گیا۔''

''گئے تو گئے، لیکن آئندہ مت جانا۔''

''لیکن کیوں؟''

Scanned with CamScanner

''ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے، لیکن بتانے والے بتاتے ہیں کہ وہاں ان مریضوں کی روحیں بھٹکتی ہیں جو یہاں صحت یاب ہونے کے لیے آئے تھے۔''

اس کے بعد میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنی چٹائی بچھائی اور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے ان مریضوں کی دواؤں کا خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان مریضوں سے ان کی دواؤں کے بارے میں پوچھتا، میں نے دیکھا کہ ان کے پاس اگلے کئی دنوں کی دوائیں موجود ہیں۔ نئی دوائیں دیکھ کر میں نے ان دونوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر ایک مریض بولا:

''معالج آیا تھا۔''

''کب؟'' میں نے پوچھا۔

''جب تم میدان کی طرف گئے تھے۔''

''آپ دونوں کو دیکھا؟''

''ہاں۔''

''کچھ پتا چلا، مرض کا؟''

''نہیں، چلے گا بھی نہیں۔''

''دوائیں بدلیں؟''

''نہیں، وہی پہلے والی دوائیں ہیں۔''

باتیں کرتے کرتے میں نے محسوس کیا کہ ان مریضوں کے بستروں کی چادریں بہت صاف ہیں۔ انھیں شاید کچھ دیر پہلے بدلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وارڈ میں ہر طرف صفائی تھی اور فرش بھی دھلا دھلایا معلوم ہو رہا تھا۔ مریضوں کے اسٹولوں پر چیزیں بھی سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور معالج کی میز کا سامان بھی قرینے سے لگا تھا۔ اس پر رکھے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ابھی ابھی رکھا گیا ہے۔ میں نے قریب سے ان کاغذوں کو دیکھا تو ان میں مریضوں کی حالتوں کے تازہ اندراجات تھے۔ میں ان اندراجات کو پڑھ سکتا تھا لیکن پڑھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ تحریریں مرض سے متعلق ہیں یا دواؤں سے۔ میں جان لیوا امراض میں دی جانے والی بہت سی دواؤں کے

Scanned with CamScanner

بارے میں جانتا تھا لیکن کاغذوں کے اندراجات میں اُن میں سے کوئی دوا موجود نہیں تھی۔

مریضوں سے باتیں کرنے اور وارڈ کی بدلی ہوئی حالت کا جائزہ لینے کے بعد میں پھر سے اپنی چٹائی پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نے سونے کا ارادہ کیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر بھی میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ چٹائی پر اسی طرح پڑے پڑے اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ رات بہت ہو چکی تھی لیکن دونوں مریض جاگ رہے تھے۔ ان دونوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ مجھے سویا ہوا جان کر وہ دونوں دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے، لیکن میں ان کی سرگوشیاں صاف سن سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنی آئندہ کی زندگیوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ زندگیاں انھیں مر جانے کے بعد ملنے والی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ دونوں ایسی دنیاؤں میں پہنچ گئے تھے جنھیں ان زمینوں پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان دنیاؤں میں وہ سفید لباسوں میں ملبوس ایسے لوگوں کو دیکھ رہے تھے جن کے گرد روشنیوں کے ہالے تھے۔ اور ان دنیاؤں میں وہ ایسے شاداب جنگلوں میں گھوم رہے تھے جن کے درختوں کی شاخوں پر ماہتاب آویزاں تھے۔ اور وہ ایسے باغوں کی سیر کر رہے تھے جن کی نہروں کے شفاف پانیوں میں نیلے آسمان کا عکس صاف نظر آ رہا تھا اور جن میں اڑتی ہوئی پریوں کے سنہرے پروں پر ستارے چمک رہے تھے۔ اور وہ ایسے دریاؤں کے ساحلوں پر کھڑے تھے جن کی خوش رنگ موجوں پر بہتی ہوئی کشتیوں میں سوار لوگ آسمان کی طرف سر اٹھائے خوش لحنی کے ساتھ آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر رہے تھے۔ اور وہ ایسی شاہراہوں سے گزر رہے تھے جن پر آسمان سے وہ پاک پیمبر اتر رہے تھے جن کی عباؤں سے نور برس رہا تھا۔ اور وہ ایسی وادیوں میں چل رہے تھے جن میں نورانی صورتوں والی بیبیاں فروکش تھیں اور ان کی رداؤں پر آفتاب اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔

ان کی گفتگو میں دکھائی ہوئی دنیاؤں کا ہر منظر مجھے بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ان منظروں کی خوشنمائی میں ایسا کھویا کہ مجھے نیند آ گئی۔ گہری نیند کے بعد صبح جب دیر سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سارے بدن میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ چٹائی سے اٹھتے اٹھتے میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کا ہر حصہ دکھ رہا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ اگر یہ تکلیف بڑھی تو میں ان مریضوں کی دیکھ بھال کیسے کروں گا۔ انھیں اپنی دوائیں دوبارہ مل چکی تھیں اور میں نے طے کیا تھا کہ میں انھیں

Scanned with CamScanner

وقت پر دوائیں دوں گا اور انھیں تجویز کی ہوئی غذائیں بھی صحیح مقدار میں صحیح وقت پر دوں گا۔ دونوں مریض بیدار ہو چکے تھے لیکن میں نے ان پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ میں کسی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اپنی پوری قوت لگا کر میں بڑے جتن سے چٹائی سے اٹھا لیکن میرے اٹھتے اٹھتے دونوں مریضوں نے تاڑ لیا کہ مجھے کوئی تکلیف ہے۔

''ٹھیک تو ہو؟'' ایک مریض نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''نہیں، تم جیسے تھے، ویسے نہیں ہو،'' دوسرا بولا۔

''نیند نہیں آئی۔ سر بھاری ہے۔''

''نہیں، کوئی اور بات ہے،'' پہلا والا بولا۔ ''تم ٹھیک سے کھڑے نہیں ہو پا رہے ہو۔''

''ہاں... لگتا ہے کروٹ بدلنے میں... کمر میں چک آگئی ہے،'' میں نے کہا۔ پھر ان کی تشفی کے لیے کہا، ''چلنے پھرنے سے ٹھیک ہو جائے گی۔'' یہ کہتے کہتے میں لڑکھڑا گیا۔ مجھے لڑکھڑاتا ہوا دیکھ کر دونوں مریضوں نے مجھے سنبھالنے کے لیے اپنے اپنے بستروں سے اترنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور لاچاری کے عالم میں میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بولا:

''لیٹ جاؤ، تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔ معالج آیا تو ہم اس سے تمھاری تکلیف بتائیں گے۔''

میں سمجھ چکا تھا کہ میں دیر تک کھڑا نہیں رہ سکوں گا، اس لیے میں پھر چٹائی پر لیٹ گیا۔ میری تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بدن کے کون سے حصے کو دبا کر اپنی تکلیف دور کروں۔ دونوں مریض میری بڑھتی ہوئی تکلیف سے پریشان تھے اور جیسے جیسے میرے منھ سے کراہیں نکلتیں، ان کے چہروں کی رنگت بدلنے لگتی۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے لفظ میرے منھ سے نہیں نکل رہے تھے لیکن آنکھیں بار بار وارڈ کے دروازے کی طرف اس امید میں اٹھ رہی تھیں کہ شاید کوئی معالج اس طرف نکل آئے۔ لیکن کوئی معالج اس طرف نہیں آیا اور میری آنکھیں وارڈ کے دروازے سے لگی کی لگی رہ گئیں۔ اس کے آگے مجھے کچھ یاد نہیں۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے شاید میں بیہوش ہو گیا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے بتایا گیا کہ میں کئی دن تک بیہوش رہا اور میری یہ حالت دیکھ کر

Scanned with CamScanner

اُن دونوں مریضوں کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ جو شخص مجھے یہ باتیں بتا رہا تھا، میں نے اسے معالج سمجھ کر اس سے کہا:

''معالج، تم بہت دیر سے آئے۔''

''معالج نہیں ہوں میں،'' اس نے ذرا غصّے سے کہا۔

''پھر کون ہو تم؟''

''ہسپتال کا ملازم۔ ان دو نئے مریضوں کو یہاں لایا ہوں،'' اس نے اُن بستروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جن پر میں پہلے والے مریضوں کو دیکھا کرتا تھا۔

''اور وہ پہلے والے مریض؟'' میں نے ملازم سے پوچھا۔

''ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''تو پھر میرے بارے میں یہ سب تمھیں کس نے بتایا؟''

''اس معالج نے جو یہاں پہلے والے مریضوں کو دیکھنے آیا تھا۔ اسی نے تم کو بھی دیکھا تھا۔''

ہسپتال کا ملازم یہ کہہ کر وارڈ سے باہر چلا گیا۔ میری تکلیف غائب ہو چکی تھی۔ معالج نے شاید مجھے بیہوشی کی حالت میں ٹھیک کر دیا تھا۔ میں چٹائی سے اٹھا اور ان نئے مریضوں کے قریب پہنچ کر ان سے پوچھا:

''آپ...'' میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑے:

''پہلے ہم یہیں تھے۔''

''اسی ہسپتال میں؟''

''ہاں، ہمیں چلے جانے والے مریضوں کا معالج مقرر کیا گیا تھا۔''

''وہ یادداشتیں...؟''

''ہمیں نے قلمبند کی تھیں۔''

''کیا شکایت ہے آپ دونوں کو؟''

''یہ تو، جو معالج ہمیں دیکھنے آئے گا، وہ بتائے گا۔''

''پہلے والے مریضوں کو کیا شکایت تھی؟''

Scanned with CamScanner

''پتا نہیں چل سکا۔ یہ بات شاید ہم نے اپنی یادداشتوں میں لکھی ہے، اور شاید تم نے پڑھی بھی ہو گی۔''

''پڑھی ہے۔'' پھر میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا، ''پتا نہیں وہ دونوں یہاں سے ٹھیک ہو کر نکلے یا نہیں، یا انھیں اسی حالت میں چھٹی دے دی گئی۔''

یہ سن کر وہ بولے، ''ٹھیک ہو کر نہیں نکلے ہوں گے۔''

یہ سنتے ہی میں وارڈ سے باہر نکل آیا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں ہسپتال سے باہر آنے کے بجاے اس میدان کی طرف چل پڑا جس کے بارے میں دونوں مریضوں نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی طلسم ہے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور میں اس میدان میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے اس میدان میں کچھ منظر دکھائی دینے لگے:

میں سفید لباسوں میں ملبوس ایسے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کے گرد روشنیوں کے ہالے تھے؛ اور میں ایسے شاداب جنگلوں میں گھوم رہا تھا جن کے درختوں کی شاخوں پر ماہتاب آویزاں تھے؛ اور میں ایسے باغوں کی سیر کر رہا تھا جن کی نہروں کے شفاف پانیوں میں نیلے آسمان کا عکس صاف نظر آ رہا تھا اور جن میں اڑتی ہوئی پریوں کے سنہرے پروں پر ستارے چمک رہے تھے؛ اور میں ایسے دریاؤں کے ساحلوں پر کھڑا تھا جن کی خوش رنگ موجوں پر بہتی ہوئی کشتیوں میں سوار لوگ آسمان کی طرف سر اٹھائے خوش لحنی کے ساتھ آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر رہے تھے؛ اور میں ایسی شاہراہوں سے گزر رہا تھا جن پر آسمان سے وہ پاک پیمبر اتر رہے تھے جن کی عباؤں سے نور برس رہا تھا۔ اور میں ایسی وادیوں میں چل رہا تھا جن میں نورانی صورتوں والی بی بیاں فروکش تھیں اور ان کی رداؤں پر آفتاب اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔

میں چلتا جا رہا تھا اور یہ منظر ایک کے بعد ایک میری آنکھوں کے سامنے آتے جا رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم کہ اس طرح چلتے چلتے میں اس میدان میں، جسے اُن مریضوں نے طلسم کا میدان کہا تھا، کہاں تک نکل گیا۔

❊❊

Scanned with CamScanner

اخلاق احمد

مارٹن کوارٹرز کا ماسٹر

ماسٹر کے گھر کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی اندر گلی میں لے جانے سے انکار کر دیا۔

''پچھلی بار کسی نے سالن پھینک دیا تھا صاحب جی،'' اس نے حتی الامکان ادب کے ساتھ کہا۔ ''اور اس سے پچھلی بار تین چھوکرے...''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' منظر نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ چھوکرے کیا ہوتا ہے؟... ذرا دیکھ بھال کر بولا کرو...''

ڈرائیور خاموش بیٹھا رہا۔

ٹائی اور کوٹ سے نجات پا کر منظر کار سے باہر نکل آیا۔ تیز، چبھتی دھوپ اور کراچی کی مخصوص نم ہوا۔ وہ جب بھی ماسٹر سے ملنے آتا تھا، ڈرائیور کسی نہ کسی بہانے ناگواری کا اظہار کر دیتا تھا، اور منظر ہر بار اپنے غصے پر قابو پا لیتا تھا۔ یہ بات بھی اسے ماسٹر نے ہی سکھائی تھی۔ ''غریب آدمی کے غرور پر ناراض مت ہوا کر پیارے،'' اس نے کہا تھا۔ ''سالا غرور کی بیساکھیوں کے سہارے ہی خوش رہنے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔ صاف ستھرے کپڑوں پر، جمعے کی نماز پڑھ لینے پر، گھر میں گوشت پکنے پر، بچے کی سیکنڈ ڈویژن پر، ہر چیز پر اس کی گردن اکڑ جاتی ہے۔ اس پر برا نہیں ماننا چاہیے۔''

گلی کے کونے پر اب ایک نیا احاطہ نظر آ رہا تھا۔ بلاکوں سے بنی دیوار پر پلستر کے بغیر ہی سفیدی کر دی گئی تھی۔ ہر کوارٹر والا زیادہ سے زیادہ جگہ گھیر لینے کی فکر میں تھا۔ قبضے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ پیلے رنگ کے سرکاری کوارٹر ان پھیلتے، بڑھتے احاطوں کے اندر کہیں غائب ہو گئے تھے

Scanned with CamScanner

جہاں اس نے اپنا سارا لڑکپن گزارا تھا۔

وہ بائیں جانب کی پہلی گلی میں مڑ گیا، کسی ارادے کے بغیر۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ یہ گلیاں، یہ علاقہ اسے یوں یاد تھا جیسے ہتھیلی کی لکیریں۔ چالیس برس گزرنے کے باوجود، اتنی تبدیلیوں کے باوجود، وہ ان کوارٹروں کے درمیان تنگ گلیوں میں، گٹر کے ڈھکن پھلانگتا، کیچڑ سے بچتا، نالیوں کو عبور کرتا، یوں آگے بڑھ سکتا تھا جیسے یہیں رہتا ہو۔

ماسٹر کے کوارٹر کا دروازہ اسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا جو گزشتہ بیس برسوں کے دوران بارشوں اور دھوپوں اور میلے ہاتھوں اور گرد کے جھکڑوں کا سامنا کرتے کرتے ایک میلی، بدوضع چادر بن چکا تھا۔

منظر نے پہلے گھنٹی کو دو تین بار دبایا۔ پھر پردہ ہٹا کر دروازہ دھڑدھڑایا۔

لمحہ بھر بعد اندر سے کسی عورت نے کرخت آواز میں پوچھا، ''کون؟''

''قیصر صاحب ہیں؟'' منظر نے بند دروازے کو مخاطب کیا۔ ''میں... منظر ہوں۔''

کرخت آواز نے کہا، ''باتھ روم گیا ہوا ہے۔ ابھی آجائے گا۔''

وہ یقیناً ماسٹر کی بیوی تھی، منظر نے اندازہ لگایا۔ ہر بار وہ ایسی ہی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ماسٹر کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ شاید وہ عادی ہو گیا ہوگا۔ آدمی پچاس سال کی عمر تک ہر زیادتی کا عادی ہو جاتا ہے۔

منظر نے کوارٹروں کی قطار پر نگاہ ڈالی۔ ماسٹر کا کوارٹر سب سے خستہ حال نظر آتا تھا۔ چالیس سال پہلے کون سوچ سکتا تھا کہ... مگر چالیس سال پہلے سوچنے کی فرصت ہی کس کے پاس تھی۔ منظر نے میلے پردے کو دیکھا اور دل ہی دل میں ہنسا۔ چالیس سال پہلے تو زندگی کا ذائقہ ہی کچھ اور تھا۔ ماسٹر کی اماں کے زمانے میں ایسا میلا پردہ کوارٹر کے قریب بھی نہیں آسکتا تھا۔ چپلیں صحن میں اتارنی پڑتی تھیں اور کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ پلنگوں پر بے داغ سفید چادریں، چوڑی چوڑی لال نیلی پٹیوں والی بڑی دری، تام چینی کی پلیٹیں اور مٹی کی ہانڈی سے اٹھتی گرم شوربے کی خوشبو۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور ماسٹر نمودار ہوا۔

Scanned with CamScanner

وہ پہلے سے زیادہ کمزور لگ رہا تھا اور اس کے دبلے پتلے سیاہی مائل چہرے پر ہڈیاں بھی زیادہ ابھری ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ایک پر جوش توانائی تھی۔

''ابے اتوار کے روز؟'' ماسٹر ہنسا۔ ''اتوار کو تو تجھے ہفتے بھر کی کمائی کا حساب کرنا ہوتا ہے، سیٹھ۔''

وہ گلے ملا تو منظر نے اس کے لاغر جسم کی ہڈیوں کی چبھن محسوس کی۔

''جاہل ماسٹر، سیٹھ لوگ کوئی کام نہیں کرتے۔ ملازم کرتے ہیں سارا حساب کتاب۔''

ماسٹر نے قہقہہ مارا۔ ''کیا فٹ بات کہی ہے پیارے۔ خوش رہ۔''

پھر وہی گلیوں کا سفر تھا۔ کوارٹروں کے سینے میں اندر اترتی گلیاں۔ ماسٹر نے برسوں سے... بیس پچیس برس سے کبھی اسے گھر کے اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ ہر بار وہ اسی طرح چل پڑتے تھے۔ منظر نے کبھی اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا، بچوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ ماسٹر کا ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ بیٹا بجلی کمپنی میں ملازم ہو چکا تھا۔ بیٹی شاید بی اے کر چکی تھی۔ کبھی کبھی منظر کو یہ سب بہت عجیب لگتا تھا۔ چالیس برس پرانے دوست، جو ایک دوسرے کے گھر والوں کی صورتوں سے آشنا نہ تھے۔

نیم دائرے میں گھومتی پتلی گلی ختم ہوئی تو صلاح الدین ایوبی ہوٹل آ گیا۔ دیوار پر ایک بہت بڑے فریم میں صلاح الدین ایوبی کا پوسٹر آویزاں تھا: گھوڑا، تلوار اور صلاح الدین ایوبی۔ تصویر کے سارے رنگ اڑ چکے تھے اور صلاح الدین ایوبی کی تلوار اب ایک سرمئی ڈنڈے جیسی لگتی تھی۔ ساتھ ہی ایک پوسٹر شاہ رخ خان کا تھا، ایک ادھوری دِکشت کا۔ اور دو چھوٹے فریم: ''یہاں ملازمین کو روزانہ اجرت دی جاتی ہے'' اور ''ہوٹل میں بیٹھ کر سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔'' کرسیاں وہی پرانی تھیں، اور میزیں بھی۔

کاؤنٹر کے پیچھے سے ایوب کالا نکل آیا۔ ''آؤ آؤ، آج تو شہزادہ آیا ہے... بڑے دن بعد شکل دکھائی ہے بھئی...''

''بس یار، کام دھندے میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا کریں...''

ایوب کالا بولا، ''صحیح کہہ رہا ہے تو... اس سسرے شہر میں ہر شخص پھنسا پڑا ہے۔ اور تو تو پھر

بھی سال چھ مہینے میں آ جاتا ہے۔ اپن تو نکل ہی نہیں پاتے ہیں اس کتے کام سے۔ اچھا اور بتا، کیا حال ہے؟ سنا ہے بڑا ٹائٹ قسم کا ہوٹل بنالیا ہے تو نے؟ ... بڑا وا لا لونڈا بتا رہا تھا ایک دن۔ دوستوں کے ساتھ گیا تھا تیرے ہوٹل۔"

"کب؟" منظر نے کہا۔

"دو تین مہینے پہلے۔ بتا رہا تھا، ایک سے ایک گاڑیوں کی لائنیں لگی رہتی ہیں۔ میں نے پوچھا، منظر چچا سے ملا کہ نہیں؟ تو ٹال گیا۔ بولا، وہ شاید تھے ہی نہیں۔ میں نے کہا، ابے وہ تیری طرح نہیں ہے کہ اپنے ہوٹل پر نہ بیٹھے۔ یوں کہہ کہ تجھے شرم آ رہی تھی سلام کرتے ہوئے۔ خوب سنائیں سالے کو..."

ماسٹر نے کہا، "زیادہ مت سنایا کرو لاد کو۔ کسی دن جواب مل گیا تو چھٹی ہو جائے گی۔"

ایوب کالا ساکت کھڑا رہ گیا۔

ماسٹر اِن ایکشن۔ منظر مسکرایا۔ سالا جملہ نہیں، بھالا مارتا ہے۔

کاؤنٹر کی طرف جاتے جاتے ایوب کالا دھیمی آواز میں بولا، "تھوڑی بہت تو سنانی پڑتی ہیں یار..."

دور ایک میز پر کچھ مزدور ٹائپ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے ساتھ والی میز پر تین لڑکے سر جوڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور کنکھیوں سے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ منظر جانتا تھا، وہ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ انھی کوارٹروں سے اٹھ کر دولت مند بن جانے والا شخص، جو اپنے ماضی کو نہیں بھولا۔ اس کے ہوٹل اور اس کی گاڑی اور اس کی شان و شوکت کے بارے میں مبالغہ آمیز انکشافات۔ "ابے، چونتیس کے ایک میں رہتا تھا، دوسری والی گلی میں۔ ابا بتاتے ہیں، پڑھائی میں بہت تیز تھا۔" ان کوارٹروں میں رہنے والے ہیروز کی تلاش میں رہتے تھے۔ مشہور لوگ، مقبول لوگ، جو کئی دن تک گفتگو کا موضوع بن سکیں۔ خود منظر کو آج تک بہت سے لوگ یاد تھے۔ ٹی وی کا اداکار ظہور احمد تھا جو اپنے بھائی سے ملنے آتا تھا۔ اور گلوکار ایم کلیم، جو ذرا آگے رہتا تھا۔ برسوں پہلے ایک شام کرکٹر نذیر جونیئر نے ان کی پچ پر بالنگ کرائی تھی: سرخ گیند کی ناقابلِ یقین آف اسپن۔ پھر ریڈیو پاکستان کا وہ صداکار اور گلوکار تھا، صادق الاسلام۔ منظر کو سب لوگ یاد تھے، اور وہ جوش و خروش

Scanned with CamScanner

بھی، جوان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے سب چہروں پر رقص کرتا تھا۔

ماسٹر نے دو مسکہ بند منگوائے، اور دودھ پتی۔

''مجھے پتا ہے،'' ماسٹر نے کہا، ''تیری جان نکل رہی ہوگی مسکہ بند دیکھ کر۔ تجھے اپنا کولیسٹرول یاد آ رہا ہوگا جس کی وجہ سے تو صبح دوپہر شام گھاس کھاتا رہتا ہے۔ پر جانِ من، یہ نرم، ملائم بند اور یہ نیوٹاؤن مکھن کی تہہ اور یہ گرم چائے... اسے کھائے بغیر زندہ رہنا زندگی تو نہیں ہے۔''

منظر ہنسا۔ ''تیس سال پہلے تو کلیجی کے بارے میں یہی کہتا تھا۔ وہ جو توے پر بھون کر...''

''ابے ہاں!'' ماسٹر نے کہا۔ ''وہ بھی طوفان ہوتی تھی یار...''

''اور اس سے پہلے یعقوب بھائی کے گولے گنڈے کے بارے میں...''

ماسٹر نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تجھے تو بیوی ہونا چاہیے تھا۔ اتنی پرانی باتیں پوری کمینگی کے ساتھ یاد رکھتا ہے تو۔ یا پھر تاریخ دان ہونا چاہیے تھا...''

''تاریخ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گی، ماسٹر!'' منظر نے کہا۔ ''تو نے میری زندگی کا پہلا کالا چشمہ توڑ دیا تھا۔ ماموں امریکہ سے لائے تھے وہ چشمہ۔''

''تیرے ماموں خالی ہاتھ آئے تھے امریکہ سے۔ بولٹن مارکیٹ سے خریدے تھے سارے تحفے انھوں نے۔ اور تاریخ تجھے بھی معاف نہیں کرے گی بیٹا! تو نے میرا نام ماسٹر رکھا تھا۔ تو جلتا تھا مجھے ہر وقت پڑھتا لکھتا دیکھ کر۔ آج ساری دنیا مجھے ماسٹر کہتی ہے، ایک اپر ڈویژن کلرک کو۔ گلی کے لونڈے ماسٹر صاحب کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ اور مجھے اندھا مت سمجھ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تو میرے مسکہ بند کا چھوٹا والا پیس کھا رہا ہے...''

کوئی تازگی کی لہر تھی جو منظر کو شرابور کرتی جاتی تھی، مہینوں کا زنگ اتارتی جاتی تھی، بے کیفی کا اور پژمردگی کا اور اداسی کا زنگ۔ ایک مرجھایا ہوا پودا انگڑائی لے کر کوئی سرسبز چولا پہن رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا۔ چھ سات ماہ کے دوران پہلا بھرپور قہقہہ۔

''اچھا، اب بات بتا،'' ماسٹر نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ ''کیا پریشانی لاحق ہے تجھے؟''

منظر دم بخود رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا، ''ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے...''

ماسٹر نے کہا۔ ''دو طرح کی ہوتی ہیں پریشانیاں۔ ایک تو روزمرہ کی پریشانی ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

جیسے میں پریشان ہوں کہ بجلی کا بل زیادہ آ گیا ہے، اس کی قسطیں کرانی ہیں۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے سالانہ انکریمنٹ رکوادی ہے۔ موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر بالکل ختم ہو چکا ہے۔ یا جیسے تو پریشان ہوتا ہوگا۔ ایکسائز والا زیادہ رشوت مانگ رہا ہے۔ ڈرائیور پٹرول کی جعلی رسیدیں لا رہا ہے۔ بالٹی گوشت بنانے والا کاریگر بھاگ گیا ہے۔ یہ پریشانیاں تو عام پریشانیاں ہیں۔ ان پر ٹائم ضائع کرنا بیکار بات ہے۔ پر تیرا منھ بتا رہا ہے کہ معاملہ کوئی بمباٹ ٹائپ کا ہے۔ ملا ہاتھ۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا؟"

منظر کو دس برس پرانی بات یاد آئی۔ ماسٹر نے اُس وقت بھی اس کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ معاملہ سنگین ہے۔ خلع کا مطالبہ واقعی سنگین معاملہ تھا، اور بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ماسٹر نے اسے پسپا ہو جانے کا مشورہ دیا تھا، جس پر منظر بھڑک اٹھا تھا۔ ماسٹر کی باتوں نے اس کے دل میں گہری خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس نے کہا تھا، "غلطی تیری ہے پیارے، تیرے انجن کی ٹیوننگ ایک دم آؤٹ ہے۔ تو غریب آدمی ہے جسے مقدر نے دولتمند بنا دیا ہے۔ اور وہ خاندانی امیر ہے جسے پیسہ بے دردی سے خرچ کرنے کی اور آزاد رہنے کی اور اپنی مرضی چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اب کوارٹر میں نہیں رہتا، تجھے ان پیسے والوں کے رنگ ڈھنگ سیکھنے ہوں گے، کیونکہ تجھے اب وہیں رہنا ہے۔ برداشت کرنے کی عادت ڈال، سمجھا؟ اور آنکھیں بند رکھنے کی بھی۔ ورنہ منھ کے بل گرے گا اور سب تالیاں بجائیں گے۔ اس بیوی کو چھوڑ دے گا تو دوسری کیا آسمان سے لائے گا؟ وہ بھی ایسی ہی ہوگی۔ انھی بنگلوں سے آئے گی..." اور بھی بہت کچھ کہا تھا ماسٹر نے۔ کڑوی باتیں۔ زہر میں بجھے جملے...

ماسٹر نے کہا۔ "کیا سوچ رہا ہے بے؟"

"سوچ رہا ہوں تو کتنا..."

ماسٹر ہنسا۔ "سب یار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یار کی نظر صرف نظر نہیں ہوتی پیارے، ایکسرے ہوتی ہے۔"

کبھی کبھی منظر کو ماسٹر کی باتوں پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا: کھرا اور دانشمند۔ یہ دانائی اس نے صرف زندگی سے حاصل نہیں کی تھی، ان بوسیدہ سیکنڈ ہینڈ کتابوں سے بھی جمع کی تھی جو ریگل چوک پر ہر چھٹی کے دن فروخت ہوتی تھیں۔ مقدر نے اسے ایک سرکاری محکمے کا یوڈی سی بنا دیا تھا اور تنگ دستی نے اسے سنبھلنے کا اور سکھ کا سانس لینے کا موقع ہی نہ دیا تھا، مگر ماسٹر نے کبھی

ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

منظر نے کہا۔ ”مسئلہ ماہ نور کا ہے یار...“

ماسٹر اچھل پڑا۔ ”گڑیا کا؟ اسے کیا ہوا؟“

”اسے کچھ نہیں ہوا اسے،“ منظر نے کہا۔ ”بس، ٹینشن کھڑی کر رکھی ہے اس نے۔“

ماسٹر نے کہا، ”بیٹیاں تو ساری عمر کی ٹینشن ہوتی ہیں پیارے۔ جانتا ہے کیوں؟ کیونکہ ہم ان سے محبت کرنا نہیں چھوڑتے۔ وہ شادیاں کر لیتی ہیں، بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں، ان کے بچے جوان ہو جاتے ہیں، مگر سالی ٹینشن ختم نہیں ہوتی۔ خیر، تو بڑا ہو گا تو سب سمجھ جائے گا۔“

منظر نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یار، تو تقریر کر لے پہلے...“

ماسٹر نے گھبرا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اچھا میرے باپ... اب نہیں بولوں گا... چل، آگے بتا۔“

”وہ شادی کرنا چاہتی ہے،“ منظر نے کہا۔ ”ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے اس نے گھر میں۔ تین دن سے کسی سہیلی کے گھر پر ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ گریجویشن کرے۔ پھر سال دو سال کے لیے انگلینڈ چلی جائے اور ماسٹرز کرے۔ مگر اس کے دماغ پر شادی کا بھوت سوار ہے...“

ماسٹر بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ کسی پتھر کے بت کی طرح۔

منظر نے کہا۔ ”لڑکا اس کا کلاس فیلو ہے۔ چوڑی دار پاجامے جیسی پتلونیں پہنتا ہے۔ ہاتھوں میں رنگ برنگے کڑے۔ لپ اسٹک لگاتا ہے۔ ایک دم زنانہ۔ فیملی بہت پیسے والی ہے۔ باپ نے پچیس سال پہلے لائٹ ہاؤس پر دکان کھولی تھی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ لنڈا بازار میں۔ پرانے کپڑے بیچتا تھا۔ اب بھی یہی کام چل رہا ہے لیکن بہت بڑے پیمانے پر۔ پورے پورے کنٹینرز آتے ہیں پرانے کپڑوں کے۔ ادھر حاجی کیمپ میں ان کے دو بہت بڑے ویئر ہاؤس ہیں۔ سارے مال کی چھانٹی ہوتی ہے۔ خراب مال کراچی کی مارکیٹ میں، اور ستھرا مال جاتا ہے بنکاک، ہانگ کانگ اور نہ جانے کہاں کہاں...“

ماسٹر بدستور ساکت بیٹھا تھا۔

Scanned with CamScanner

منظر نے کاؤنٹر کی جانب دیکھا اور اشارہ کیا۔ ذرا سی دیر میں ایک بچہ ان کے سامنے دو کپ چائے پٹخ کر چلا گیا۔

ماسٹر بولا، ''بس؟ یا ابھی باقی ہے اسٹوری؟''

منظر نے گرم چائے کا گھونٹ بھر کر کہا، ''تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے یار۔ میں کوئی تنگ دل، تنگ نظر باپ نہیں ہوں۔ مگر لبرل ہونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کوئی باپ اولاد کی... اور پھر بیٹی کی دھمکیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ...''

ماسٹر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ''اسٹوری کو خواہ مخواہ پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ میں سمجھ گیا ہوں تیری بات۔''

منظر کو ماسٹر کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی جو کہ خفگی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

ماسٹر چھت کو دیکھتا رہا اور اپنی لمبی، سانولی انگلیوں سے میز پر طبلہ بجاتا رہا، یوں جیسے کہیں دور بجتی کوئی دھن سن رہا ہو۔ مگر منظر جانتا تھا کہ وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔

ہوٹل کے کچن سے ایک چھناکے کی آواز آئی۔ شاید برتن دھونے والے لڑکے نے کوئی کپ توڑ دیا تھا۔

کاؤنٹر پر بیٹھا ایوب کالا چلایا، ''توڑ دے! سارے برتن توڑ دے! تیری ماں جہیز میں لائی تھی نا؟ سب توڑ دے۔''

ماسٹر جیسے کسی گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے کہا، ''دیکھ پیارے، کچھ باتیں تو تیری بالکل چڑیوں والی ہیں۔ چڑیا سمجھتا ہے نا؟ لڑکا زنانہ ٹائپ ہے تو کیا ہوا؟ آج کل یہی چل رہا ہے۔ بالیاں پہنتے ہیں لڑکے۔ اور چوڑیوں جیسے کڑے اور ایک دم ٹائٹ قمیض۔ بیوٹی پارلر جاتے ہیں۔ ٹائم بدل گیا ہے میری جان۔ یاد ہے تجھے، ہم لوگ بیل باٹم پتلونیں پہنا کرتے تھے؟ چوبیس انچ کا پائینچا۔ سالی پتلون غرارہ لگتی تھی لیکن ہم سارے شہر میں اکڑ کر پھرتے تھے۔ پھر جینز آ گئی تھی۔ اپن اسی لائٹ ہاؤس سے خریدتے تھے۔ ہاتھ پیر پھولے ہوئے ہوتے تھے کہ کوئی جاننے والا نہ دیکھ لے۔ تیرے ابا نے تو ایک دفعہ تیری جینز اور پرنٹڈ قمیضوں کو آگ بھی لگائی تھی...''

Scanned with CamScanner

''ہاں ہاں، آگے بول!'' منظر نے کہا۔ ''داستانیں سنانے بیٹھ جاتا ہے سالا۔''

ماسٹر ہنسا۔ ''برا لگ رہا ہے نا؟ گڈ۔ بلکہ ویری گڈ۔ دل خوش ہوگیا۔ اچھا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر لڑ کے کا باپ پہلے لنڈے کے کپڑے بیچتا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آج کروڑ پتی تو بن گیا ہے نا۔ اور تو خود کیا تھا؟ تیرے گھر میں اتوار کے اتوار گوشت پکتا تھا۔ کالج میں تیرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ناولٹی سینما میں سب سے اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر فلمیں دیکھتا تھا تو۔ یاد ہے نا؟ یا بھول گیا ہے؟''

منظر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

ماسٹر نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی، گردن کھجائی اور بولا، ''تو نے بتایا نہیں لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ تو نے گھر میں لفڑا کیا ہے۔ اسٹوری تو یہ سنا رہا ہے کہ گڑیا نے گھر میں ہنگامہ کر رکھا ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہنگامہ خود تو نے کیا ہے۔ ابے تو سمجھتا کیوں نہیں ہے؟ وہاں نہیں چلتی یہ مار دھاڑ، چیخ پکار۔ یہاں کوارٹروں میں ٹھیک ہے...''

منظر نے بیزاری سے کہا، ''پھر؟''

ماسٹر نے ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''پھر یہ کہ تجھے عقل سے کام لینا ہوگا۔ اب یہ مت پوچھنے بیٹھ جائیو کہ عقل کہاں سے آئے گی۔ دیکھ، گڑیا ابھی غصے میں ہے اور نا سمجھ ہے۔ لیکن وہ جوان بھی ہے اور... اور بیٹی بھی ہے۔ باپ کے لیے سب سے مشکل کام بیٹی کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ جانتا ہے کیوں؟ کیونکہ بیٹی میں اس کی جان ہوتی ہے۔ سالا اتنی محبت کرتا ہے بیٹی سے کہ عقل سے بالکل پیدل ہو جاتا ہے۔ دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے مگر بیٹی کی بات آجائے بیچ میں، تو خچر کی طرح ہنہنانے لگتا ہے، دولتیاں جھاڑنے لگتا ہے۔ سچی بات بتاؤں؟ تیرا یہ جو چہرہ ہے نا، یہ تھوڑا تھوڑا خچر جیسا ہو گیا ہے...''

منظر نے جسم و جاں کی پوری قوت کے ساتھ پھٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پایا اور کرسی سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا رہا۔ ماسٹر کو سیدھے راستے پر رکھنے کے لیے اس سے اچھی تکنیک کوئی نہیں تھی۔

ماسٹر مسکرایا، یوں جیسے مقابلہ کرنے والے کسی اچھے کھلاڑی کو داد دے رہا ہو۔ پھر اس نے

Scanned with CamScanner

کہا، ''دو کام بتاتا ہوں تجھے۔ سمجھ لے، دو وارداتیں کرنی ہیں۔ پہلے ایک واردات، پھر دوسری۔ سمجھ رہا ہے نا؟''

منظر نے سر ہلایا۔

ماسٹر نے کہا، ''پہلی واردات تو آج ہی کر ڈال۔ گھر جا کر بیوی سے کہہ کہ تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ایک دم دیو داس والی ایکٹنگ چاہیے، سمجھا؟ پھر بیوی کو ساتھ لے کر گڑیا کے پاس جا۔ آج رات ہونے سے پہلے پہلے گڑیا کو گھر میں ہونا چاہیے۔ دونوں کو بتا دے کہ تجھے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ گڑیا شادی سے پہلے ماسٹرز کرے گی۔ بس، اس چھوٹی سی شرط پر اڑ جا۔ جانتا ہے، کیا فائدہ ہوگا اس سے؟''

''ہنگامہ دو تین سال کے لیے ٹل جائے گا،'' منظر نے سوچتے ہوئے کہا۔

ماسٹر ہنسا۔ ''عقل کے گھوڑے، اس سے بھی بڑا فائدہ ہوگا۔ دو تین سال میں گڑیا تھوڑی اور سمجھدار ہو جائے گی۔ ظالم باپ کی مخالفت ختم ہو گی تو وہ اپنی آنکھوں پر لگا ضد کا چشمہ اتار دے گی۔ جوانی میں سب اڑیل گھوڑے ہوتے ہیں میری جان۔ اپن بھی ایسے ہی تھے۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور دو تین سال میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔ گڑیا پڑھے گی تو اس کی آنکھیں کھلیں گی۔ وہ بے شمار لوگوں سے ملے گی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ ابھی وہ بس اس لونڈے کو دیکھ رہی ہے۔ تیرا کام ہے اسے دائیں بائیں، اوپر نیچے دیکھنے کے قابل بنانا۔ بغیر لفڑا کیے یہ سمجھانا کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ تو جانتا ہے نا کہ ان کوارٹروں کے آگے بھی زندگی ہے؟ صاف ستھرے علاقے ہیں اور بنگلے ہیں اور لشکارے مارتی گاڑیاں ہیں۔ اور ان سے بھی آگے دبئی ہے اور امریکہ ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ یہ سب کیسے پتا چلا تجھے؟ تو اس کنویں سے نکلا تبھی پتا چلا نا؟ گڑیا بھی نکل جائے گی اپنے کنویں سے۔ تھوڑا ٹائم دے اسے۔ اور لسی پینا شروع کر، تا کہ تیرے دماغ کی گرمی کم ہو۔ سمجھا؟''

منظر نے سر کھجا کر کہا، ''ویسے میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ...''

ماسٹر نے کہا، ''ابے تو کیا، تیرا پورا خاندان یہ نہیں سوچ سکتا۔ ایک ایک کو جانتا ہوں میں۔''

باہر دھوپ ڈھلنی شروع ہو گئی تھی۔

منظر نے کہا، ''ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ میں کبھی بھی اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا۔ آدمی اپنی

زندگی کو، اپنے فیصلوں کو غیر جانبداری سے نہیں دیکھ سکتا۔''

ماسٹر نے ایک انگڑائی لی، انگلیاں چٹخائیں اور بولا، ''کیونکہ تو ایک گھامڑ آدمی ہے لہٰذا تو کبھی نہیں پوچھے گا کہ پیارے بھائی، وہ دوسری واردات کیا تھی؟ لہٰذا میں خود ہی بتا دیتا ہوں تجھے۔ دوسری واردات یہ ہے کہ اگر دو تین سال بعد بھی گڑیا اپنے مطالبے پر قائم رہے اور وہ لونڈا بھی ڈٹا رہے تو تجھے وہ کرنا ہے جو ہر عقلمند باپ کرتا ہے... یعنی ان دونوں کی شادی!''

''شادی؟'' منظر نے کہا، ''مگر...''

''ہاں بیٹا، شادی!'' ماسٹر نے کہا۔ ''تین سال بعد تجھے پورا ڈراما کرنا ہوگا، اتنی خوشی کا اظہار کرنا ہوگا کہ سب حیران رہ جائیں۔ گڑیا بھی اور تیری بیوی بھی اور دونوں خاندان بھی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ کوئی پنگا نہیں کرنا ہے۔ پنگا کرے گا تو تیرا انجام وہی ہوگا جو پشتو فلموں میں ولن کا ہوتا ہے۔ باپ کو زندگانی ایسے ہی گزارنی ہوتی ہے شہزادے، ٹوپی ڈراما چلائے رکھنا ہوتا ہے۔ ٹوپی ڈراما سمجھتا ہے نا؟ اولاد کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ ہر وقت مسکرانا پڑتا ہے۔ اکا دکا کوششیں کر لیتا ہے آدمی، اور بس۔ کوئی گڑیا سمجھ جاتی ہے، کوئی نہیں سمجھتی۔ آدمی سالا کیا کر سکتا ہے؟''

منظر کے دل میں کچھ کہنے کی آرزو بہت شدید تھی مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماسٹر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ اندر بھڑکتی اشتعال کی آگ بالآخر بجھ جائے گی۔ تب شاید سب کچھ اسی طرح ہوگا جیسا صلاح الدین ایوبی ہوٹل میں گزرنے والی اس نرم، روپہلی دوپہر میں، اس آشنا، جانے پہچانے ماحول میں اور پرانی یادوں کے رس میں لتھڑی اس خوشگوار ملاقات میں انھوں نے سوچا تھا۔

سات آٹھ ماہ بعد منظر نے پھر اس دروازے پر دستک دی، میلے، بدوضع پردے کی اوٹ میں چھپے دروازے پر۔

کچھ دیر بعد اندر سے وہی کرخت آواز آئی، ''کون ہے؟''

''وہ... قیصر صاحب ہیں؟ میں منظر ہوں۔''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ منظر کسی بدتہذیبی کا انتظار کرتا رہا۔

Scanned with CamScanner

اندر سے کچھ گھسیٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیسے کوئی کرسی یا کوئی پلنگ کھسکایا جا رہا ہو، یا کچھ اور۔ منظر دل ہی دل میں مسکرایا۔ ہو سکتا ہے بیوی نے ماسٹر کو باندھ کر ڈال دیا ہو... اور اب اسے گھسیٹ کر دروازے تک لا رہی ہو۔

پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی، اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔

ماسٹر کی بیوی نے دروازے کی اوٹ سے کہا، ''اندر آ جاؤ...''

ایک لمحے کے لیے منظر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اندر آ جاؤ؟ کیا مطلب ہے؟ اندر کیوں آ جاؤ؟ کیا... کیا ماسٹر بیمار ہے؟

ادھ کھلے دروازے سے اس نے ماسٹر کی بیوی کو چادر سنبھالتے، چپلیں گھسیٹتے، اندر جاتے دیکھا۔

اندر وہی بو تھی، ہوا سے اور دھوپ سے محروم گھروں کی بو۔ اور وہ بے ترتیبی بھی، جس کی منظر کو توقع تھی۔ دیواروں پر اور چھت پر سفیدی کی پپڑیاں جو رفتہ رفتہ ٹوٹ کر گرنے کے لیے تیار تھیں۔

منظر کسی مشینی آدمی کی طرح آہستہ آہستہ آگے چلتا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم۔ ہر طرح کے احساس سے عاری۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا جہاں دو تین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور آگے دو کمرے، جو نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ برآمدے کے کونے میں نل کے پاس میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ منظر آخری بار اس گھر کے اندر اس وقت آیا تھا جب ماسٹر کی اماں کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا اور محلے کی عورتیں زار و قطار رو رہی تھیں۔

''قیصر... کہاں ہے؟'' منظر نے پوچھا اور اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر حیران ہوا۔

''وہ چلا گیا... تمھارا ماسٹر...'' ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ وہی کرخت آواز۔ اس نے چادر کو یوں لپیٹ رکھا تھا کہ صرف اس کا سانولا چہرہ نظر آتا تھا۔ ''اب تو چھ مہینے ہونے والے ہیں...''

''کہاں چلا گیا؟'' کسی اختیار کے بغیر منظر نے پوچھا۔

ماسٹر کی بیوی نے دبی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا، ''کہاں چلے جاتے ہیں لوگ؟ وہیں چلا گیا ہے وہ... اتنی سیدھی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟... رانی کو مار کے چلا گیا ہے... لالوکھیت کی کسی قبر میں جا کے سو گیا ہے سؤر کا بچہ...'' وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

Scanned with CamScanner

منظر کو محسوس ہو رہا تھا کہ زمین شق ہوتی جا رہی ہے اور وہ کرسی سمیت اندر دھنستا جا رہا ہے۔ کوئی بھنور تھا جو ایک جنونی رفتار سے اسے گھمائے جا رہا تھا، گھمائے جا رہا تھا...

نہ جانے ماسٹر کی بیوی نے خود پر کب قابو پایا۔ نہ جانے وہ خود سوچنے سمجھنے کے قابل کب ہوا۔ منظر کو بس یہ یاد تھا کہ وہ ہلنے جلنے کی قوت سے محروم بدن کے ساتھ کرسی پر ترچھا پڑا ہوا تھا اور اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

ماسٹر کی بیوی چادر لپیٹے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

"... میں نے اس سے کہا تھا کہ رشتہ برا نہیں ہے... لڑکا درزی کے پاس کام کرتا ہے تو کیا ہوا... کل اپنی دکان کھول لے گا... پھر رانی کو بھی پسند تھا وہ لڑکا... مگر ماسٹر کہنے لگا، بی اے پاس بیٹی کو میٹرک پاس سے بیاہ دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے... ابھی جلدی کیا ہے... رانی کو ڈانٹا اس نے... کہنے لگا، جس دن وہ اپنی دکان کھول لے گا، اس دن بات کرنا... اس سے پہلے نہیں... بات تو خیر ٹھیک تھی۔ میں نے بھی اس رات یہی سوچا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن رانی نے کچھ اور ہی سوچ لیا تھا۔ میں فجر میں اٹھی تو رانی کی... رانی کی لاش پنکھے سے لٹک رہی تھی اور..." وہ چادر میں منہ چھپا کر پھر رونے لگی۔

منظر نے سر جھٹک کر دماغ پر چھائی دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ سب کچھ غیر حقیقی لگ رہا تھا، جیسے ابھی آنکھ کھل جائے گی، جیسے ابھی ماسٹر کی بیوی اور یہ بوسیدہ گھر اور یہ پورا نظارہ پلک جھپکتے میں غائب ہو جائے گا۔

ماسٹر کی بیوی نے خود پر قابو پا کر کہا: "میں پاگلوں کی طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی، چلّا رہی تھی... میرے بیٹے کا بھی برا حال تھا... مگر وہ چپ تھا... تمھارا ماسٹر... میں نے اسے بھی گالیاں دیں... گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے... مجھے عورتیں گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے آئیں... پولیس آ گئی تھی... محلے والوں نے ہی سب کچھ بھگتا..."

آہستہ آہستہ منظر کے بدن میں دوڑتی سنسناہٹ کم ہوتی جا رہی تھی، اعصاب قابو میں آتے جا رہے تھے۔ لیکن ایک تھکن تھی جس نے اسے بدستور جکڑ رکھا تھا۔

ماسٹر کی بیوی کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں اور آنکھوں میں زندگی کی سب سے

بڑی ہار کا اعتراف۔

منظر نے کہا۔''اور... ماسٹر... ؟''

ماسٹر کی بیوی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا،''دو دن رہ سکا وہ... میں بے غیرت تھی، جھیل گئی ... مگر اس کو بیٹی کا دکھ ساتھ لے گیا... سانس کا اٹیک ہو گیا تھا اسے... منھ کھول کر سانس لیتا تھا اور اس کے سینے میں سے ایسی آوازیں آتی تھیں کہ بس... ڈاکٹروں نے ٹیکے بھی لگائے... دم والا پانی بھی منگوایا میں نے... مگر اس کی حالت بگڑتی گئی... آخر میں تو دماغ پلٹ گیا تھا اس کا... ہنسنے لگا تھا زور زور سے... چھت کو دیکھ کر کہنے لگا تھا، مولا، پہلی واردات ہی غلط کرادی... بار بار کہتا رہا یہی... میں سمجھ گئی تھی کہ اب وہ بچے گا نہیں... پھر وہ... پھر وہ...''

منظر اس کی ہچکیاں سنتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ماسٹر کا چہرہ تھا اور اس کے دامن میں ہزاروں لاکھوں یادیں تھیں اور اس کے سامنے برباد ہو جانے والا یہ گھر تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پانچ، دس منٹ۔ یا آدھا گھنٹہ۔

ماسٹر کی بیوی نے چونک کر کہا،''معاف کرنا... میں چائے...''

منظر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔''نہیں۔''

ماسٹر کی بیوی نے کہا۔''بیٹے نے فون کیا تھا تمھارے ہوٹل کے نمبر پر... سوئم کے بعد... میں نے ہی ڈھونڈ کر نکالے تھے کچھ نمبر... وہ تمھارا بہت ذکر کرتا تھا... شاید تم تک خبر نہیں پہنچی...''

منظر اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ کارڈ بیٹے کو دے دینا۔''منظر نے اپنا کارڈ بڑھایا۔''کسی بھی دن آجائے، مجھ سے مل لے۔ مجھے آنے میں بہت دیر ہو گئی، مگر خیر... ٹھیک ہو جائے گا... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دور سڑک پر کھڑی کار کے مؤدب ڈرائیور نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔

منظر نے کہا،''تم گاڑی لے جاؤ۔ میں آجاؤں گا۔''

ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔''آپ کیسے آجائیں گے سر؟''

منظر نے گرج کر کہا،''دفع ہو جاؤ... اس گاڑی سمیت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

ڈرائیور ہڑبڑا کر کار میں بیٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

منظر کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

پھر اس نے جہانگیر روڈ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

تھلّوں پر سیمنٹ کے بلاک بنانے والے مزدوروں اور انکوائری آفس کے درختوں تلے کھیلتے میلے کچیلے بچوں اور مٹھائی کی دکان پر سیاہ تیل میں سموسے تلتے کاریگروں اور موتی مسجد میں داخل ہوتے متقی نمازیوں میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ ان کے درمیان سے ایک شکستہ شخص گزر رہا ہے جس کی آنکھوں سے آنسو آہستہ آہستہ بہتے جاتے ہیں اور جس کا دل دکھ سے لبالب بھرا ہوا ہے اور جس کا ماسٹر اس کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔

❊❊

معظم شیخ

بلّو

ہم نے چھت پر چڑھے ہونا جلتی دوپہر میں اور پاگلوں کی طرح ہنستے کھیلتے بھاگتے وقت گزارنا۔ کبھی اس نے آگے آگے ہونا تو کبھی میں نے۔ اس نے بھاگنا تو میں نے اس کی قمیض کا کونا پکڑ لینا، کھلکھلاتے اس نے رک جانا، مڑنا، برابر جھکتے ہوئے مجھ پر گدگدی کا حملہ کر دینا، میں نے قمیض چھوڑ دینی، اب میں نے ہنسنا، گر پڑنا، مگر اس نے گدگدانا نہ چھوڑنا، اور اسی بہانے چمٹنے کی کوشش کرنا... مجھے یہی باتیں تو پسند تھیں اس کی۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن میں نے محسوس کیا کہ اس کھیل کے دوران اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ میں نے اس کے دھیان کی سمت دیکھا تو دور، دو تین چھتیں چھوڑ کر، جہاں کبوتروں کا ڈربا تھا، شیخوں کا لڑکا، اپنی گھنی داڑھی سمیت، اپنے گھر کی منڈیر کے آس پاس گڈیاں اڑانے کے بہانے ہماری طرف تکتا نظر آیا۔ مجھے جلن محسوس ہوئی۔ آہستہ آہستہ یہ معمول بن گیا۔ جب اس کا دھیان منڈیر کے اس پار ہونا، میں نے اسے انگلیاں مار کر گدگدانا کہ وہ میری طرف متوجہ ہو۔ گدگدانے سے اسے ضرور کچھ ہوتا تھا اور وہ فوراً ہی کھل اٹھتی تھی۔ اسی طرح کھیلتے کھیلتے میں نے اکثر اس کی چھاتیوں کو بھی چھو لینا، یا اس نے اس طرح نزدیک آنا کہ میرا ہاتھ وہاں لگے، مگر اس نے ایسے ظاہر کرنا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ مگر میں اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکوں۔ میری سڑکوں پر تعلیم شروع ہو چکی تھی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ مجھ سے کافی بڑی تھی اور میں اس کی بغلوں تک آتا تھا۔ وہ اکثر بہانے

Scanned with CamScanner

سے مجھے گلے لگالیتی اور میں، اس کے کھیل میں خاموشی سے شریک، اس کی دھڑکتی چھاتیوں کے ہتھوڑے اپنے سر پر لیتا رہتا تھا۔ دوسروں کے سامنے میں اسے 'باجی' کہہ کر پکارتا تھا، مگر یہ لفظ میں بڑی مشکل سے چباتا اور حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کرتا۔ مگر ایک دفعہ تو باجی کا لفظ مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹک گیا جس دن اس نے مجھے شیخوں کے لڑکے کو اس کا رقعہ دینے کو کہا، ''کہنا، سکندر بھائی، یہ بلّو باجی نے آپ کے لیے دیا ہے۔'' بلّو کو اس کا نام کیسے معلوم پڑا؟ میں سوچتا ہی رہا۔ وہ جب شام کو دودھ لینے کے لیے ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا، میں نے اسے بنا کچھ کہے رقعہ تھما دیا اور بھاگ آیا۔ غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، مگر میں ڈرتا تھا کہ بلّو کہیں مجھ سے بات کرنا، کھیلنا نہ چھوڑ دے۔

محلے کے لڑکے سکندر کو الیگزینڈر کہہ کر بلاتے تھے پیار سے۔ پر اس کی ایک اور وجہ بھی تھی: وہ گوری رنگت کا تھا۔ جلن کے باوجود میرے اندر ایک پُرخوف احساس مجھے یہ بتاتا تھا کہ بلّو کا یہ راز میں افشا نہیں کر سکتا۔ یکدم مجھے اس بات کا احساس بھی ہوا کہ سکندر کی گڈیاں جو ہماری چھت آ کر کبھی کبھی گر جاتی ہیں، اور بلّو ان کی کنیاں دیتی ہے، اصل میں سکندر کا رقعے بھیجنے کا طریقہ ہے۔ وہ رقعے گڈیوں کے شہتیروں میں اڑے ہوتے تھے۔ مگر جب ہوا نہیں ہوتی تھی تو گڈیاں نہیں اڑائی جا سکتی تھیں۔ میں نے عشق کی گردان کے پہلے الفاظ بھی ان ہی رقعوں سے سیکھے۔ ان ہی سے مجھے پتا چلا کہ محبت نامہ کیا ہوتا ہے۔ جب سیڑھیاں اترتے ہوئے ایک رقعہ پڑھنے لگا، ''آپ کا محبت نامہ ملا، کئی بار پڑھا، آنکھوں میں آنسو آ گئے'' تو مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ کئی محبت نامے رُلانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ مگر اس بات کی سمجھ مجھے بہت دیر بعد آئی۔

پھر شیخوں کے لڑکے نے منڈیریں ٹاپ کر ہماری چھت پر آنا شروع کر دیا۔ شام ہونے سے پہلے، گھر کے مردوں کے گھر لوٹنے سے پہلے، بلّو نے مجھے ساتھ لے کر چھت پر دھلے کپڑے اتارنے کے بہانے آنا تو سکندر نے پہلے ہی سے ساتھ والی دیوار کے پیچھے چھپے ہونا۔ اپنی منڈی نکال کر اس نے ہولے سے بلّو کو پکارنا۔ بلّو نے اشارہ کرنا اور اس نے دیوار کو پھلانگ آنا۔ ہم تینوں نے آدھ گھنٹہ ایک کونے میں کھڑا رہنا۔ بلّو نے پیچھے سے مجھے اپنی آغوش میں لے لینا، جیسے میں ڈھال ہوں، اور سکندر کے ساتھ سرگوشی میں باتیں کرنی۔ بلّو کے جسم کے لمس نے میری جلن پر حاوی آ جانا، اور میں

Scanned with CamScanner

نے یہ بھول جانا کہ وہ اوپر اُس کے لیے آئی ہوئی ہے۔

ایک دفعہ سکندر نے میری قمیض کے بٹنوں کو چھوتے چھوتے بلّو کی انگلیاں پکڑ لیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے رکھے۔ اس دن وہ سکندر کو کہتی رہی کہ اپنے گھر میں سے کسی کو بلّو کے گھر بھیجے۔ وہ کہتا رہا کہ وہ یہ کام باہر جانے کے بعد کرے گا، کیونکہ ابھی وہ اسٹیبل نہیں ہوا ہے۔ بس دو تین ماہ کا کھیل ہے، وہ کہتا رہا۔ ایک سہ پہر دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی فیصلہ کیا اور بلّو نے مجھے بڑے پیار سے کہا، ''جا طاری، چپکے سے جا اور میرے میز کی دراز سے میری چھوٹی پرس لے آ۔ کسی کو پتا نہ چلے۔''

مجھے جیسے فرشتے نے بتا دیا ہو کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ میں سیڑھیاں اترتا واپس لوٹ آیا اور آ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ میں سانس روکے کھڑا رہا اور میرے کانوں میں ان کی کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ان کے کپڑوں کے رگڑ کھانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے کان مزید کھڑے ہو گئے۔ مجھے ''بس بس'' اور ''نہیں، کچھ نہیں ہوتا، جان''، ''جانِ من''، ''نہیں''، ''بس اک بار'' کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ہمت کر کے سر تھوڑا سا باہر نکالا تو دیکھا، سکندر نے بلّو کو دیوار سے لگایا ہوا ہے اور اسے چومے جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ بلّو کی چھاتیوں کو پکڑ رہے ہیں۔ پھر، میرے دیکھتے دیکھتے، سکندر کا ایک ہاتھ بلّو کی قمیض اٹھاتے ہوئے اس کی شلوار کے اندر جانے کی کوشش کر رہا ہے اور بلّو کا ہاتھ اسے روکنے کی کوشش رہا ہے۔ دونوں کے ہاتھ کچھ دیر گتھم گتھا رہے، پھر بلّو کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ سکندر کے ہاتھ اندر اندھیرے میں غائب ہو گیا اور بلّو نے اپنے پنجے اس کی کہنی میں گاڑ دیے اور جیسے غنودگی کے عالم میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر اس کی آنکھیں بند رہنے کے بعد ایک جھٹکے کے ساتھ کھلیں اور اس نے سکندر کے کندھے کو کاٹا۔ میں گھبرا کر، کچھ بوکھلاہٹ کے ساتھ، سیڑھیاں اترنے لگا۔

بھاگتا واپس آیا تو دونوں الگ ہو چکے تھے۔ پھر بھی دونوں کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں، جیسے وہ بھی میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر آئے ہوں۔ اس دن جب سکندر منڈیریں پھلانگتا ہوا واپس گیا، وہ میرا سارا سکون اور چین بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میرے دل میں اس کے لیے بددعائیں اٹھنی شروع ہوئیں۔

Scanned with CamScanner

ایک مہینے بعد سکندر کا امریکہ کا ویزا لگ گیا۔ محلے کے لڑکوں سے پتا چلا کہ وہ کالج میں جمعیت اور جماعت اسلامی کا ممبر تھا اور اس کے لیے امریکی ویزا لگوانا معمولی سی بات تھی۔ بلّو آنے بہانے سکندر کا ذکر کرتی تو میں آگے سے چپ رہتا۔ وہ میری جلن کو سمجھتی تھی، اسی لیے اس کا ذکر بڑھاتی نہیں تھی۔ مگر مجھے اس کے اداس رہنے سے علم تھا کہ وہ سکندر کی کمی محسوس کرتی ہے جس کو میری موجودگی پورا نہیں کرسکتی۔ میں اداس اداس سا رہتا۔

میں نے یہ تو آپ کو بتایا ہی نہیں کہ بلّو کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا۔ اس کا باپ میری امی کا دور کا بھائی لگتا تھا اور اس کی ماں رشتے میں دور کی پھوپھی۔ ایک سال ہوا تھا میرے باپ کا انتقال ہوے۔ گاڑی تیزی سے مڑی اور آ کر لگی میرے باپ کی سائیکل کو۔ کچھ ہی گھنٹوں میں میری ماں بیوہ ہوگئی۔ ہم بلّو کے گھر رہنے آگئے۔ یہاں میری امی کو سکول میں پڑھانے کی نوکری بھی دلوادی بلّو کے ابا نے۔ بلّو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اور شروع ہی سے ہماری جوڑی سی بن گئی۔ سکول کے بعد ہم نے تقریباً تمام وقت اکٹھے گزارنا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا جب تک وہ منحوس منظر پر نہیں آیا۔ میں اکثر ٹی وی دیکھتے دیکھتے بلّو کے ساتھ ہی سو جایا کرتا تھا۔

شروع شروع میں جب ہم یہاں آ کر رہنے لگے میری صحت اتنی اچھی نہیں تھی۔ میں کچھ گندا گندا بھی رہتا تھا۔ قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوتے تھے، جوتوں کے تسمے کھلے، بال بکھرے ہوے، اسکول کے کام میں پیچھے۔ بلّو نے میرا خیال رکھنا شروع کیا اور ایک دو بار ی نہلایا بھی۔ اس نے مجھے جانگیا پہنا کر پانی کے ڈونگے بھر بھر میرے اوپر ڈالنے، صابن کی جھاگ میرے جسم پر ملنی اور پھر تولیے سے خشک بھی کرنا۔ یہ سکندر کے منظر پر آنے سے پہلے کی بات ہے۔ ایک دفعہ ہم دونوں گھر پر اکیلے تھے۔ گھر کے سارے بڑے چھوٹے کسی واقف کار کی میت پر گئے ہوے تھے۔ اس دن نہلاتے وقت بلّو نے اپنے کپڑے بھی اتار دیے۔ تب ہی پہلی دفعہ میں نے اس کی چھاتیوں اور ان کی تنی ہوئی گولائیوں کو غور سے دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد سے میرے ہاتھوں میں مسلسل ان کو چھونے کا تجسس رہتا تھا۔ اسی دن مجھے اس کی ناف سے نچلے حصے میں اگے ہوے بال بھی نظر آئے اور احساس ہوا اپنے جسم پر بالوں کی کمی کا۔ اس نے نہانے کے دوران جب مجھے اپنے نچلے بالوں کے درمیان گہرے رنگ کا شگاف دکھایا اور بتایا کہ یہاں سے بچے پیدا ہوتے ہیں تو اس کی نظر میری

Scanned with CamScanner

چھوٹی لُلی کی تختی کی طرف اٹھ گئی۔ تب اس نے ہنستے ہوئے، کچھ شرم سے، کہا، میں نالی کے پاس جا کر بیٹھ کر پیشاب کرلوں۔ میں جا کر بیٹھ گیا مگر پیشاب آیا کوئی نا۔ مجھ میں شرمندگی کا احساس بڑھ گیا اور تختی نرمی میں بدل گئی۔

دن گزرتے گئے۔ سکندر کا خط کوئی نہ آیا۔ بلّو کے چہرے کی لالی زور پکڑتی گئی۔ اس کی گہری آنکھیں اور گہری ہو چلیں انتظار میں، اور جیسے درخت کے تنے اپنی عمر کے دائرے گہرے رنگ میں لکھتے چلے جاتے ہیں، اس کی آنکھوں کے نیچے بھی ہر نئی انتظار کی رات ایک نیا حلقہ چھوڑتی گئی۔ میں اسے ہنسانے کی کوشش کرتا، مگر وہ جھوٹی موٹی ہنس کر، تھوڑا بہت کھیل کر، مجھے اسکول کا کام کروا کر، اپنے بستر میں بیٹھ جاتی تھی جیسے کالج کا کام کر رہی ہے۔ میں نے اسے بازار سے ٹافیاں، برف کے گولے، سموسے لا کر دیئے، جو اس نے مرے دل سے قبول تو کر لیے مگر ان کو آدھا کھانا، آدھا بغیر چبائے ہی نگل جانا۔ چار ماہ کا عرصہ کافی لمبا ہوتا ہے۔ جب اس نے مجھ سے ایک دن کہا، ''شاید سکندر مر گیا ہے،'' تو مجھے جھٹکا لگا، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید میری ہی کوئی بددعا اسے لگ گئی۔ میں کئی دن تک یہ بوجھ لیے لیے پھرتا رہا۔

اس رات بھی میں ٹی وی دیکھتا دیکھتا بلّو کے ساتھ اسی کے بستر میں سو گیا۔ مگر سونے سے پہلے، مجھے خوب یاد ہے، میں دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اس کی نچلی چھاتی کی گولائی تک لے گیا اور سکون سے نیند کی آغوش میں اتر گیا۔ جب میں اچانک جاگا تو مجھے لگا کہ میرا ہاتھ اس کی گرفت میں ہے۔ کمرے کی بتی بجھ چکی تھی۔ مگر فوراً میں نے جانا کہ میرا ہاتھ اس کے نچلے بالوں پر ہے اور شلوار کا ڈھیلا نالا میرے ہاتھ کے اوپر سے رینگتا ہوا گزر گیا ہے۔ میں نے بلّو کو یہ نہ پتا چلنے دیا کہ میں جاگ پڑا ہوں۔ پہلے وہ میری انگلیاں بالوں میں پھیرتی رہی۔ پھر میری شہادت کی انگلی پکڑ کر نیچے کو سرکاتی ہوئی لے گئی جہاں میری انگلی گیلی ہو گئی۔ میں سانس روکے لیٹا رہا۔ میں ابھی اس سارے واقعے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے میری انگلی اور نیچے کر کے اندر کو گھسا دی۔ مجھے لگا جیسے چولھے کی آگ چڑھ گئی ہو اور میں نے لاشعوری طور پر ہاتھ پیچھے کھینچا، جھٹکے کے ساتھ۔ پھر کچھ دیر ہم دونوں ساکت لیٹے رہے۔ حالانکہ میری چوری پکڑی گئی تھی، نہ اس نے میری انگلی چھوڑی، نہ میں نے چھڑائی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ میری انگلی دوبارہ اپنی تنہائی کے ایندھن میں لے گئی، اور میری انگلی وہاں

جلتی رہی۔

اس دن کے بعد سے بلّو نے میرے ساتھ کھیلنا پہلے کم کیا، پھر بالکل ہی چھوڑ دیا۔ میں نے بھی باہر لڑکوں کے ساتھ سڑک پر کرکٹ کھیلنا شروع کر دیا۔ سبق سمجھنے کے لیے بھی بلّو کا بڑا بھائی میری مدد کرتا تھا۔ میں اور بلّو دور ہوتے گئے۔ اس سال کے آخر میں میری امی کی دوسری شادی ہوگئی اور ہم وہ گھر چھوڑ کر شہر کے دوسرے سرے پر آگئے۔ بلّو کے گھر والوں سے سال میں ایک آدھ بار ملنا ملانا ہوتا تھا۔ بلّو کبھی میری طرف دیکھتی بھی تھی تو پتھرائی نظروں سے۔ کچھ ہی عرصے بعد بلّو کی شادی ہوگئی اور وہ کراچی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے ذہن سے مٹ گئی۔

نہ جانے کتنے سالوں بعد وہ مجھے یاد آئی۔ میں تب کافی بڑا ہو چکا تھا۔ جسم پر بے تحاشا بال اُگ آئے تھے، لمبی لمبی قلمیں امیتابھ کے سٹائل پر۔ کالج پاس کر چکا تھا۔ اچھے نمبر نہیں آئے تھے، مگر سوتیلے باپ نے سفارش وغیرہ ڈھونڈ کر مجھے سنٹرل ڈاک خانے میں عام سی نوکری دلوا دی۔ جیسے جیسے خطوں کو چھوتا گیا، انگلی کی جلن لوٹنے لگی، اس کے بعد بلّو کی یاد بھی، اس کی بے وفائی کا کرب بھی۔ اکثر خطوں پر مہریں دھرتا تو ان پر نام پڑھتا کہ شاید بلّو کا نام نظر آجائے۔ مگر یہ سوچ کر ہنستا کہ مجھے تو اس کا اصل نام بھی یاد نہیں۔ رات کی تنہائی میں مجھے اس کے جسم کا قرب اور لمس خوابوں میں آتا اور بے قرار رکھتا۔ سارا دن انگلی میں آگ سی سلگتی رہتی۔ سیدھے ہاتھ سے کوئی بھی چیز ٹھیک طریقے سے نہ پکڑ پاتا۔ امی ٹوکتیں، گلاس پکڑتے وقت یوں انگلی نہ کھلی رکھا کرو، نحوست ہوتی ہے۔

آج میرا بیاہ ہوا ہے اور میری بیوی، کمرے کے اندھیرے میں، کپڑے اتارے، چادر کے نیچے میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں اس کے پاس ہی براجمان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم بستری کی، عشق سازی کی، پہلی سیڑھی کہاں سے چڑھوں۔ کیا کہوں؟ کہاں سے بات شروع کروں؟ میری ٹانگوں کے درمیان تختی میں ایک مزیدار گرمی اپنا احساس دلا رہی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس گرمی پر رکھ دوں مگر پھر میرا دھیان اپنی انگلی کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس کی برسوں پرانی سلگاہٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ دماغ چاہتا ہے کہ یہی انگلی اس کے نچلے بالوں میں پھیرتا ہوا، آہستہ آہستہ اس کے اندر، گہرائی میں اتار دوں کہ شاید یہ جلن اگر بجھتی نہیں تو کم از کم کمزور ہی پڑ جائے۔

❀❀

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 65 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 600 روپے
بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

خالد طور

سکائی لیب

(ناولا)

Scanned with CamScanner

1

پینتیس برس کی عمر میں انتہائی تگ ودو کے بعد مجھے ملک کے نشریاتی ادارے میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ تمام نئے پروڈیوسروں کو اسلام آباد میں پشاور موڑ کے قریب واقع اسٹاف ٹریننگ سکول بلوا گیا گیا۔ سکول کے انچارج نے رسمی تقریر اور تعارف کے بعد کہا کہ باقاعدہ ٹریننگ ایک ہفتے کے بعد شروع ہوگی۔ اسلام آباد سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور کھوڑ کی آئل فیلڈ ہے، جہاں میرے بھائی فیلڈ انجینئر تھے۔ کھوڑ میں میرا بچپن گزرا ہے اور مجھے اس سنگلاخ علاقے سے فطری لگاؤ بھی ہے۔ میں کھوڑ چلا گیا۔ جولائی 1979 کی نو تاریخ تھی۔ رات کے وقت خبروں میں بتایا گیا کہ امریکہ کی سکائی لیب میں فنی خرابی پیدا ہوگئی ہے اور خلائی انجینئرز اسے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امریکہ اور سوویت یونین کے علاوہ دنیا بھر کے لیے یہ معمول کی ایک دلچسپ خبر تھی۔ اس سکائی لیب کو 1974 میں خلا میں پہنچایا گیا تھا اور اسے 1983 میں واپس زمین پر اترنا تھا۔ 10 جولائی کو صبح خبروں میں یہی خبر دنیا بھر کے لیے تشویش کا باعث بن گئی۔ بتایا گیا کہ سکائی لیب کا فنی نقص دور کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو رہی ہیں اور یہ خلائی لیبارٹری زمین کے کسی حصے پر بھی گر سکتی ہے۔

خبر نشر ہونے کے نوے منٹ بعد بھائی کے گھر کام کرنے والی ملازمہ نے مجھے بتایا کہ باہر شکورا سنگلاں والا[1] آیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی وہ کبھی بھی مجھ سے ملنے بھائی کے بنگلے پر نہیں آیا کرتا تھا۔ "شاید اسے پتا چل گیا ہے کہ مجھے ریڈیو میں ملازمت مل گئی ہے،" میں نے سوچا۔ "بھائی کے ڈرائیور نے یہ خبر پھیلادی ہوگی۔ شاید شکورا مجھے مبارک باد دینے آیا ہوگا۔" کمپنی کی کالونی کے کوارٹروں سے پہلے ایک احاطہ نما بازار ہے۔ بازار کی جنوبی سمت ڈسٹرکٹ بورڈ کا پرائمری سکول

[1] سنگل پنجابی زبان میں مویشیوں کو باندھنے کے لیے لوہے کی موٹی زنجیر کو کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہے۔ بازار سے آنے والی سڑک پر ایک دوسرے سے ملحق اسپتال اور ورکرز کلب ہیں۔ دونوں عمارتوں کے درمیان کلب کا وسیع لان حائل ہے۔ بازار کے احاطے میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا اڈہ ہے اور چاروں جانب دکانیں ہیں۔ شمال کی جانب شیر علی کا چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کے ساتھ اندر جاتی ہوئی گلی بیس قدم پر بائیں ہاتھ مڑ جاتی ہے جہاں دو کچے مکان ہیں۔ ان مکانوں کے درمیان بھی ایک چوڑی گلی ہے۔ انھی مکانوں میں دوسرا گھر شکورے سنگلاں والے کا تھا۔ کانوں میں مقامی لوگوں کے یہی دو گھر تھے۔ پہلا مکان احمد خان ڈھولی کا تھا جس نے نصف مکان ضلع صوابی پختونخوا کے رہنے والے نثار خان کو دے رکھا تھا۔ نثار خان کمپنی کے ٹرانسپورٹ سیکشن میں ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے کوارٹر نہیں مل سکا تھا اور اس کے بیوی بچے صوابی ہی میں تھے۔ نثار خان ہر مہینے احمد خان ڈھولی کو پچیس روپے کرایہ دیتے ہوئے کمپنی کے لیبر افسر کو پشتو میں گالی دیا کرتا تھا۔ شکورے کا گھر آبائی تھا۔ اس کے باپ غفورے (عبدالغفور) نے دس مرلے زمین پر تین کمروں کا گھر بنایا تھا۔ ہوٹل کے عقب میں اس نے گلی میں کھلنے والی ایک کمرے کی دکان بنالی تھی جس میں وہ سنگل اور زنجیریں بنایا کرتا تھا۔ غفورا اپنے کام کا ماہر مانا جاتا تھا۔ ویلڈنگ کے بغیر بھی وہ سنگل کے حلقے اس طرح آپس میں جوڑ دیا کرتا تھا کہ دھنی کے طاقتور بیل بھی اسے نہیں توڑ سکتے تھے۔

دبلا پتلا شکورا اپنے باپ کا ہم شکل تھا: گورا چٹا، لمبوترے چہرے پر پتلی اور لمبی ناک والا، گھنی پلکوں اور لمبی لمبی آنکھوں والا۔ اس کے ابرو بھی گھنے تھے۔ آنکھیں اکثر بھینچی رہتی تھیں، شاید اسی وجہ سے اس کی پلکیں گھنی نظر آیا کرتی تھیں، لیکن حیرت یا غصے کی حالت میں اس کی آنکھیں پوری کھل جایا کرتی تھیں۔ شکورے کی آنکھوں میں ہمیشہ اور ہر حالت میں وحشت سی نظر آیا کرتی تھی۔ خوشی ہو یا غم، حیرت ہو یا غصہ، اس کی آنکھوں کا ہر تاثر وحشت زدہ ہی رہا کرتا تھا۔ وہ بہت غصیلا تھا لیکن جتنی جلدی اسے غصہ آیا کرتا تھا اتنی جلدی ہی اتر بھی جایا کرتا تھا۔ میں نے کبھی کسی کو اس قدر زود رنج نہیں دیکھا۔ ناپسندیدہ بات یا حرکت پر وہ فوراً ہی چیخنے لگتا تھا، گندی گالیاں دیتا تھا۔ یہ عادت بچپن ہی سے اس کے ساتھ تھی۔ وہ چیختے ہوئے، گالیاں دیتے ہوئے فوراً ہی خاموش بھی ہو جایا کرتا تھا۔ کسی تاسف کی بات پر وہ فوراً ہی رونے لگتا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ سر پر سیاہ گھنے بال پیچھے سے گول کٹے رہتے تھے اور چھتے گردن کے پیچھے دائیں بائیں جھولتے رہتے تھے۔ وہ پٹکا نہیں باندھتا تھا۔ غصے کی حالت میں

اس کی سیدھی مانگ کے نیچے پیشانی پر گہری شکنیں نمودار ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ صبح صبح مجھے کیوں ملنے آیا ہے۔ میں نے بازار تو جانا ہی تھا؛ شکورے سے ملنا بھی تھا۔ میں بھائی کے بنگلے کے لان سے ہو کر گیٹ پر پہنچا تو سامنے سڑک کی دوسری طرف ہاکی گراؤنڈ کے جنگلے کے پاس شکورا کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے میری سمت آیا۔

''کیا بات ہے شکورے؟'' میں نے کسی رسمی علیک سلیک کے بغیر کہا۔ ''آج صبح صبح میری یاد کیسے آ گئی؟''

''تیرے آنے کی خبر مجھے مل گئی تھی،'' شکورے نے کہا۔ ''وہ... وہ خبریں سنی ہیں تو نے؟''

''ہاں سنی ہیں،'' میں نے کہا اور شکورے کی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔

''وہ کیا خبر ہے؟...'' شکورے نے کہا۔ ''امریکہ کی کون سی چیز گرنے والی ہے؟''

''سکائی لیب؟'' میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''ہاں شکورے، وہ خراب ہو چکی ہے اور زمین پر گرنے والی ہے۔ لیکن تو کیوں پریشان ہے؟ وہ یہاں نہیں گرے گی۔'' شکورے کی آنکھیں بھنچ کر دو چمکتی ہوئی لکیریں بن گئیں۔

''اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں،'' میں نے کہا۔ ''وہ کھوڑ پر نہیں گرے گی۔''

شکورے کے چہرے پر ناگواری سی ابھری۔ وہ مڑا اور ایک لفظ کہے بغیر ہاکی گراؤنڈ کے جنگلے کے پاس چلا گیا۔ پھر اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔

''خبریں سنتا رہ،'' اس نے کہا، ''اور جو خبر بھی آئے، مجھے ضرور بتانا۔''

وہ ہاکی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ، بنگلوں کی قطاروں سے گزرتی ہوئی کالونی کے کوارٹروں کی سمت جاتی ہوئی تارکول کی چھوٹی سی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلا گیا۔ سکائی لیب میں شکورے کی دلچسپی فوری طور پر سمجھ نہ سکا، لیکن باعث پر ذرا سا غور کرنے پر میں پریشان ہو گیا۔

2

شکورا اور میں بچپن میں کھوڑ کے پرائمری سکول میں پڑھا کرتے تھے، لیکن یہ ساتھ صرف تین برسوں تک ہی رہا۔ ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر ماسٹر محمد جان نے شکورے کی ہتھیلی پر اس قدر زور

Scanned with CamScanner

سے بید ماری کہ شکورا چیخ اٹھا۔

"ہاں او، میں تیندڑی... " (ہائے میں تیری...)

شکورے نے ماسٹر محمد جان کو گندی گالی دی اور ماسٹر محمد جان نے ساری جماعت کے سامنے شکورے پر شرمناک تشدد کیا۔ اگلے روز شکورا اپنے باپ کے ساتھ سکول آیا۔ غفورا بہت غصے میں تھا لیکن جب ماسٹر محمد جان نے اسے بتایا کہ شکورے نے اسے ماں کی گندی گالی دی تھی تو غفورا ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر ماسٹر محمد جان سے تھوڑی دیر بحث کے بعد اس نے شکورے کو جماعت کے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا، لیکن شکورا باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"نہیں پڑھنا مجھے،" شکورے نے اپنی باریک چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس نہیں پڑھنا۔ مجھے سنگل بنانے سکھا دے۔"

غفورا کبھی شکورے کو اور کبھی ٹاٹ پر بیٹھے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شکورے کے کندھے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

"سوری نیاں...[2] (سسری کے...) "سنگل ہی بنانے تھے تو تین سال سکول میں ماں..." اس نے سارے لڑکوں کے سامنے گندی سی بات کی۔ پھر اس کے چہرے پر غم کا تاثر ابھرا۔ اس نے اپنے تصور میں شکورے کو فوج کا کوئی افسر، عدالت کا مجسٹریٹ اور نہ جانے کیا کیا دیکھا ہوگا۔ وہ سر جھکائے سکول کے بیرونی دروازے سے نکل گیا۔ شکورا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ماسٹر محمد جان نے اسے نہ روکا۔ سب لڑکوں کے سر بیرونی دروازے کی سمت مڑے ہوئے تھے۔

"بہت اچھا ہوا ہے،" ماسٹر محمد جان نے کہا۔ "حرامی میرے سکول کو گندا کر دیتا۔"

مجھے سکول سے شکورے کے اس طرح چلے جانے کا دکھ تھا۔ اگلی صبح وہ باپ کی دکان پر ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا سنگل اور زنجیریں بنانا سیکھ رہا تھا۔

---

[2] یہ گالی شمالی پنجاب میں دیہاتی طعنے کے طور پر بیٹوں کو دیتے ہیں کہ تو تو ساس کا ہے۔

Scanned with CamScanner

3

شکورے کی ماں مر چکی تھی۔ غفورے نے دوسری شادی نہیں کی تھی یا ہو نہ پائی تھی، معلوم نہیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر کھوڑ میں نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ شکورے کا باپ چند روز چارپائی پر پڑا رہنے کے بعد مر گیا۔ کھوڑ گاؤں سے برادری والے آئے۔ انھوں نے نہ شکورے کی ماں کے مرنے پر کوئی توجہ دی تھی اور نہ غفورے کی موت ان کے لیے اہم تھی۔ آئے، تدفین میں شرکت کی، چلے گئے۔ پھر آئے، قل کے پھل کھائے اور پھر چلے گئے۔ پندرہ برس کا شکورا اپنے باپ کا فن سیکھ چکا تھا۔ پانچ چھ دن بعد وہ باپ کی چوکی پر نہائی[3] کے سامنے بیٹھا سنگل اور زنجیریں بنا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ سے چمڑے کی مشک نما دھونکنی سے انگیٹھی میں کوئلے دہکاتا، کوئلوں پر لوہے کی سلاخوں کو تپا کر سرخ کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے چمٹے کی مدد سے سرخ سلاخ نہائی پر رکھتے ہوئے، دھونکنی چھوڑ کر، ہتھوڑا اٹھا کر مطلوبہ زور سے وہ سلاخ کا حلقہ بناتا تھا اور پھر دوسرے حلقے سے جوڑ کر سلاخ اس چابکدستی سے کاٹ دیتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہر حلقہ دوسرے حلقے میں گانٹھ سی لگا دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ باپ ہی کی طرح سنگل اور زنجیریں بنانے کا ماہر سمجھا جانے لگا اور ارد گرد کے دیہات سے وہ گاہک جو اس کے باپ کے پاس آیا کرتے تھے، اس کے پاس بھی آنے لگے۔

شکورے کی ذہنی صحت پر پہلی بار مجھے اس دن شک ہوا تھا جب میں اسے شادی کی مبارکباد دینے اس کی دکان پر گیا تھا۔ بی اے کا امتحان دے کر میں کھوڑ گیا تو پتا چلا کہ شکورے کی شادی اس کی خالہ زاد شیداں (رشیدہ) سے ہو گئی ہے۔ شیداں شکورے کی بیوہ خالہ کی بیٹی تھی اور کھوڑ گاؤں کی رہنے والی تھی۔ شیداں کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ سانولی، گول چہرے والی، متوازن ناک اور گول گول تیز آنکھوں والی شیداں بے حد شرارتی لڑکی تھی۔ بچپن ہی میں وہ جگت باز مشہور ہو گئی تھی۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں اس کے سامنے پھیکی پڑ جاتی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ سکول کے دنوں میں جب جمعے کے روز آدھی چھٹی ساری ہو جاتی تھی تو میں شکورے کے ساتھ کھوڑ گاؤں کے باہر ایک کھلے ریتیلے میدان میں جایا کرتا تھا۔ وہاں سکول کے سب لڑکے موجود ہوتے تھے۔ کھوڑ گاؤں کی لڑکیاں بھی آ جایا کرتی تھیں۔ گرمیوں کی دوپہروں میں تو

---

[3] اہرن۔ وہ لوہا جس پر لوہار لوہا کوٹتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

وہاں جانا ممکن نہیں ہوتا تھا لیکن بہار، خزاں اور سردیوں میں ریتیلا میدان لڑکوں کی ایک بڑی شکارگاہ بن جایا کرتا تھا۔ میدان میں سانڈوں[4] کے بکثرت بل تھے۔ لڑکے مضبوط دھاگوں کے پھندے بنا کر سانڈوں کے بلوں پر رکھ دیا کرتے تھے۔ مضبوط ریشمی ڈور جیسے دھاگوں کے دوسرے سروں کو پکڑ کر کچھ دور ریت پر بے حس و حرکت لیٹ جایا کرتے تھے۔ جب کوئی سانڈا خوراک کی تلاش میں بل سے باہر آتا تھا تو اس کا دبلا سر پھندے سے نکل آتا تھا لیکن پچھلا موٹا دھڑ پھنس جاتا تھا۔ سانڈا واپس بل میں جانے کے بجائے باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ پھندا اس کی گردن پر مضبوطی سے جکڑا جاتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتا، اچھلتا، قلابازیاں کھاتا، اپنی کانٹے دار دم زور زور سے ریت پر پٹختا تھا لیکن پھندے سے نہیں نکل پاتا تھا۔ ہر بار سانڈا پکڑے جانے کے بعد لڑکے خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔ کئی لڑکے تختیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اس رقص میں تال دیا کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ سانس رک جانے پر سخت جان سانڈا مر جاتا، فوراً پھندا کاٹ دیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے لڑکوں کے پاس قلم تراشنے والے چھوٹے تیز چاقو ہوتے تھے۔ سانڈے کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک بار سرمائی دھوپ سے چمکتے میدان میں ایک سخت دل لڑکے نے پھندے میں جکڑے سانڈے کے سر پر تختی مارنا شروع کر دی۔ شیداں، جو اپنی سہیلی ذکو (ذکیہ) کے ساتھ کھڑی تھی، غصے میں دوڑ کر اس کے پاس آئی۔

''چھوڑ اساں... چھوڑ... تو اپنے چاچے[5] لئی تیل گھن کے ونجنا اے؟'' (چھوڑ اسے چھوڑ، تو نے اپنے باپ کے لیے تیل لے کر جانا ہے؟)[6] لڑکوں نے قہقہے لگائے اور اس لڑکے کو کئی دن تک یہی جملہ کہہ کہہ کر ستایا۔ ایک بار جمعے کے روز میں سکول سے نکلا تو سامنے شکورا کھڑا تھا۔ اس کا باپ مسجد میں گیا ہوا تھا۔ میں اور شکورا ریتیلے میدان میں پہنچے۔ کئی لڑکے سانڈے پکڑنے میں مصروف تھے۔ وہاں گاؤں کی کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ شیداں اور ذکو بھی تھیں۔ شیداں نے شکورے کو دیکھا تو سیدھی ہماری طرف آئی۔

''دکانے آں بند کیتاں ای؟'' (دکان کو بند کیا ہے؟) شیداں نے کہا اور شکورے نے نفی میں

---

[4] سانڈے: گوہ کی قسم کے چھوٹے چھپکلے۔

[5] شمالی پنجاب کے دیہاتی باپ کو چاچا کہتے ہیں؛ نہ جانے کیوں، یا تو اس میں کوئی ادب کا پہلو نکلتا ہے یا وہ کسی کو بھی باپ کہنا پسند نہیں کرتے۔

[6] اس قسم کے عامیانہ جملوں پر شمالی پنجاب کے دیہاتوں میں کوئی برا نہیں مناتا، بس صرف قہقہے لگائے جاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

سر دائیں بائیں ہلایا۔

''دکانے آں کھلی چھوڑ آیا ایں؟ آج شام میں ماسٹر تداں کٹوی اچ پاسی۔'' (دکان کھلی چھوڑ آیا ہے، آج شام خالو تجھے ہنڈیا میں ڈالے گا۔)

میں جب میٹرک میں تھا تو ایک دن شکورے نے مجھے کھوڑ گاؤں چلنے کی دعوت دی۔ اس دن میں نے اُن دنوں کے فیشن کے مطابق لمبی نوک والے بوٹ، کسی ہوئی پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ کھوڑ گاؤں سے پہلے ریتیلے میدان کے کنارے پر کنواں ہے۔ اسی کنویں پر بعد میں بابا علی نے مسجد بنوائی تھی۔ راستہ کنویں کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ کنویں پر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں شیداں اور ذکو بھی تھیں۔ شیداں نے مجھے دیکھا تو گھڑا نیچے رکھ دیا۔ اب وہ بچی نہیں تھی، بڑی ہو چکی تھی لیکن اس کی آنکھیں بچکانہ انداز میں چمکیں۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''ہا اوئے — تینڈی تے ہوا بند ہو گئی ہوسی!'' (ہا اوے، تیری تو ہوا بند ہو گئی ہو گی!) کنویں پر کھڑی لڑکیوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔

''شیداں توں مینڈی گل من یا نہ من، تینڈے اندر کسی بڈھی میراثن نی روح اے،'' (شیداں تو میری بات مان یا نہ مان، تیرے اندر کسی بوڑھی میراثن کی روح ہے) میں نے جواب دیا۔ کنویں پر قہقہے بلند ہوئے۔ سب سے اونچے قہقہے ذکو کے تھے؛ وہ خود بھی میراثن تھی۔

شکورے کی شادی پر میں بہت خوش تھا۔ بار بار یہی احساس ہو رہا تھا کہ اب شکورے کا گھر قہقہوں سے گونجے گا۔ اس کی بے رنگ تنہا زندگی رنگین ہو جائے گی۔ میں شکورے اور شیداں کو مبارکباد دینے اس کی دکان پر گیا۔ وہ نہائی کے سامنے چوکی پر بیٹھا زنجیر بنا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہتھوڑا ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا، پھر اٹھا، میری طرف آیا۔ میں سمجھا، وہ مجھ سے بغلگیر ہونا چاہتا ہے لیکن اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

''ہو تو میرا یار —'' اس کی آنکھیں غصے سے پوری کھل گئیں۔ ''ہو تو میرا جگری یار اور نہ آئے میری شادی پر — تیری میں...'' اس نے مجھے گندی گالی دی۔

بہت سمجھایا کہ شکورے، میرے امتحان ہو رہے تھے اور مجھے کسی نے اطلاع بھی نہیں دی تھی، اطلاع دی ہوتی بھی، تو بھی میں نہیں آ سکتا تھا، میرے پرچے ہو رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

''تیرے پرچوں کی میں... ''اس نے امتحانوں کو گالی دی۔ ''دفع ہو جا!'' اس نے میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے کی سمت دھکیلا۔ ''شکل غائب کر۔''

وہ مجھ سے منہ پھیر کر چوکی پر جا بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ شیداں کو مبارکباد کہنے کی حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی۔ مجھے چھ دن شکورے کو منانے میں لگے۔

4

سکائی لیب میں اس کی دلچسپی بے معنی نہ تھی۔ مجھے اس کے اس جنون کا احساس ہو رہا تھا جس کا بھیانک پس منظر بھی تھا۔ دوسری بار مجھے شکورے کی ذہنی صحت پر اس وقت شک ہوا جب شیداں زچگی میں تھی۔ میں ان دنوں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہمیشہ کی طرح چھٹیاں گزارنے کھوڑ گیا۔ شام کے وقت میں بازار گیا تو احاطے میں مجھے شکور نظر آیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں تیز تیز قدموں سے شیر علی کے ہوٹل کے قریب سے آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑا۔

''شکر ہے ربا،'' میرے قریب آنے پر اس نے بدحواسی میں کہا، ''شکر ہے تو آ گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ چل، میرے ساتھ چل۔'' اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں خوف تھا۔

''کیا ہوا شکورے؟'' میں بھی گھبرا گیا۔ ''خیر تو ہے؟''

شکورے نے خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''کئی دنوں سے شیداں ماں کے پاس ہے،'' اس کی آواز بھی تھرتھرا رہی تھی۔ ''ابھی ابھی اللہ داد آیا تھا گاؤں سے۔ اس نے بتایا ہے کہ شیداں کو دردیں شروع ہو گئی ہیں۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے اسے... یار میں بہت ڈر رہا ہوں۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس کی بدحواسی پورے بدن پر نمایاں تھی۔

''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے شکورے؟'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے ابھی اس کا تجربہ تو نہیں ہے، لیکن میرے خیال میں ہر باپ بننے والا شخص اس موقعے پر ڈر جاتا ہوگا۔''

کچھ دیر بعد میں بھی تیز قدموں کے ساتھ شکورے کے ساتھ کھوڑ گاؤں جا رہا تھا۔ رستے میں مہدی کا گھر تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ پائپ لائن پر جانے والے ورکرز میں سے ایک تھا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

دروازہ کھٹکھٹا کر اسے باہر بلایا اور کہا کہ جا کر بھائی کو بتا دے کہ میں شکورے کے ساتھ کھوڑ گاؤں جا رہا ہوں، شیداں کو بچہ ہونے والا ہے۔ ابھی گاؤں دور ہی تھا کہ شکورے نے مجھے بتایا کہ شیداں کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا کہ دردیں شروع ہوگئی ہیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ آٹھواں مہینہ زچگی کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ شکورا چند قدم آگے جا کر رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔ میں اس کے قریب گیا۔

''شکورے،'' میں نے کہا، ''شیداں کو کمپنی کے اسپتال میں لے جانا ہوگا... فوراً۔''

''کیوں؟'' شکورے نے گھبرا کر پوچھا۔

''آٹھویں مہینے میں زچگی خطرناک ہوتی ہے...'' میری آواز میں بھی گھبراہٹ تھی۔ ''چل واپس چل، اسپتال سے ایمبولینس لے لیں گے۔ شیداں کو اسپتال پہنچا کر میں ڈاکٹر شیروانی کو بلا لوں گا۔''

''نہیں،'' شکورے نے کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں... دائی منظوراں ہے اس کے پاس۔ سینکڑوں بچے جنوائے ہیں اس نے۔'' میرے ذہن میں اندیشہ سر اٹھا چکا تھا۔

''شکورے، میری بات مان لے،'' میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر شیروانی خود کچھ نہ کر سکے تو کم از کم راولپنڈی بھیجنے کے لیے ایمبولینس تو دے ہی دیں گے۔''

شکورے نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ''مغز پھر گیا ہے تیرا؟'' اس نے غصے سے کہا۔ ''مرد کو دکھاؤں شیداں؟''

''ڈاکٹر شیروانی بوڑھے ہیں، باپ جیسے ہیں شکورے،'' میں نے کہا۔

''بے شرم!'' شکورے نے جھنجلاہٹ سے کہا، ''بے حیا... مرد میری شیداں کو ننگا دیکھے؟ تجھے شرم نہیں آتی؟''

مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ شکورے کو سمجھا سکوں۔

''شیداں اور بچے کی جان کو خطرہ ہے شکورے،'' میں نے کہا، اور شکورے نے پھر گاؤں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

''تجھے میں اپنے حوصلے کے لیے ساتھ لایا ہوں،'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا، ''اور تو

Scanned with CamScanner

مجھے ڈرا رہا ہے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے قدم سے قدم ملا رہا تھا۔ ہم جب کھوڑ گاؤں کے قریب پہنچے، گاؤں کے باہر درختوں پر پرندے خاموش ہو چکے تھے۔ گہری شام میں گاؤں کی گلیاں تاریک تھیں۔ کنویں سے پہلے مشرقی سمت سے آنے والا برساتی نالہ، جو ایک نیم دائرہ بناتے ہوئے جنوب کی سمت نکل جاتا ہے، تاریک ہوتے ہوئے گہراؤ کا احساس دلا رہا تھا۔ برساتی نالے سے اوپر تیسری گلی میں شیداں کی ماں کا گھر تھا۔ وہاں دائی منظوراں، شیداں کی ماں، دو رشتے دار عورتیں اور شیداں تھی۔ گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ شکورے کی بیوہ خالہ باہر آئی۔ شکورے کو تسلی دی۔ اندر سے ایک مستطیل چارپائی لائی جو کسی بنچ کی طرح تھی۔ گھر کے اندر سے کبھی کبھی شیداں کے کراہنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ گہری شام رات میں بدل چکی تھی۔ کچھ دیر بعد دائی منظوراں باہر آئی۔ خاصی موٹی عورت تھی۔ اس نے پانی گرم کرنے کے لیے لکڑیاں مانگیں جو ختم ہو چکی تھیں، اور شکورے کو کچھ ہدایات بھی دیں۔ گلی میں خاصی گرمی تھی۔ ہوا کا کوئی جھونکا شمال سے جنوب کی سمت گاؤں کی گلی میں دوڑتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔ شیداں کے کراہنے پر میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ شکورا لکڑیاں لینے کے لیے بھاگا۔ میں بنچ نما بان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شیداں کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں شکورا لکڑیاں لے آیا۔ پھر گاؤں کی جنوب مشرقی گلی کی سمت دوڑا۔ اس بار اس نے خاصی دیر لگا دی۔ گاؤں کی گلیوں میں کتوں کے بھونکنے کے سوا تمام آوازیں مٹ سی گئی تھیں۔ شکورا پنساری کی دکان پر گیا تھا جو یقیناً بند ہو چکی ہوگی۔ اس نے پنساری کے گھر جا کر، اسے ساتھ لے کر، پھر دکان کھلوائی ہوگی۔ اسی لیے وہ تقریباً چالیس منٹ کے بعد بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پڑیا تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر شیداں کی ماں لالٹین اٹھائے باہر آئی۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ وہ پڑیا لے کر اندر چلی گئی۔ شکورا میرے پاس بیٹھ گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ شیداں کے کراہنے کی آوازیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔

"شکورے،" میں نے کہا، "اب بھی وقت ہے، مان جا۔ میں جا کر ایمبولینس لے آتا ہوں۔"

"مغز پھر گیا ہے تیرا،" شکورے نے غصے میں کہا، "کہہ دیا ہے میں نے، شیداں کسی غیر مرد کے سامنے ننگی نہیں ہوگی۔"

Scanned with CamScanner

شیداں اب رہ رہ کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ گلی کے ساتھ والے کمرے میں تھی۔ کمرے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر اس کے کراہنے کے وقفے میں کمی ہونا شروع ہوگئی۔ میں کلائی کی گھڑی تو بازار جاتے وقت ہی کمرے کی میز پر بھول گیا تھا، وقت کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ گاؤں خاموش تھا۔

''شکورے،'' میں نے منت کی۔ ''کوئی مرد شیداں کو نہیں دیکھے گا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے پنڈی کے لیے ایمبولینس مانگ لوں گا۔ وہ دے دیں گے۔ ہم شیداں کو راولپنڈی لے چلتے ہیں۔''

''نہیں... میں نے کہہ دیا کہ نہیں،'' شکورے نے کہا۔ شیداں کے کراہنے کی بلند آواز ابھری... گزرتا ہوا وقت بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ رات اس قدر تاریک تھی کہ گلی میں دو تین فٹ تک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک برساتی نالے کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں کی ہر گلی سے کتوں کی آوازیں آئیں، وہ زور زور سے بھونک رہے تھے۔ جس گلی میں ہم بیٹھے تھے، اس میں بھی ایک بھونکتا ہوا کتا دوڑتا چلا آ رہا تھا لیکن ہم سے کچھ دور رک کر وہ مڑا اور بھونکتا ہوا دوسری گلی میں مڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ اسی خاموشی میں پہلی بار شیداں کی ایک دھیمی سی چیخ سنائی دی۔ شکورے نے وحشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے پر پھیلا ہوا خوف پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ شیداں کی چیخ پھر سنائی دی۔

''بچہ ہو رہا ہے؟'' شکورے کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''مجھے نہیں معلوم،'' میں نے جواب دیا۔ ''کوئی تجربہ نہیں مجھے۔''

شکورے کی ماں باہر آئی، لالٹین اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ شکورا اور میں کھڑے ہو گئے۔

''توں فکر نہ کر،'' اس نے شکورے کا بازو دائیں ہاتھ سے پکڑا۔ ''بچہ پُٹھا اے، کم اوکھا اے، منظوراں سدھا پئی کرینی اے، ہو ویسی۔'' (بچہ اُلٹا ہے، کام مشکل ہے، منظوراں سیدھا کر رہی ہے، ہو جائے گا۔) وہ پھر اندر چلی گئی جہاں سے اب شیداں وقفے وقفے سے چیخ رہی تھی۔

''بے وقوف نہ بن شکورے...'' میں نے کہا، ''ایک گھنٹے میں ہم راولپنڈی جا رہے ہوں گے۔ میں...''

''اس حالت میں لے کر جائیں؟'' شکورا میری بات ختم ہونے سے پہلے چیخا۔ ''مارنا ہے

Scanned with CamScanner

شیداں کو؟''

شیداں کی چیخوں پر شکورا وحشت زدہ خوفناک آنکھوں سے کبھی مجھے، کبھی کمرے کی اس دیوار کی سمت جہاں سے شیداں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور کبھی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے وقت کی کمی کا مایوس کن احساس ہوا۔ نہ جانے رات کے کتنے بجے تھے۔ بس اندازہ تھا کہ بارہ بج چکے ہوں گے۔ کمرے سے شیداں کی چیخوں کے ساتھ عورتوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ پھر شیداں کی دونوں رشتے دار خواتین باہر آئیں۔ ان کے چہروں پر بھی خوف تھا۔ وہ گلی میں ایک سمت چلتے ہوئے اندھیرے میں روپوش ہو گئیں۔ ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ عورتیں شاید اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ شیداں کی چیخوں میں وقفہ کم ہو رہا تھا۔ اس کی چیخوں میں درد کے ساتھ خوف کا تاثر بھی تھا۔ ہوا میں کچھ تیزی سی آ گئی تھی۔ کچے مکان کی دیوار اندھیرے میں بہت بلند محسوس ہو رہی تھی۔ شکورا اب بار بار دونوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہتھیلیوں کو اٹھا رہا تھا، آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ مجھے گھڑی نہ ہونے سے بہت پریشانی تھی۔ اچانک شیداں کی بلند چیخ سنائی دی۔ شکورا گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر دائی منظوراں نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ پھر شیداں نے بلند آواز میں چیخنا شروع کر دیا۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ اعصاب شکن محسوس ہو رہا تھا۔ پھر گھر کے صحن کا دروازہ کھلا۔ موٹی دائی منظوراں ہاتھ میں لالٹین پکڑے باہر آئی۔ اس کا چہرہ خوفزدہ تھا۔

''گل میںڈے وس نی نئیں آں پترا، فتح جنگ یا پنڈی گھن ونج۔'' (بات میرے بس کی نہیں بیٹا، فتح جنگ یا راولپنڈی لے جا)۔ گاؤں میں ایک ہی جیپ تھی، ملک یار محمد ٹرانسپورٹر کی پہلی بیوی ادھیڑ عمر ملکانی کی۔ شکورا کانپ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا، پھر دائی منظوراں کی طرف۔

''ملکانی نی منت کر،'' دائی منظوراں نے کہا۔ ''جیپ دے چھوڑسی، ٹیم تھوڑا اے پتر۔'' (ملکانی کی منت کر، جیپ دے دے گی، وقت کم ہے۔)

''ٹھہر، میں ایمبولینس...'' میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ شکورا دیوانہ وار اس گلی کی طرف بھاگا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا جہاں ملکانی کی حویلی ہے۔ اندر سے شیداں کی دردناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ دائی منظوراں پھر اندر چلی گئی۔ مجھے شکورے پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میری بات مان لیتا تو ہم راولپنڈی پہنچ چکے ہوتے یا پہنچنے والے ہوتے۔ دائی منظوراں نے بچہ سیدھا کرنے کے لیے

Scanned with CamScanner

نہ جانے کیا کیا تھا، شیداں کی دلدوز چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ میرے پاس اب اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کھوڑ کے اسپتال میں جا کر ایمبولینس کے ڈرائیور کو جگاؤں۔ اس کی ڈیوٹی تو اسپتال ہی میں ہوتی تھی لیکن وہ اکثر قریب ہی اپنے کوارٹر میں جا کر سو جایا کرتا تھا۔ شکورا ابھی نہیں تھا۔ مجھ پر بے بسی کی کیفیت طاری تھی۔ شیداں کی دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ میں اٹھا، اندازہ لگایا کہ اگر میں دوڑ کر ایک کلومیٹر دور کالونی میں جاؤں تو کتنا وقت لگے گا۔ شیداں کی پھر چیخ بلند ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ دائی منظوراں ہانپتی ہوئی باہر آئی۔

''شکورا کتھایوں اے؟'' (شکورا کہاں ہے؟) اس نے مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز میں خوف تھا۔

''ملکانی نی حویلی جیپ لِھنن گیا اے'' (ملکانی کی حویلی میں جیپ لینے گیا ہے)، میں نے جواب دیا۔

''رب خیر کرے، گل بہوں وگڑ گئی اے'' (خدا خیر کرے، بات بہت بگڑ گئی ہے)، منظوراں نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔ ''شیداں تاں کھوڑ کو مپنی بھی نہ ٹپسی۔'' (شیداں تو کمپنی کی کالونی سے آگے نہ جا سکے گی۔) وہ پھر اندر چلی گئی۔

شیداں کی چیخیں نا قابلِ برداشت ہو چکی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ شکورے کے آنے پہ اسے زوردار تھپڑ ماروں۔

''اجڈ، گنوار، احمق کہیں کا!'' میرے ذہن میں اندیشہ خوف کا روپ دھار رہا تھا۔ بار بار ایک ہی خیال ذہن کو ڈس رہا تھا کہ شیداں مر جائے گی۔ میں بار بار اس خیال کو ذہن سے جھٹک رہا تھا لیکن وہ بار بار کوبرے کی طرح پھن اٹھا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وقت سے متعلق میرا اندازہ غلط نکلا۔ مشرقی افق پر دھندلاہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ اتنا وقت گزر گیا اور پتا بھی نہ چلا۔ شکورے کا کچھ پتا نہ تھا۔ شیداں کی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ گاؤں میں دور دور تک سنائی دے رہی ہوں گی۔ گاؤں کے لوگ چھتوں پر سو رہے تھے۔ مجھے ان کی بے حسی پر حیرت تھی۔ کوئی ایک عورت بھی آتی دکھائی نہ دی۔ کچھ دیر بعد نیم تاریک گلی میں شکورا کسی تصوراتی بھوت کی طرح بھاگتا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک موٹا کتا بھونکتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے بچ نما چارپائی اٹھائی۔ شکورے کی ٹانگ کے قریب پہنچا ہوا کتا ڈر کر

Scanned with CamScanner

واپس بھاگا اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا، مڑا اور پھر بھونکنے لگا۔

''ہال او— ہال او!'' شکورا ہانپتا ہوا میرے قریب آیا۔ ''ہال نی لمی ہتھیے، تھینڈی میں۔۔۔'' (ہائے ری لمبی اونٹنی، تیری میں۔۔۔)، شکورے نے دراز قد ملکانی کو گالی دی۔ شکورے نے بتایا کہ اس نے حویلی کا گیٹ بار بار کھٹکھٹایا، مدد مدد پکارا، دہائی دی، منتیں کیں، کسی نے حویلی کا گیٹ نہیں کھولا۔ شکورے کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ شیداں کی چیخوں سے گھر کی گارے اور بھوسے کی دیوار لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اپنی ٹانگوں میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ اچانک گلی میں دو عورتیں اور دو بوڑھے نظر آئے۔ دھیمی روشنی میں وہ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ میں اپنی ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شیداں کی دلدوز چیخ سنائی دی — انتہائی کربناک چیخ — لیکن کسی نوزائیدہ کے رونے کی آواز نہ آئی۔ بھیانک خاموشی چھا گئی۔ بوڑھے اور عورتیں ہمارے قریب پہنچ گئیں۔

''کے ہویا؟'' ایک بوڑھے نے پوچھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت آگے بڑھی۔ ''منظوراں کدھر اے؟'' (منظوراں کہاں ہے؟) اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، دائی منظوراں باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

''شیداں بے ہوش تھی گئی اے'' (شیداں بے ہوش ہو گئی ہے)، دائی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ڈھڈ ے اچ بچہ مر گیا اے۔ زہر پھیلی وینا اے۔ شیداں ناں ڈھڈ نیلا تھی گیا اے۔'' (پیٹ میں بچہ مر گیا ہے، زہر پھیل رہا ہے، شیداں کا پیٹ نیلا پڑ گیا ہے)۔ دونوں عورتیں تیزی سے گھر کے اندر گئیں۔ بوڑھے ہمارے پاس خاموش کھڑے تھے۔ دائی ان کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی عورتوں کے پیچھے اندر چلی گئی۔

''مولوی جی آں جگائیے؟'' (مولوی جی کو اٹھائیں؟) ایک بوڑھے نے دوسرے کو دیکھتے ہوئے بے رحمی سے کہا۔

''جگانا ای پوسی'' (جگانا ہی پڑے گا)، دوسرے نے کہا اور وہ شکورے سے ایک لفظ کہے بغیر چلے گئے۔

شکورا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں دہشت

تھی۔ پیشانی پر شکنیں بہت گہری تھیں اور بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میری ٹانگوں میں بے قابو کپکپاہٹ تھی۔ میرا وقت کا اندازہ قطعی طور پر غلط تھا۔ مشرقی افق پر دھندلاہٹ اب دھیمی روشنی میں بدل رہی تھی۔ یہ بات تو میں جان ہی چکا تھا کہ بچے کے مرجانے کے بعد اب شیداں کا بچنا اس دور دراز گاؤں میں ناممکن ہے۔ میرے ذہن میں پھن پھیلائے کوبرا پھنکار رہا تھا اور میں بے بس تھا۔ بے بسی کا یہ احساس اذیت دہ تھا۔ گھر کے اندر ہولناک خاموشی تھی جس کا سایہ باہر ہم پر پھیل رہا تھا۔ پھر عورتوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز ابھری۔ ذہن میں پھن اٹھائے ہوئے کوبرے نے بار بار میرے ذہن کو ڈسنا شروع کر دیا۔ اندر سے شیداں کی ماں کے چیخنے کی آواز آئی۔

''ہال نی مینڈیے دھیے... (ہائے رے میری بیٹی...) ہایا، ہایا، ہایا...'' شیداں کی ماں سر پیٹ رہی تھی کہ چھاتی، معلوم نہیں۔ دائی منظوراں آہستہ سے باہر آئی۔ اس بار وہ بہت تھکی ہوئی اور غمزدہ تھی۔ اس کے سارے بدن پر کپکپاہٹ تھی۔

''بہوں افسوس اے پتر، شیداں لگی گئی اے۔ دیہاڑا دیونا اے۔'' (بہت افسوس ہے بیٹا، شیداں چلی گئی ہے۔ دن تو دینا ہی ہے۔)[7]

مشرقی افق پر صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ گاؤں کے درختوں اور گلیوں سے صبح کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ شکورا تھوڑا سا آگے جھکا، دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور گھٹنوں کے بل گلی میں مٹی پر بکھرتے تنکوں پر بیٹھ گیا۔

''شکورے،'' میں نے اس کا کندھا پکڑا۔ ''شکورے...'' میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ ''حوصلہ کر شکورے، ہوش میں آ۔''

وہ تیزی سے اٹھا میرے بدن کو پیچھے کی سمت جھٹکا لگا۔ اس نے کلائی کے قریب سے میرا بازو پکڑا۔ زور سے گھوما، میں بھی اُس کے ساتھ گھوما اور اُس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

''تھینڈی میں...'' (تیری میں...) اس نے مجھے گندی گالی دی۔ میں چکر کھا کر گھر کی بیرونی دیوار سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ میری کہنی پر چوٹ آئی۔ دائی منظوراں یہ دیکھ کر جھٹکے سے دو

---

[7] یہ ایک تعزیتی جملہ ہے جو شمالی پنجاب کے دیہاتی کسی کے مرجانے پر کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے بھی تو مرجانا ہے۔

Scanned with CamScanner

قدم پیچھے ہٹی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے پر دہشت سی نمایاں ہوئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے دھب دھب کرتی گلی میں دوڑی۔ گھر کے اندر شیداں کی ماں بین کر رہی تھی، عورتیں رو رہی تھیں۔

''ہوش کریسیں شکورے!'' (ہوش میں آئے گا شکورے)[8] میں نے دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کی کہنی پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر شکورے کے قریب گیا۔ ''موت پر کسی کا زور نہیں۔ دکھ تو یہ ہے کہ ہم شیداں کو بچا نہیں سکے۔'' مجھے احساس ہوا کہ میری رندھی ہوئی آواز بیٹھ سی گئی ہے، آنکھیں دھندلا سی گئی ہیں۔ شکورے نے پوری کھلی ہوئی وحشت ناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے دونوں بازو اوپر اٹھائے، چہرہ بھی اوپر اٹھ گیا۔

''ہال اوئے کوڑیا مقدرا، تینڈی میں...'' (ہائے او جھوٹے مقدر، تیری میں...) اس نے مقدر کو گالی دی، پھر سر پر دوہتڑ مارنا شروع کر دیے۔ اسے سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ وہ ایک دم ساکت ہو گیا — بے حس و حرکت۔ میں گھبرا گیا۔

''شکورے!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''شکورے!''

شکورے کے بدن میں حرکت ہوئی۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شدید غم کا تاثر تھا۔ پھر اس نے مشرقی افق کی سمت دیکھا جہاں صبح کے اجالے میں نیلاہٹ سی پھیل چکی تھی۔ شکورے نے سر کو جھٹکا دیا، میری طرف دیکھا۔ دو قدم چل کر وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھیں، خشک آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اس نے چہرہ میرے چہرے کے قریب لا کر سرگوشی سی کی۔

''آسمان کے پیٹ میں بچہ مر گیا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شیداں کی شرارتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی جگتیں گاؤں کے کنویں میں ڈوب چکی تھیں... شیداں مر گئی ہے... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

---

8 شمالی پنجاب میں یہ جملہ مخصوص لہجے میں کسی بپھرے ہوئے شخص کو پرسکون کرنے کے لیے بولا جاتا ہے تا کہ اسے احساس ہو جائے کہ وہ کچھ غلط کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

5

میرے ذہن میں ایک پریشان کن اندیشے نے جگہ بنالی تھی۔ شکورے نے شیداں کی موت پر پاگل پن کی علامات ظاہر کردی تھیں۔ کسی بھی انسان کے صحیح الدماغ ہونے کا پتا ہیجانی کیفیت ہی میں چلتا ہے۔ ویسے تو اس دنیا میں جتنے بہیمانہ اعمال کیے جاتے ہیں سب ہیجانی کیفیت ہی میں ہوا کرتے ہیں لیکن جرائم کرنے والوں کی ہیجانی کیفیت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک سیدھے سادے دیہاتی میں جو غصے میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے، ہیجانی کیفیت وہ انداز پیدا نہیں کرسکتی جس کا مظاہرہ شکورے نے کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ غصہ ہمیشہ خوف میں بدل جایا کرتا ہے لیکن آسمان کو دیکھ کر جو جملہ شکورے نے کہا تھا، مجھے کئی دن پریشان کرتا رہا۔ وہ کہیں پاگل نہ ہوجائے، اس اندیشے سے میں بے چین تھا۔

شیداں کی موت کے بعد شکورا خاموش ہوگیا۔ پانچ چھ دن بعد وہ دکان پر بے دلی سے کام کرتا نظر آیا۔ وہ نہائی کے پیچھے چوکی پر خاموش بیٹھا رہتا تھا، مایوس، غمزدہ۔ وہ گاہکوں سے بھی ہوں ہاں میں بات کرتا تھا۔ نہائی کے پاس انگیٹھی میں کوئلے دہکتے رہتے تھے۔ وہ بے دلی سے سنگل اور زنجیریں بناتا رہتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ معاش کے کھونٹے پر ضرورتوں کی حلقے بناتی ہوئی زنجیر سے بندھا ہوا مویشی ہے۔ کبھی دھونکنی دھونکتا تھا تو کوئلوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چنگاریاں اڑ اڑ کر اس کے دل پر گر رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ہر وقت کرب سا رہنے لگا تھا۔ شیداں کی موت کے بعد ساتویں دن میں بازار کے احاطے میں شکورے کا پتا کرنے گیا۔

''وہ خاموش ضرور ہے،'' ہوٹل کے مالک شیر علی نے مجھے بتایا، ''لیکن صبح ناشتے کے لیے آتا ہے، دوپہر کھانے کے لیے آتا ہے۔ رات کو وہ پورا کھانا نہیں کھاتا، چھوڑ جاتا ہے... صاب... وہ شیداں کے ساتھ ہی مر گیا ہے۔''

''تم اس سے باتیں کیا کرو،'' میں نے کہا۔ ''اگر اس نے باتیں شروع کردیں تو آہستہ آہستہ...''

اچانک ہوٹل کی پچھلی گلی میں شور مچا۔ میں اور شیر علی بھاگ کر پچھلی گلی میں گئے۔ شکورے کی دکان کے سامنے تین چار دیہاتی کھڑے تھے۔ وہ حیرت زدہ بھی تھے اور مسکرا بھی رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

شکورے پر پاگل پن کر دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا، غصے میں اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ ماتھے پر شکنیں نمایاں تھیں۔

''ہال اوکوڑیے تقدیرے، ھینڈی میں...'' (ہائے او جھوٹی تقدیر، تیری میں...) شکورا خالی نہائی پر ہتھوڑا زور زور سے مار رہا تھا۔ اس کی ہر گالی ہتھوڑے کی ضرب پر ختم ہو رہی تھی۔ ہتھوڑا نہائی پر دھما دھم بج رہا تھا۔

''ہال نی تھلیے کھوتے، ھینڈی میں...'' (ہائے ری موٹی گدھی، تیری میں...) اس نے دائی منظوراں کو گالی دی۔

''ہال نی لمی ہتھلیے، ھینڈی میں...'' (ہائے ری لمبی اونٹنی، تیری میں...) یہ گالی دراز قد ملکانی کے لیے تھی۔

''ہال او ہڈل کھچریا، ھینڈی میں...'' (ہائے او ہڈیوں والے خچر، تیری میں...) اس نے ماسٹر محمد جان کو گالی دی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ اسے روکوں، لیکن وہ ہتھوڑا نہائی پر پٹخ پٹخ کر گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو روکنے کے لیے دکان کے اندر جانے کی کوشش کی لیکن شیر علی نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

''نہیں صاب،'' اس نے چیخ کر کہا، ''یہ غلطی نہ کریں! ہتھوڑا آپ پر بھی لگ سکتا ہے۔ وہ ہوش میں نہیں ہے۔''

دورہ پینتیس منٹ کا تھا۔ پھر وہ نڈھال سا ہو کر پیچھے کی سمت گر گیا۔ میں نے دکان میں جا کر ایک سمت پڑے مٹی کے گھڑے سے پانی نکالا۔ مٹی ہی کے ہٹھل (پیالے) کو اس کے ہونٹوں پر لانے سے پہلے میں نے اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً پیالہ پکڑا اور سارا پانی پی گیا۔

''توکب آیا ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اسے اسپتال لے چلوں لیکن اس نے ایک بالکل تندرست انسان کی طرح دھونکنی کو پکڑا۔

Scanned with CamScanner

''شام کو آنا،'' شکورے نے دھونکنی چلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ وقت کام کا ہے۔''

وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مجھے پریشانی کے ساتھ ساتھ یہ خیال تسلی دے رہا تھا کہ شکورے نے بولنا تو شروع کر دیا ہے۔

پھر یہ سلسلہ پوری شدت سے چل نکلا۔ ہفتے میں کسی ایک دن شکورے پر دورہ پڑنے لگا۔ عموماً سہ پہر کے وقت اس کی وحشت زدہ غصیلی آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں۔ وہ نہائی پر ہتھوڑے کو مار مار کر گالیاں دیتا تھا۔ ایک اور تماشا یہ ہوا کہ اس کا پڑوسی نثار خان اگر سہ پہر کو گھر میں ہوتا تھا تو وہ باہر نکل کر شکورے کی دکان کے قریب کھڑے ہو کر اسے پشتو میں گالیاں دینے لگتا تھا۔ یہ دوہرا تماشا بازار کے لوگوں کے لیے مفت کی تفریح بن گیا۔ جب بھی شکورے پر دورہ پڑتا تھا، سارے بازار کے لوگ وہاں بھیڑ سی لگا دیتے تھے۔ دکاندار اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگتے تھے۔ ان کے گاہک، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے کا عملہ، بسوں کے ڈرائیور، کنڈکٹر اور یہاں تک کہ مسافر بھی شکورے کی دکان کے آگے کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھتے تھے، خوب ہنستے تھے اور گلی قہقہوں سے گونجنے لگتی تھی۔ شکورا بھیڑ کو دیکھ کر انتہائی غصے میں اٹھ کر دروازہ بند کر دیا کرتا تھا۔ پھر اس نے دروازہ بند کرنا بھی چھوڑ دیا۔ غم و غصے کے سوا اسے کسی اور کیفیت کا احساس ہی نہیں رہتا تھا؛ شاید غم و غصے کا بھی نہیں، ورنہ وہ اس قدر شدید دیوانگی کا مظاہرہ نہ کرتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ تصور میں اپنے ایذا رسانوں کے چہروں کو نہائی پر دیکھتا ہے اور ہتھوڑا مار مار کر ان کا کچومر نکالتا ہے۔ شاید یہی انتقام تھا جو وہ بے بسی میں لے سکتا تھا۔ شکورے کی دوسری شادی ممکن نہ رہی تھی، وہ سنکی اور پاگل مشہور ہو چکا تھا، لیکن جبلی تقاضے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی حیاتی زندگی کو آسودہ کرنے کے لیے اس نے شیداں کی موت کے بعد جلد ہی کھوڑ گاؤں کی واحد فاحشہ عورت ذکو (ذکیہ) سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔

6

یہ وہی ذکو (ذکیہ) تھی جو بچپن اور لڑکپن میں شیداں کی گہری سہیلی تھی۔ میں اسے بچپن اور لڑکپن میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ وہ گاؤں کی شادیوں میں عورتوں کے جھرمٹ میں ناچتے ہوئے اس قدر تیزی سے گھومتی تھی کہ دیہاتی عورتیں اپنے دوپٹے پکڑ کر ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا کرتی تھیں۔ ذکو کو سب

'پھرکی' کہنے لگ گئے اور وہ 'ذکو پھرکی' مشہور ہوگئی۔ سانولی، تیکھے نقوش والی، دبلی پتلی، لمبی آنکھوں اور لمبے لمبے بالوں والی ذکو پھرکی جب چلتی تھی تو اس کے بدن کا حسن نکھر جاتا تھا۔ وہ گاؤں کی چند خوبصورت ترین لڑکیوں میں شمار کی جاتی تھی۔ شیداں نے ذکو پھرکی کے ساتھ بچپن گاؤں کی گلیوں میں گیٹے [9] کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ ریتیلے میدان میں سانڈے پکڑنے کا تماشا دیکھا تھا، کنویں پر پانی بھرتے ہوئے لڑکپن کے قہقہے لگائے تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی جوانی کی امنگوں سے آشنا ہوئی تھیں۔ ذکو پھرکی کے عاشق بہت تھے۔ ملکوں کے بیٹوں سے لے کر مصلیوں کے بیٹوں تک ہر نوجوان ذکو پھرکی کو چاہتا تھا۔ کالونی میں رہنے والا احمد خان ڈھولی بال بچوں والا ہوتے ہوئے بھی ذکو پھرکی پر مرتا تھا۔ ذکو کا باپ اس کے بچپن ہی میں مر گیا تھا۔ وہ زبردست کلارنٹ نواز تھا لیکن جلد ہی وہ سانس کی بندش کا مریض بن گیا۔ پھر یہی بیماری عارضۂ قلب میں بدلی اور اس کی موت کا باعث بن گئی۔ مرنے سے چند برس پہلے ذکو کے باپ نے گاؤں کے باہر شمال میں کالونی کے رخ پر کنویں سے کچھ پہلے پانچ مرلے زمین خرید کر مکان بنوالیا تھا۔ ذکو کا بچپن اور لڑکپن اسی گھر کی چاردیواری میں گزرا تھا، یہیں اس پر جوانی اتری تھی۔ پھر ذکو کی ماں بھی مر گئی اور ذکو اپنی ماسی (خالہ) کے گھر رہنے لگی۔ مہینے میں ایک بار وہ اپنے آبائی گھر آ کر صفائی کر جاتی تھی۔ پھر ایک دن رشتہ مانگنے پر اس کی ماسی نے رحمت ڈھولی کو زبان دے دی۔ ادھیڑ عمر کا رنڈوا رحمت ڈھولی اپنے فن کا ماہر تھا۔ کھوڑ گاؤں، آس پاس کے دیہات، یہاں تک کہ پنڈی گھیب اور فتح جنگ میں بھی کوئی شادی، میلہ، کھیل اور عرس رحمت ڈھولی کے بغیر پھیکا سمجھا جاتا تھا۔ وہ احمد خان ڈھولی کا رشتہ دار بھی تھا اور حریف بھی، لیکن احمد خان ڈھولی اس کے فن کا معترف تھا۔ ایک بار احمد خان ڈھولی نے مجھ سے کہا:

''صاب، دھنی کے علاقے نے تین ڈھولی ہی پیدا کیے ہیں۔ ایک خدابخشے حاصل گاؤں کا بابا مستی خان تھا جس کا جوڑ تو کبھی پیدا نہیں ہوگا، ایک رحمت ہے اور میں۔ لیکن صاب، رحمت کی پھمن

---

[9] یہ چھوٹے چھوٹے گول پتھروں کا ایک کھیل ہے جو دیہاتی بچیاں کھیلا کرتی ہیں۔ چھ پتھر زمین پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ ایک قدرے بڑا پتھر دائیں ہاتھ سے اچھالا جاتا ہے۔ کچھ بچیاں بائیں ہاتھ کا استعمال کرتی ہیں۔ بڑے پتھر کو زمین پر گرنے سے پہلے دبوچنا ہوتا ہے، لیکن اس بہت کم عرصے میں چھ پتھروں میں ایک پتھر اٹھانا بھی ہوتا ہے۔ جو بچی چھ پتھر گرائے بغیر اٹھا لے وہ جیت جاتی ہے۔ یہ صرف کھیل ہی نہیں، ہاتھ کی اہم ورزش بھی ہے۔

Scanned with CamScanner

تال[10] تو مجھے بھی بے تالا کر دیتی ہے۔"

رحمت ڈھولی لمبی کبڈی[11] میں پیچھا کرتے ہوئے دو کھلاڑیوں کو چکما دے کر یا گرا کر آنے والے کھلاڑی کے گرد گھوم گھوم کر، ڈھول بجایا کرتا تھا۔ اگر پکڑنے والے بھاگنے والے کھلاڑی کو گھسیٹتے ہوئے لے آتے تھے تو بھی رحمت ڈھولی اِدھر اُدھر مٹک مٹک کر ڈھول بجاتا رہتا تھا۔ میلوں میں، بیلوں کی دوڑ کے بعد، وہ جیتنے والے دھنی کے خوبصورت کالے چٹے، چھوٹے چھوٹے سینگوں والے، نتھنے کھول کھول کر سانس لیتے بیل کے سامنے بے خوفی سے کھڑا ہو کر دیر تک ڈھول کی کنار[12] بجاتا رہتا تھا، جیسے اس دھیمی دھیمی سکون بخش تال سے بیل کو خوش کر رہا ہو۔ عرسوں پر وہ ڈھول بجاتے ہوئے خود بھی ناچتے ہوئے ملنگوں کے ساتھ دھمال ڈالا کرتا تھا۔

رحمت ڈھولی کی بیوی جوانی ہی میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ جب اس کی بیوی گاراں (گوہر بی بی) ملیریا میں مبتلا ہوئی اور دو تین دن بخار نہ اترا تو رحمت ڈھولی کالونی کے بازار سے دو روپے کی کونین کی گولیاں لانے کے بجائے پیر مراد شاہ کو پچیس روپے ہدیہ دے کر کالا دھاگہ دم کرا کے لے آیا۔ اس نے دھاگہ گاراں کی کلائی پر باندھ دیا۔ گاراں کا بخار علاج نہ ہونے پر بڑھتا گیا اور پھر ایک سو چھ ڈگری سے تجاوز کر گیا۔ گاراں بیہوشی کی حالت میں مر گئی۔ جب اسے دفن کیا گیا، کالا دھاگہ اس کی کلائی پر بندھا ہوا تھا۔ پیر مراد شاہ کے ملنگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ گاراں کی موت کی وجہ اس کا کوئی گناہ ہے۔

رحمت گاراں کے غم میں نڈھال تھا۔ اس نے چرس پی کر ساری برادری کے سامنے اعلان کیا کہ وہ زندگی بھر نہ شادی کرے گا نہ کسی عورت کے پاس جائے گا۔ آہستہ آہستہ وہ چرس کا عادی بن گیا لیکن اپنے اعلان پر سختی سے قائم رہا۔ چرس کی بری عادت کے باوجود وہ باکردار تھا۔ سانولا، لمبے قد اور دبلے پتلے بدن والا، چوڑی پیشانی، مناسب آنکھوں اور سیدھی ناک والا رحمت ڈھولی جوانی میں

---

10 چھمن تال ڈھول کی وقفے وقفے سے تیز اور آہستہ ہونے والی خوبصورت تال کا دیہاتی نام ہے۔

11 لمبی کبڈی میں کوئی قانون یا اصول نہیں ہوتا۔ دو کھلاڑی ایک کو دور دور تک دوڑا کر پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، چانٹوں، گھونسوں اور لاتوں کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔

12 ڈھول کے گول حصے کی انتہائی لگر۔

Scanned with CamScanner

بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا لیکن چرس کی عادت نے اب اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اس کے جسم کی کوئی ہڈی ایسی نہ تھی جو نمایاں نہ ہو۔ بیضوی چہرے پر جبڑے کی ہڈیاں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ جب گاراں مری تھی، وہ تیس برس کا تھا۔ پندرہ برس اپنے اعلان پر قائم رہنے والا رحمت ڈھولی پینتالیس برس کی عمر میں ذکو پھرکی کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے اعلان پر قائم نہ رہ سکا اور ذکو کی ماسی سے رشتہ مانگ لیا۔ رحمت کی ماں مر چکی تھی، باپ نہیں تھا؛ ایک چھوٹا بھائی تھا جو محلہ گنگ میں بیوی بچوں کے ساتھ مدتوں پہلے گھر خرید کر وہاں ایک بینڈ میں شامل ہو گیا تھا۔ ماسی نے یہ سوچ کر کہ ذکو اکیلی بہت خوش رہے گی اور رحمت کے پاس کافی روپے بھی ہوں گے، رشتہ منظور کر لیا۔ رحمت مدتوں سے ماچھن [13] بھاگاں (بھاگ بھری) کے تندور پر کھانا کھایا کرتا تھا۔ بھاگاں ایک بڑے سے دیگچے میں ہر روز دال سبزی اور کبھی کبھی گوشت بھی پکاتی تھی۔ کھوڑ گاؤں کے اکثر لوگ ہر روز دوپہر اور رات کے وقت بھاگاں کے ہوٹل نما تندور پر کھانا کھاتے ہیں۔ وہ ماش کی دال بہت ہی مزیدار بنایا کرتی تھی۔ میں نے شکورے کے ساتھ کئی بار بھاگاں کے تندور پر ماش کی دال کھائی تھی۔ مجھے اس کا ذائقہ کبھی نہیں بھولا تھا— آج بھی یاد ہے۔

گاؤں کے نوجوانوں نے حیرت اور غم میں بہت آنسو بہائے ہوں گے کیونکہ ذکو پھرکی نے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔ ذکو اور رحمت ڈھولی کی شادی ہو گئی۔ احمد خان ڈھولی فرقہ واریت سے مایوس تھا۔ احمد خان کی ماں شیعہ تھی لیکن باپ سنی تھا۔ انھوں نے بھاگ کر شادی کی تھی۔ ذکو پھرکی کا تعلق اہلِ تشیع سے تھا۔ برادری والے احمد خان کو سنی ہی سمجھتے تھے۔ ذکو سے اس کی دوسری شادی ممکن نہ تھی، پھر بھی عشق کی آگ میں جھلتے ہوئے اس نے ذکو پھرکی، کی شادی پر جس والہانہ انداز میں ڈھول بجایا، گاؤں والوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ذکو پھرکی اور رحمت ڈھولی چھ ماہ ہی ساتھ رہ سکے۔ رحمت کافی سنبھل گیا تھا۔ وہ چرس بھی بہت کم پینے لگا تھا لیکن ایک دن چرسیوں کی محفل میں ضد میں آ کر اپنی برداشت اور دلیری دکھانے کے لیے اس نے سگریٹ کے بجائے چار پانچ سگریٹوں کی چرس چلم [14] میں ڈال کر اس قدر دھواں اپنے پھیپھڑوں میں اتارا کہ اسے گھر کی طرف جاتے ہوئے

---

[13] تندور پر روٹیاں لگانے والی۔

[14] سیدھا حقہ جو عموماً شمالی پنجاب اور خیبر پختونخوا میں پیا جاتا ہے۔

ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ گھر کے قریب گلی میں گر کر مر گیا۔ ذکو رنڈی ہو گئی۔

تین مہینے گزر گئے، کسی نے ذکو کی خبر نہ لی۔ وہ رحمت ڈھولی کے گھر پر تالا لگا کر اپنے آبائی گھر میں آ گئی۔ ایک صبح اس کے کسی رشتے دار نے گاؤں کے ایک اوباش نوجوان کو ذکو پھرکی کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ برادری میں شور مچ گیا۔ بوڑھے جوان ادھیڑ عمر کے میراثی اور ان کی عورتیں، استاد خادم حسین سرنائی والے کے گھر جمع ہوئے۔ کالونی سے احمد خان ڈھولی بھی گیا۔ ذکو پھرکی کو بھی بلایا گیا۔ اس اکٹھ کی روداد مجھے احمد خان ڈھولی نے سنائی تھی۔ استاد خادم حسین سرنائی والے نے اٹھ کر کہا:

''ہم دھاڑی[15] ہیں، کنجر نہیں۔ ذکو کی حرکت سے ہم بہت بے عزت ہوئے ہیں۔ ذکو کا باپ دھاڑی تھا، کنجر نہیں تھا۔ ذکو کی ماں شریف تھی، ہماری بہن تھی۔ ذکو کا باپ ہمارا بھائی تھا۔ ہمارے دادے پردادے تو ربابیے[16] بھی تھے۔ وہ راجہ رنجیت سنگھ جی کے وقت حسن ابدال جا کر گوردوارہ پنجہ صاحب پر شبد کیرتن کیا کرتے تھے۔ اور یہ ذکو، اس نے تو ہمارے سروں کو ننگا کر دیا ہے۔ ہمارے چہروں پر کالک مل دی ہے۔ کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ ہم تو اپنی عورتوں کو اس گھر میں نہیں جانے دیتے جہاں کسی مرد سے متعلق شک ہو کہ اچھا آدمی نہیں ہے، اور اس کلموہی نے نہ صرف اپنے منہ پر کالک ملی ہے بلکہ ہمارے دادے پردادے، سب کے منہ پر کالک تھوپ دی ہے۔ مولا علی مشکل کشا ہماری مشکل دور کرے... ہماری مدد کرے... ہم تو برباد ہو گئے... ہماری لڑکی اور کنجری... ہماری لڑکی اور پیشہ...''

اس سے پہلے کہ کوئی اور بولتا، ذکو پھرکی نے اپنا دوپٹہ اتار کر استاد سرنائی والے کے قدموں میں پھینکا۔

''ہاں کیا!'' ذکو پھرکی نے بلند آواز میں کہا۔ ''کیا پیشہ، اور کرتی رہوں گی۔ تین مہینے ہو گئے ہیں، پوچھا کسی نے کہ ذکو کس حال میں ہے؟ گھر میں آٹا نہیں، دال نہیں، چاول نہیں، گڑ نہیں، گھی کا ڈبا

---

[15] میراثی لوگ گانے بجانے والے خاندانی فنکاروں کو دھاڑی کہتے ہیں اور دیگر فنکاروں کو عطائی کہا کرتے ہیں۔

[16] ربابیے وہ میراثی کہلاتے ہیں جو گوردواروں میں شبد کیرتن کے ماہر ہوتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے باوجود وہ سکھوں کی نگاہوں میں بہت باعزت ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

خالی ہے، چولھا جلانے کے لیے لکڑیاں نہیں — پوچھا کسی نے کہ ذکو، کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟'' ذکو کی آواز روہانسی ہوگئی۔ ''چاول کی ایک پیالی ماسی سے مانگنے گئی تو اس نے بھی نہ دی۔'' ذکو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''گاؤں میں تین مہینوں سے نہ کوئی بچہ پیدا ہوا ہے نہ جھنڈ اتری (عقیقہ ہوا) ہے نہ ہی شادی ہوئی ہے، نہ ہی کوئی اور کوئی خوشی، ورنہ میں کرماں پٹی (بدنصیب) خالی پیٹ ہی نچ مرلیتی۔'' ذکو رونے لگی۔ ''کچھ روپے جو رحمت چھوڑ گیا تھا، وہ بھی نہ ہوتے تو میں تین مہینے بھی نہ گزار سکتی... بھوکی مرگئی ہوتی... کیا کروں میں؟'' ذکو نے چیخ کر کہا۔ ''بولو کیا کروں؟ پھا (پھانسی) لے لوں یا موہرا پھک لوں (زہر کھالوں)؟ کیا کروں؟... مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟'' پھر ذکو پھرکی نے ہتھیلی سے آنسو پونچھے اور ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔

''چار گہنے ہیں میرے پاس... پر کیوں بیچوں؟... بولو میں اپنے گہنے کیوں بیچوں؟... جوان ہوں، خوبصورت ہوں۔ ماسی نے اور تم لوگوں نے مجھے رنڈے (رنڈوے) چرسی سے بیاہ دیا۔ میں چپ رہی۔ چرسی تھا لیکن اچھا آدمی تھا۔ چار پیسے کما تو لاتا تھا۔ چولھا جل رہا تھا میرا۔ صبر تھا مجھ میں۔ خوش تھی میں رحمت کے ساتھ۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟... کہاں جاؤں؟... کیا کروں میں؟'' وہ پھر چیخی۔ ''میری طرف دیکھو... سر کیوں جھکا لیے ہیں؟ جوان ہوں، خوبصورت ہوں... بولو، ہے کوئی تم میں... ہے کوئی جو میرا ہاتھ پکڑ لے؟ جوان، پکی عمر کا، بڈھا... کوئی بھی... بولو، ہے کوئی؟... کرلوں گی!'' ذکو نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ ''کرلوں گی شادی۔ بولو، ہے کوئی؟...''

سب خاموش ہوگئے۔ جوانوں کو ذکو پھرکی پر غصہ تھا کہ اس نے رحمت ڈھولی کے لیے ہاں کیوں کہی تھی، ادھیڑ عمر کے شادی شدہ اپنے بال بچوں کے ساتھ سکھی تھے، بوڑھوں کو شاید اپنی عمروں کا خوف تھا۔ سب خاموشی سے ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہے اور یہ اکٹھ اس فیصلے پر ختم ہوا کہ کوئی بھی ذکو پھرکی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ ذکو پھرکی برادری سے خارج ہوگئی۔ اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ احمد خان ڈھولی نے بتایا کہ اکٹھ کے بعد ایک نوجوان نے اپنے دوستوں سے کہا:

''چوپی ہوئی گنڈیری ناں پھوگ کون چوپیسی۔ سارا رس تاں رحمت چرسی پی گیا ہوسی۔ اس حرامیے کے چھوڑیا ہوسی ہن کتی ناں ہتھ کون نپے!'' (چسی ہوئی گنڈیری کے پھوک کو کون چوسے گا۔

سارا رس تو رحمت چرسی پی گیا ہوگا۔ اس حرامی نے باقی کیا چھوڑا ہوگا۔ اب کتیا کا ہاتھ کون پکڑے۔)

ہر عمر کے لوگ ذکو پھر کی کے پاس جانے لگے۔ اردگرد کے دیہات سے بھی دیہاتی ذکو پھر کی کے گاہکوں میں شامل ہو گئے۔ اس کے پرانے تمام عاشق جو اس سے شادی کرنا چاہتے تھے، اب اس کے گاہک بن گئے، پیسے دے کر آسودگی حاصل کرنے لگے۔ کمپنی کالونی کے کچھ چھڑے بھی چھپ چھپا کر ذکو پھر کی کے در آسودگی پر دستک دینے لگے۔ شکورے کو تو کسی کا خوف نہیں تھا۔

ذکو پھر کی کو برادری سے خارج کرنے کے بعد بھی بوڑھے میراثیوں کا غصہ نہ اترا۔ کھوڑ کے تھانے میں پنڈی گھیب سے ٹرانسفر ہو کر ایک چوڑے منھ، چھوٹے قد اور موٹی توند والا تھانیدار آیا۔ استاد سرنائی والے کے ساتھ چند ادھیڑ عمر کے میراثی کالونی میں آئے، احمد خان ڈھولی کو ساتھ لیا اور تھانیدار کے پاس جا کر ذکو پھر کی کے خلاف شکایت کی۔ تھانیدار خود ذکو پھر کی کے گھر گیا اور اگلے روز اس نے میراثیوں کے وفد کو بلا کر ان کی بہت بے عزتی کی۔

''ایک بیوہ کو ستاتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟'' تھانیدار نے غصے سے کہا۔ ''اس کی شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟ اگر کچھ لوگ خیرات دینے یا صدقہ لے کر اسے بیچاری کے دروازے پر چلے جاتے ہیں تو تمھیں کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ خود تو اس کی مدد کر نہیں سکتے، اگر کوئی کرتا ہے تو تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ تم لوگ تو یہی چاہتے ہو کہ ساری خیرات، زکواۃ اور صدقے کی رقم صرف تمھیں ملے... چلے جاؤ... دوبارہ میرے پاس نہ آنا۔''

احمد خان ڈھولی نے بعد میں بتایا کہ جب سب میراثی منھ لٹکائے تھانے سے واپس آ رہے تھے، استاد سرنائی والے نے دوسروں کی طرف دیکھ کر کہا:

''لو بھائی... ذکو نے تاں تھانیدار بھی ڈھا گدا اے۔'' (لو بھائی، ذکو نے تو تھانیدار بھی گرا لیا ہے۔)

''کیویں نہ ڈھاندا، کتی سوہنی جے بہوں اے!'' (کیسے نہ گرتا، کتیا خوبصورت جو بہت ہے!) ایک اور بولا۔ اور اس کے بعد ذکو باقاعدہ پیشہ ور طوائف بن گئی۔

شکورے نے مجھے بتایا کہ ذکو اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس نے ہفتے کی ایک رات شکورے کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس رات وہ کسی کو گھر میں نہیں گھسنے دیتی، بیماری کا یا سر درد کا بہانہ

Scanned with CamScanner

بنا لیتی ہے۔ شیداں کو یاد کرتے ہوئے بہت روتی ہے۔ شکورا بھی ذکو پھرکی کے پاس باقاعدگی سے جانے لگا۔ وہ جس باقاعدگی سے ذکو پھرکی کے پاس جاتا تھا، اسی باقاعدگی سے اس پر پاگل پن کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ اسے زندگی میں جس جس نے بھی دکھ دیے تھے، وہ ان سب کو غلیظ گالیاں دیتا تھا۔

ایک آنکھ والا اسحاق سپیال گاؤں سے سائیکل پر بندھے ایک ٹوکرے میں سبزی لاکر کالونی کے کوارٹروں میں بیچا کرتا تھا۔ ایک دن شکورے نے بازار کے احاطے میں اس سے اٹھارہ روپے کی سبزی خریدی۔ شکورے کے پاس سو روپے کا نوٹ تھا۔ اسحاق نے کہا کہ "میرے پاس بقایا کے لیے کھلے پیسے نہیں۔ تو دکان پہ جا، میں نوٹ تڑوا کر تیرے بقایا بیاسی روپے دے جاؤں گا۔" شکورا دکان پر آ گیا۔ شام ہو گئی، اسحاق نہ آیا۔ ساری رات شکورا پریشان رہا اور صبح پیدل ہی سپیال جا پہنچا۔ اسحاق کے گھر گیا تو پتا چلا کہ وہ تو کل شام ہی راولپنڈی چلا گیا ہے: اسے کوئی نوکری مل گئی ہے۔ شکورے نے پیسے مانگے تو اسحاق کے بھائی نے آنکھیں دکھائیں۔

"کیسے پیسے؟ تو نے مجھے نوٹ نہیں دیا۔ حقی بات ہے، جس کو دیا، اس سے لے۔ ساکا (اسحاق) آئے گا تو کہہ دوں گا۔"

شکورا جلا بھنا غصے سے بڑبڑاتا واپس آیا۔ اسی سہ پہر اس پر دورہ پڑ گیا۔

"ہال اوساکیا کانیا، تہینڈی میں..." (ہائے او ساکے کانے، تیری میں...)

اس کا ہتھوڑا انہائی پر پوری قوت سے گر رہا تھا۔ شکورا اکثر تصوراتی جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کو بھی گالیاں دیتا تھا۔

"ہال او چٹیا باندرا، تہینڈی میں..." (ہائے او سفید بندر، تیری میں...) شاید یہ گالی پڑوسی نثار خان کے لیے تھی۔

"ہال او کن کپیا بولیا، تہینڈی میں..." (ہائے او کان کٹے بُولی کتے، تیری میں...)

"ہال او ڈھوڈر کانواں، تہینڈی میں..." (ہائے او پہاڑی کوے، تیری میں...)

"ہال او ننگیا ککڑا[17] تہینڈی میں..." (ہائے او ننگے مرغے، تیری میں...)

[17] اصیل مرغوں کی ایک قسم جس کی گردن پر صرف گہرا سرخ رنگ نظر آتا ہے، پر نہیں ہوتے۔

Scanned with CamScanner

''ہال نی پچھ پکی کریے، ہمینڈی میں...'' (ہائے ری دم کٹی چھپکلی، تیری میں...)

یوں لگتا تھا کہ اس کے تصور میں تصویروں کے فریم چل رہے ہوتے تھے، وہ جسے اپنے تصور میں دیکھتا تھا اسی کو گالی دیتا تھا۔ اس کی انھی گالیوں کو سننے اور اس کا تماشا دیکھنے کے لیے دکان کے سامنے ہجوم سا ہو جایا کرتا تھا۔ دیہاتی زور زور سے ہنستے، قہقہے لگاتے، اسے بلاّ شیری بھی دیا کرتے تھے۔

7

سکائی لیب میں شکورے کی دلچسپی سے میرے ذہن میں ایک ہی اندیشہ تھا: کہ کیا وہ عمومی حالت میں ذہنی طور پر تندرست ہے؟ سکائی لیب گرنے کی باتیں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔

''زمین پر خشکی کے مقابلے میں پانی کہیں زیادہ ہے،'' میں نے سوچا۔ ''امکان تو یہی ہے کہ سکائی لیب کسی سمندر میں گرے گی — بحر الکاہل یا بحرِ اوقیانوس میں۔ ممکن ہے کہ قطبین کی برف پر گرے۔ لیکن اگر وہ کسی ملک کی آبادیوں پر گری تو خاصا جانی اور مالی نقصان ہوگا۔''

شکورے کے دیوانے پن کا باعث تو میں جان ہی چکا تھا، تصدیق ہونا باقی تھی۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے: یا تو اسے اس پاگل پن سے نکلنے کی کوشش کروں یا اس کے دیوانے پن کا ساتھ دوں۔ مجھے اب صرف تصدیق کی ضرورت تھی۔ 11 جولائی کو صبح خبروں میں بتایا گیا کہ سکائی لیب گیارہ اور بارہ جولائی کی درمیانی رات میں زمین پر گرے گی۔ سہ پہر کو میں شکورے کے پاس گیا۔ جولائی کی سہ پہر جس تپش کو پھیلاتی ہے وہ شام تک بدن کو پسینے سے بھگوئے رکھتی ہے۔ مجھے دیکھ کر شکورے کی نیم وا آنکھیں چمکیں۔ پسینے سے اس کا کرتا اس کے سینے اور پیٹ سے چپکا ہوا تھا۔ وہ دکان سے باہر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔

''جو بات میں تجھ سے کرنے لگا ہوں،'' اس نے ایک موڑھا کھینچ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا، ''اسے مذاق نہ سمجھنا۔''

وہ چوکی پر بیٹھ گیا اور دکان سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر تجسس نمایاں تھا۔ وہ کچھ دیر دکان سے باہر دیکھتا رہا، پھر اس نے میری طرف کھلی آنکھوں سے دیکھا۔

''سکلیب کس چیز کی بنی ہوتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

Scanned with CamScanner

''کیا سکائی لیب؟''میں نے بھی پوچھا۔

''ہاں — سکلیب — کس چیز کی بنی ہوتی ہے؟''شکورے کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔

''مجھے نہیں معلوم،''میں نے کہا۔''شاید المونیم کی ہو یا شاید ایزبسٹاس (Asbestos) کی، کرائسوٹائیلز (Chrysotiles) سے ڈھکے اسٹین لیس اسٹیل کی۔ اندر سے تو فائبر گلاس ہی کی ہوگی۔''

شکورے کے چہرے پر غصہ سا ابھرا۔

''مجھ پر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا رعب نہ ڈالا کر!''اس نے غصے سے کہا اور مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ میں کس کے سامنے قیاس آرائی کر رہا ہوں۔

''سیدھی طرح بتا، سکلیب کس چیز کی بنی ہوگی؟''شکورے کا لہجہ دھیما ہو گیا۔''لوہے کی ہوگی یا نہیں؟''

''ہاں، لوہے ہی کی ہوگی،''میں نے کہا اور شکورے کے چہرے پر خوشی سی دوڑ گئی۔ اس نے پھر باہر دیکھا، کچھ دیر خاموش رہا، پھر آگے کی سمت جھک کر اس نے چہرہ میری طرف اٹھایا۔

''کشف ہوا ہے مجھے...''اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔''جانتے ہو، کشف کیا ہوتا ہے؟ صبح جاگنے سے پہلے جو خواب آئے وہ کشف ہوتا ہے — بالکل سچا خواب... آج صبح خواب میں پیر مراد شاہ آئے تھے۔ پیر جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تیرے سب دکھ دور ہونے والے ہیں۔ سکلیب کھوڑ کی بنی میں گرے گی — اُدھر...''شکورے نے جنوب مغرب کی سمت اشارہ کیا۔ شکورے کے دیوانے پن کے باعث سے متعلق میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ تصدیق ہو گئی۔ اب میری آنکھیں بھنچ سی گئیں۔

''شکورے،''میں نے آہستہ سے کہا،''اُدھر تو بنگلوں میں، سرونٹ کوارٹرز میں، پولیس اسٹیشن اور کمپنی کے دفاتر ہیں۔ کئی لوگ ہوں گے بنگلوں اور سرونٹ کوارٹرز میں۔ کئی لوگ بال بچوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ پولیس اسٹیشن میں رات کی ڈیوٹی دینے والے سپاہی بھی ہوں گے، دفاتر میں شفٹ کے چوکیدار بھی ہوں گے۔''

''انھیں کچھ نہیں ہوگا،''شکورے نے کہا۔''سکلیب بنی میں گرے گی اور پیر جی نے کہا ہے کہ

وہ میری ملکیت ہوگی۔'' شکورے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں خوشی کی چمک۔

جنوب مغرب کی جانب، بنگلوں کی قطار میں دوسرے بنگلے سے میری بچپن کی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ مدتوں پہلے میں وہاں والد صاحب، والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بنگلوں کے پیچھے سرونٹ کوارٹرز ہیں اور سرونٹ کوارٹرز سے بیس قدم آگے پہاڑی کی ڈھلوان نظر آتی ہے۔ پہاڑی کے پیچھے جوہڑ ہے جسے مقامی زبان میں بنّی کہا جاتا ہے۔ جوہڑ کی تین طرفیں تین پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہیں اور مشرق کی جانب بنّی کا کنارہ کھلا ہے۔ اس کھلے کنارے کے آگے اجاڑ میدان ہے جو جھاڑیوں سے اٹا ہوا ہے۔ برساتی جوہڑ کی مغربی سمت میں درمیانی پہاڑی میں ایک دراڑ سی ہے۔ یہ دراڑ دراصل پہاڑی کے پیچھے ایک برساتی نالے کا دہانہ ہے۔ برسات کے دنوں میں اس دراڑ سے گدلا پانی جوہڑ میں جھرنے کی طرح گرتا ہے اور جوہڑ کو بھرتا رہتا ہے۔ جوہڑ دس بارہ فٹ گہرا ہے۔ زیادہ بارش کے دنوں میں جوہڑ کا پانی مشرقی کنارے سے بہہ نکلتا ہے، لیکن وہ کالونی کے کوارٹروں تک کبھی بھی نہیں پہنچتا؛ کوارٹر قدرے بلندی پر ہیں۔ پانی جوہڑ سے کوارٹروں تک اجاڑ حصے میں پھیل جاتا ہے۔ مون سون کی بارشوں سے بھی جیٹھ اساڑھ کی جھلسی ہوئی مٹی کی پیاس نہیں بجھتی اور وہ جوہڑ کے کنارے سے بہہ کر آنے والے پانی کے گھونٹ بھرنا شروع کر دیتی ہے۔ جھاڑیوں بھرا اجاڑ میدان بازار کے احاطے سے پہلے پرائمری سکول کے سامنے کھوڑ گاؤں کی طرف جانے والی سڑک تک پھیلا ہوا ہے اور جنوب کی سمت اس ریتیلے میدان تک چلا جاتا ہے جہاں سکول کے لڑکے سانڈے پھانسا کرتے تھے۔

ساون بھادوں میں اجاڑ میدان کی جھاڑیاں سرسبز ہو جاتی ہیں اور ان کے نیچے لمبی لمبی گہرے سبز رنگ کی گھاس اُگ آتی ہے۔ یہی وہ موسم ہے جب اس اجاڑ میدان کی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس میں وحشی کے کلیجی رنگے کوبرے اپنی سلطنت قائم کر لیتے ہیں۔ برساتی جوہڑ سے تارکول کی پکی سڑک تک بیل اور گدھے گاڑیوں کے لیے دس بارہ فٹ چوڑا کچا راستہ ہے جو ترچھا ہو کر جوہڑ سے سڑک تک چلا جاتا ہے۔ برسات کے دنوں میں سورج ڈوبنے کے بعد کوئی شخص بھی اس کچے راستے پر آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ رات کے وقت کوبرے رینگتے ہوئے تارکول کی سڑک پر بھی پہنچ جاتے ہیں وہاں بھی مارگزیدگی کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ کمپنی کا ایک چوکیدار اور پولیس کا ایک سپاہی تارکول

کی سڑک پر کوبرے کا شکار ہو چکے ہیں۔ گرمیوں میں جوہڑ کا پانی سوکھ کر تین چار فٹ ہی رہ جاتا ہے۔ جوہڑ ایک پیالے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کناروں پر کیچڑ کی تہیں سوکھ کر، پھٹ کر آڑی ترچھی لکیریں سی بنا دیتی ہیں۔

''تو چاہتا کیا ہے شکورے؟'' میں نے پوچھا۔

''سکلیب کیا آج رات ہی گرے گی؟'' شکورے نے بھی سوال کیا۔

''خبر تو یہی ہے،'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھ، میں اکیلا بندہ ہوں،'' شکورے نے لجاجت سے کہا۔ ''مدد کی ضرورت ہے مجھے، اور یہ مدد تو ہی مجھے دے سکتا ہے۔''

شکورے کی اس بات پر میں گھبرا گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں وحشت زدہ چمک تھی۔

''کیا تو رات بنّی پر رہنا چاہتا ہے؟'' میں نے اس کے ارادے کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... پر صرف تیرے ساتھ،'' شکورے نے کہا۔ ''مجھے کسی اور پر بھروسا نہیں۔ لالچ بہت بری شے ہوتی ہے۔ کسی اور کو لے گیا اور اس کی نیت خراب ہو گئی تو مجھے قتل کر کے سکلیب پر قبضہ کر لے گا اور کہہ دے گا کہ میں سکلیب گرنے سے مر گیا ہوں۔ تو میرا سچا یار ہے — جگری یار۔''

میں اس نئی مصیبت سے گھبرایا ہوا تھا۔ مون سون کی بارشیں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ موسم گرم تھا۔ اس موسم میں کوبرے زمین کے اندر ٹھنڈی مٹی میں اپنی بانبیوں کے اندر پڑے رہتے ہیں، لیکن رات کے وقت ہوا ٹھنڈی ہو جانے پر خوراک کی تلاش میں وہ یقیناً باہر نکلتے ہوں گے۔ اس علاقے میں چوہے کم اور چھچھوندریں زیادہ ہیں۔ سست رفتار چھچھوندریں کوبروں کے لیے آسان شکار ہوتی ہیں۔ جوہڑ پر رات گزارنا مجھے خطرناک محسوس ہوا۔

''شکورے،'' میں نے کہا، ''سکائی لیب تو رات ہی کو گرے گی۔ صبح جا کر لے آئیں گے۔''

''تا کہ رات کو کوئی اور لوہا لے جائے!'' شکورے نے خفگی سے کہا۔ ''ہا — ایک بات تو بتا... تو رات کو بنّی پر جانے سے ڈرتا تو نہیں ہے؟'' اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

''شکورے،'' میں نے سمجھاتے ہوئے کہا، ''رات کو وہاں جانا خطرناک ہے۔ کبھی کسی کو دیکھا ہے رات کے وقت بنّی پر جاتے ہوئے؟''

شکورا کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''سکلیب کا لوہا بھی تو لانا ہے،'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں ڈرتا — میں جاؤں گا۔'' اس نے سامنے پڑی نہائی کو دیکھا پھر میری سمت منہ گھمایا۔ ''یاری نبھانی ہے تو چل میرے ساتھ، میں تو جاؤں گا۔''

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شکورے کا پاگل پن اتنی خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ انکار پر شکورے کا بھڑک اٹھنا یقینی تھا۔ وہ پہلے ہی پاگل پن کے دوروں کا شکار تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کو یا مجھے ضرر پہنچائے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ اکیلا ہی بنّی پر چلا جائے اور اسے کوئی حادثہ پیش آ جائے۔ اثبات سے بھی کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اگر وہ عمومی حالت میں بھی جنون ہی کا شکار ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ساری رات کھوڑ میں شمالی خنک ہوا چلتی رہتی ہے اور بنّی کے آس پاس کا علاقہ کوبرا سانپوں کا گھر ہے... میں پریشان سا تھا۔ شکورا میرا جواب سننے کے لیے بے چین تھا۔ مجھے کسی ایک راستے ہی کا انتخاب کرنا تھا، اور بالآخر میں نے دوسرے راستے کا ہی انتخاب کیا حالانکہ اس میں خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی — کوبرے کے زہر سے یا جنونی شکورے کے ہاتھوں۔

''اچھا شکورے،'' میں نے کہا، ''میں جاؤں گا۔''

شکورے کی آنکھیں چمکیں، اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر اس قدر تھا کہ چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''ہا — او جیویں شالا! [18] تو میرا سچا یار ہے،'' شکورے نے خوشی سے کہا، ''میرا جگری یار!''

میں یہ بات تو اچھی طرح جانتا تھا کہ کھوڑ کے اردگرد برساتی پانی کے جوہڑوں پر درندے نہیں آتے۔ بچپن میں ہم ساڑھے آٹھ بجے سو جایا کرتے تھے، پھر بھی کبھی کبھی بنّی کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں اور فوراً ہی کالونی کی طرف سے کتے بھی بھونکنا شروع کر دیتے تھے جو رات

---

[18] تو جیتا رہ۔ یہ جملہ عموماً عورتیں خوشی میں کہا کرتی ہیں۔

کے وقت کالونی کے خود ساختہ چوکیدار بن جایا کرتے تھے۔ بنی پر یا تو گیدڑ آتے تھے یا لومڑیاں یا سیہہ۔ گیدڑ پانی پی کر دور جا کر بولا کرتے تھے۔ لومڑیاں اس قدر مکار اور تیز ہوتی ہیں کہ شکاری کتوں کے علاوہ کسی کے قابو میں نہیں آتی ہیں۔ سیہہ سے خود کتے ڈرتے ہیں۔ سیہہ کا کانٹا، جسے وہ الٹا دوڑ کر مارتی ہے، کسی بھی کتے کو لنگڑا بنا سکتا ہے۔ اس علاقے میں پہاڑیوں میں گھرے ہوئے کتنے ہی برساتی پانی کے جوہڑ ہیں۔ درندے اجاڑ جگہوں ہی پر جاتے ہوں گے۔ ایک ایسا ہی چھوٹا سا برساتی پانی کا جوہڑ بھائی کے بنگلے کے پیچھے سرونٹ کوارٹروں سے دو تین سو گز دور بڑے پہاڑ کے نیچے ہے جو گرمیوں میں مکمل طور پر خشک ہو جایا کرتا ہے۔ جوہڑ پر خطرہ صرف کوبرا سانپوں کا تھا۔ وہ اس قدر تیزی سے ڈستے ہیں کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ دیہاتی ہمیشہ دور سے کوبرے کے سامنے چادر پھینکتے ہیں۔ قریب جا کر ہاتھ میں چادر لے کر اسے چادر پر ڈھوانے کی غلطی جان لیوا ثابت ہوتی ہے: وہ ہاتھ یا ٹخنے پر ڈس لیتا ہے۔ کوبرا بیل نہیں ہوتا کہ اس کا مقابلہ بل فائٹر کی طرح کیا جائے۔

''ایک مسئلہ ہے،'' شکورے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''سکلیب گرے گی تو ٹوٹ جائے گی۔ میں اس کے ٹکڑے دکان پر کیسے لاؤں گا؟''

''ہاں شکورے، یہ مسئلہ تو ہے،'' میں نے کہا۔

''ٹھہر،'' شکورا اپنے کسی خیال پر چونکا۔ ''نادرے کی کھوتا ریڑھی۔'' (گدھا گاڑی۔)

نادر خان کی ڈھوک برساتی پانی کے جوہڑ سے جنوب کی سمت دو چار کھیتوں سے آگے تھی۔ اس کے کھیتوں میں بھی بارانی علاقے کے تمام کسانوں کی طرح فصل کا انحصار بارش پر تھا۔ بالائی علاقوں میں نہ ٹیوب ویل ہیں نہ رہٹ؛ کنوؤں میں پانی بہت گہرائی پر ملتا ہے۔ فصلوں میں بھی صرف چنا اور مونگ پھلی ہی اپنی بقا کی نباتاتی جنگ جیتا کرتی ہیں۔ صرف سپیال ہی ایک ایسا گاؤں ہے جو نشیب میں ہے اور فیروز والی کی بڑی جھیل کے قریب ہے۔ جھیل سے پانی رس رس کر وہاں کنوؤں کو بھرتا رہتا ہے۔ وہاں رہٹ موجود ہیں اور وہاں پر کسان زیادہ تر سبزیاں ہی اُگاتے ہیں۔ نادر خان نے گزر اوقات کے لیے گدھا گاڑی بنا رکھی تھی۔ وہ ہر روز سپیال جا کر وہاں سے سبزیاں گدھا گاڑی پر لاد کے کالونی کے بازار میں لایا کرتا تھا اور وہاں سبزی فروشوں کو بیچ دیا کرتا تھا۔ سبزی فروش دو تین ہی تھے جو ایک آنکھ والے اسحاق کو گالیاں دیا کرتے تھے کہ وہ سائیکل پر کوارٹروں میں سبزی بیچ آتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اسحاق کے جانے پر جہاں شکورے نے اسے گالیاں دی تھیں وہاں سبزی فروشوں نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ نادر خان معمولی منافعے پر سبزیاں بازار میں تھوک کے حساب سے بیچ دیتا تھا۔ مہینے میں اسے معقول منافع ہو جایا کرتا تھا۔ اچھی بارشوں کے بعد اگر اس کی فصل بھی اچھی ہو جاتی تھی تو بھی وہ گدھا گاڑی والا کام جاری رکھتا تھا۔ نادر خان سویرے سویرے گدھا گاڑی پر بیٹھ کر خطرناک راستے سے گزرتا تھا۔ خود تو محفوظ رہتا تھا لیکن برسات کے موسم میں اس کا ایک گدھا کوبرے کے ڈسنے سے مر بھی گیا تھا۔ وہ دو تین دن بعد ہی نیا گدھا لے آیا، لیکن اس نے سورج نکلنے سے پہلے سپیال جانا بند کر دیا تھا۔

''نادر اتنی رات گئے کھوتا ریڑھی کیسے دے گا شکورے؟'' میں نے کہا۔

''اس کی ماں... '' شکورے نے اسے گالی دی۔ ''میں کچھ نہیں جانتا—— کھوتا ریڑھی لانا تیرا کام ہے۔''

''شکورے،'' میں نے کہا۔ ''یوں کریں گے کہ جب سکائی لیب گرے گی تو میں کوئی بہانہ بنا کر کھوتا ریڑھی لے آؤں گا۔ نادر کو کرایہ دے دیں گے۔''

خلاف توقع شکورا مان گیا۔ نادرے نے ڈھوک میں گدی کتوں [19] کا جوڑا پال رکھا تھا۔ اگر شکورے کا دھیان ان کی سمت چلا جاتا تو وہ میرے لیے کوئی اور مشکل کھڑی کر دیتا۔

''ٹھیک ہے،'' شکورے نے کہا۔ ''میں رات ساڑھے نو بجے آؤں گا۔''

''ساڑھے نو بجے؟'' میں نے چونک کر کہا۔ ''اتنی دیر سے؟''

''او بیوقوف!'' شکورے نے کہا، ''اندھیرے ہی میں آسکوں گا، ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔ احمدال جانے والے چوکیدار رات نو بجے چلے جاتے ہیں۔''

شکورے نے اٹھ کر چوکی کو پاؤں سے پیچھے ہٹایا۔ میں بھی اٹھا۔

''اپنا ریڈوا (ریڈیو) لانا نہ بھولنا،'' اس نے میرے ٹرانزسٹر ریڈیو کی سمت اشارہ کیا جو اکثر ایک چمڑے کی پٹی کے ساتھ میرے گلے میں لٹکا رہتا تھا اور جس پر میں چلتے چلتے گانے سنا کرتا تھا۔

''خبریں تو سننی پڑیں گی۔''

---

[19] بل ٹیریر کی ایک مقامی قسم جو بہت خطرناک ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

''اچھا لے آؤں گا،'' میں نے کہا۔ ''تو آ جانا، میں تیار رہوں گا۔''

8

بھائی کے بنگلے کی سمت جاتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ جو ہڑ کی جو پہاڑی سرونٹ کوارٹر کی سمت ہے، اس کے نیچے ایک اور چٹان بھی ہے جس کا جو ہڑ کی سمت والا حصہ عمودی ہے اور جو عقب سے ٹوٹی پھوٹی ہے۔ اس چٹان کا مغربی حصہ قدرے ڈھلوان ہے لیکن نیچے دو بڑے بڑے پتھر ہیں اور مشرقی ڈھلوان اس کچے راستے پر ختم ہوتی ہے جو تارکول کی پکی سڑک پر جا کر جھاڑیوں کے درمیان ختم ہوتا ہے۔ موسم سرما میں، جب میں چھٹی کے دن سکول کا کام ختم کر لیتا تھا تو کاپیاں ایک سمت رکھ کر سرونٹ کوارٹروں کا چکر کاٹ کر اسی عمودی چٹان پر بیٹھ کر دیر تک درمیانی پہاڑی کی اس دراڑ کو دیکھتا رہتا تھا جہاں سے برسات کے دنوں میں پانی جھرنا بنا کر گرا کرتا تھا۔ اس چٹان پر اتنی جگہ ہے کہ دو شخص آرام سے بیٹھ جائیں۔

''وہی موزوں رہے گی،'' میں نے سوچا۔ ''کچھ بھی ہو، مجھے اب شکورے کے پاگل پن کا ساتھ تو دینا ہو گا۔''

میں ہاکی گراؤنڈ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ایک خیال مجھ پر بوجھ بن کر اترا۔

''کہیں میں بھی تو بازار کے لوگوں کی طرح شکورے کے پاگل پن سے تفریح حاصل کرنے کے لیے یہ خطرہ نہیں اٹھانے والا ہوں؟''

اس سوال کا جواب میرے شعور میں نہیں تھا۔ لاشعوری عوامل سے میں بے خبر تھا؛ پھر بھی میں نے خود کو یقین دلایا کہ میرا ایسا کوئی مذموم ارادہ نہیں ہے۔

''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ شکورے کو تلخ حقائق سے آگاہی مل جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو وہ اپنی آئندہ زندگی میں کسی کشف کے فریب میں نہیں آئے گا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ سکائی لیب کسی سمندر ہی میں گرے گی۔''

رات کو کھانے پر میں نے بھائی کو بتایا کہ میں آج رات شکورے کے ساتھ رہوں گا، لیکن کہاں رہوں گا، اس بارے میں میں نے کچھ نہیں بتایا۔

''اس پاگل کے ساتھ؟'' بھائی نے چونک کر کہا۔ ''وہ تو سنکی ہے، تمھیں بہت پریشان کرے گا۔''

''نہیں بھائی،'' میں نے کہا، ''وہ مکمل طور پر پاگل نہیں ہے۔ حالات اور لوگوں نے اسے پاگل بنا رکھا ہے۔''

''دورے پڑتے ہیں اسے،'' بھائی نے کہا۔ ''اور تم کہتے ہو وہ پاگل نہیں ہے؟''

''لوگوں کا سنگدلانہ رویہ اسے پاگل پن کی سمت کھینچ رہا ہے،'' میں نے کہا۔ ''ہر کوئی اسے چھیڑتا ہے۔ جہاں بھی جاتا ہے لوگ آوازے کستے ہیں۔ بازار کے سارے لوگ ہر روز اسے کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ وہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اپنی مفت کی تفریح کی خاطر وہ اسے چین نہیں لینے دیتے۔ اس کے باوجود وہ دکان پر بیٹھ کر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ویلڈنگ پلانٹ کے بغیر بھی، کوئی خامی رکھے بغیر وہ لوہے کے حلقے اور زنجیریں بناتا رہتا ہے۔ اگر لوگ اس پر رحم کریں، اسے چھیڑنا اور ستانا چھوڑ دیں تو وہ دنوں ہی میں ٹھیک ہو جائے گا۔ اکیلا ہے اور بہت دکھ دیکھے ہوئے ہیں اس نے۔''

بھائی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''ایسا ہونا ممکن نہیں،'' انھوں نے کہا۔ ''میں یہاں کے لوگوں کی خصلت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن دماغ پرائمری سکول کے لڑکوں جیسا ہی رہتا ہے۔ وہ چھیڑنا اور ستانا نہیں چھوڑیں گے۔''

''ویسے —'' بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ سی آئی، ''تمھیں بہت خیال ہے شکورے کا!''

''میرا بچپن کا دوست ہے،'' میں نے کہا۔ ''پرائمری سکول میں ہم اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ وہ تیسری جماعت میں تھا جب ماسٹر محمد جان نے اسے سکول چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا،'' میں نے آہستہ سے کہا۔ مجھے شکورے کی زندگی کا وہ بدترین دن پھر یاد آیا۔ ''وہ میرے ساتھ بہت خوش رہتا ہے — بالکل نارمل۔ آپ فکر نہ کریں، میں صبح آ جاؤں گا۔''

''لان کا گیٹ تو کھلا ہی رہتا ہے،'' بھائی نے کہا۔ ''برآمدے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ یہاں چوریاں نہیں ہوتی ہیں۔ اگر ہو بھی تو بازار اور کوارٹروں کی طرف ہوتی ہے۔''

9

رات کے ساڑھے نو بج گئے، شکورا نہ آیا۔ میں نے بھائی کے فل بوٹ پہنے جو وہ اکثر فیلڈ میں

Scanned with CamScanner

جاتے ہوئے پہنتے تھے۔ بوٹ کچھ کھلے محسوس ہورہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے جرابیں پہننا ممکن نہ تھا ورنہ ان کے کھلے ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ بہرحال، تکلیف دہ نہ تھے۔ میں نے چمڑے کی پیٹی میں پیوستہ ٹرانزسٹر گلے میں لٹکایا اور ٹارچ ہاتھ میں پکڑی۔ بیرونی لان میں آ کر گھڑی دیکھی: ریڈیم کے ہندسوں والی گھڑی میں دس بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔

''شکورے کے اس پاگل پن کا محرک تو اب ڈھکا چھپا نہیں ہے،'' میں نے سوچا۔ ''دنیا بھر میں اربوں غریب لوگوں نے ایک بار یہ تو سوچا ہی ہوگا کہ اگر سکائی لیب کا ملبہ انھیں مل جائے تو وہ امیر ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسی میں یہ یقین نہیں ہوگا جس نے شکورے کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کو تو یہ تشویش ہوگی کہ اگر سکائی لیب ان کے گھروں پر گر گئی تو ان کے اہل و عیال کا کیا ہوگا۔ شکورے کی یہ خود فریبی، جس سے شاید وہ آگاہ بھی نہیں ہے، بہت خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے دل میں دبی ہوئی خواہشات، آرزوئیں ناآسودگی کے صدمے سے اسے مکمل طور پر پاگل بھی بنا سکتی ہیں۔ لیکن شعور کی ایک کرن بھی اگر اس کے ذہن پر الٹے پیالے کی طرح دھرے تمناؤں کے گنبد کو حسرتوں کی تاریکی کو چیر گئی تو اس کی دیوانگی ہمیشہ کے لیے ختم بھی ہو سکتی ہے۔''

میں نے پھر گھڑی دیکھی: دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں لان کی گھاس پر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں بیرونی گیٹ کی سمت تھیں۔ لان کی باڑ میں رات کو بولنے والے حشرات الارض کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے دھیمے تھے لیکن ان میں خنکی تھی۔ آسمان پر ستارے گھنے تھے۔ شہروں میں اتنے زیادہ ستارے نظر نہیں آیا کرتے۔ وقت گزر رہا تھا۔ دس بج گئے، سوا دس ہوئے... ساڑھے دس بجے تک شکورا نہ آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید شکورے کا ارادہ بدل گیا ہے۔

''اب کیا کروں؟'' میں نے سوچا۔ ''اگر اندر جا کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں اور باہر شکورا آ جاتا ہے تو وہ یقیناً شور مچائے گا۔ اگر اس کی دکان کی سمت جاتا ہوں تو یہ میرا اپنا پاگل پن ہوگا۔ کیا کروں؟ — کیا لان ہی میں بیٹھا رہوں؟''

گیارہ بجنے میں شاید سات آٹھ منٹ تھے جب لان کے گیٹ پر لگے بلب کی روشنی میں مجھے ہاکی گراؤنڈ کے جنگلے کے پاس شکورا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی، کندھے پر چادر تھی، وہ

Scanned with CamScanner

مسلح ہو کر ہی آیا تھا۔ میں اٹھا، بیرونی گیٹ بند کرتے ہوئے شکورے کے پاس گیا۔

''اتنی دیر شکورے؟'' میں نے کہا۔ ''تیرے ساڑھے نو اب بجے ہیں؟''

''او یار!'' شکورے نے معذرت خوانہ لہجے میں کہا، ''شیر علی کے ہوٹل کے باہر منجیوں (چارپائیوں) پر مسافر جاگ رہے تھے۔ حرامی چلم پر چلم پی رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ میں کیا کرتا؟''

آس پاس کے دیہات سے آنے والے مسافر اکثر رات ہی کو کھوڑ کے بس اڈے پر آ جایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر فوجی ہوتے تھے جو صبح کی بس پکڑنا چاہتے تھے۔ چھٹیاں گزار کر واپس ڈیوٹی پر جانے والے ان فوجیوں کو منجی بستر اشیر علی فراہم کر دیا کرتا تھا۔ انھیں صبح پہلی بس کے لیے جگانا اور چائے پراٹھے کا ناشتہ کرانا بھی شیر علی کے ذمے ہوتا تھا۔

''ٹھٹھا مخول کیے جاتے ہیں،'' شکورے نے بیزاری سے کہا۔ ''سوتے نہیں ہیں۔''

''انھوں نے تجھے کیا کہنا تھا؟'' میں نے کہا۔ ''آ جاتا۔''

''میں نہیں چاہتا کہ کسی کو پتا چلے کہ سکلیب کھوڑ میں گرے گی،'' شکورے نے کہا۔ ''ریڈوا لایا ہے؟''

''ہاں،'' میں نے جواب دیا۔

''چل چلیں؟'' شکورے نے چلتے ہوئے کہا۔ ہم ہاکی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ تارکول کی پکی سڑک پر چلنے لگے۔ آگے بنگلوں کی قطاریں تھیں اور سڑک پر اسٹریٹ لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ بنگلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے شکورا گھبرایا ہوا تھا۔ پھر ہم پنڈی گھیب اور راولپنڈی جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک شمال کی جانب جا کر انگریزی کا حرف ٹی (T) بناتی ہے۔ پنڈی گھیب جانے والی بسیں مشرق کی سمت اور راولپنڈی جانے والی سڑک مغرب کی سمت چلی جاتی ہے۔ ہم بائیں ہاتھ مڑے۔ کمپنی کے اسپتال کے پاس سے گزرے اور پھر دوبارہ بائیں ہاتھ مڑ کر ورکرز کلب کے پاس پہنچے۔ ورکرز کلب کے سامنے سے گزر کر ہم اس جگہ پر آ گئے جہاں کچا راستہ ترچھا ہو کر برساتی پانی کے جوہڑ کی سمت جاتا ہے۔ اس راستے کے دونوں جانب گھنی جھاڑیاں تھیں اور جھاڑیوں کے نیچے خشک گھاس کی تہیں سی نظر آیا کرتی تھیں۔ بہت اندھیرا تھا۔ میں نے راستے پر قدم رکھتے ہی

Scanned with CamScanner

ٹارچ کا بٹن دبایا۔ بیس پچیس فٹ تک راستے پر کوئی ساکن یا متحرک لکیر نظر نہ آئی۔ مجھے روشنی میں شکورے کی کوہاٹی چپلیں نظر آئیں۔

''بند کر — بند کر!'' شکورے نے دھیمی لیکن تیز آواز میں کہا۔ ''کوئی دیکھ لے گا۔''

''اس وقت ساری کالونی سوئی ہوئی ہے شکورے،'' میں نے کہا۔ ''کون دیکھے گا؟ یہ رستہ خطرناک ہے۔ جھاڑیوں سے بچ کر درمیان میں چل۔''

مجھے شکورے کی کوہاٹی چپلوں کی فکر تھی۔ کوہاٹی چپلیں پہننے والے کی ایڑیاں اور پنجے بالکل ننگے رہتے ہیں۔ پاؤں کے اوپر چمڑے کی دو پٹیاں سی بنی ہوتی ہیں جن سے پاؤں چپل میں پھنس جاتا ہے۔ پٹیوں کے درمیان پاؤں ننگا رہتا ہے۔ اسی قسم کی ایک پٹی پیچھے ایڑی کے اوپر سے گزر کر ایک کلپ میں بند کر دی جاتی ہے۔

''تو نے کوہاٹی چپل پہنی ہے،'' میں نے کہا۔

''کیا ننگے پاؤں آتا؟'' شکورے نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''ان سے کیا ہوتا ہے؟''

''تجھے ناگ نے ڈس لیا تو تُو سکائی لیب کو بھی بھول جائے گا،'' میں نے کہا۔ ''اس وقت ہسپتال میں بھی کوئی نہ ہوگا۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا،'' شکورے نے کہا۔ ''میں بہت زہریلا ہوں، ناگ خود ہی مر جائے گا۔'' شکورے نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''وہ ذکو پھرکی —'' شکورے نے ہنستے ہوئے کہا، ''وہ کہتی ہے کہ میں ہوں تو گورا چٹا، پر کالے وٹھوویں (بچھو) کی طرح ڈنگ (ڈنک) مارتا ہوں!'' شکورے نے قہقہہ لگایا۔

''کیا ذکو پھرکی کو کبھی کسی کالے بچھو نے ڈنک مارا ہے؟'' میں نے پوچھا، اور شکورے نے قہقہہ لگایا۔

''بیوقوف!'' اس نے ہنسی میں بمشکل کہا، ''یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی... رہنے دے!''

ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں برساتی جوہڑ کی تینوں پہاڑیوں کے نقوش سیاہ تھے۔ میں وقفے وقفے سے ٹارچ جلا کر راستے اور آس پاس کی جھاڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

''ایک بات تو بتا،'' شکورے نے سر میری طرف گھمایا۔''جو لوگ زہریلے ہوتے ہیں، کیا ان کی بیویوں کے پیٹ میں بچے مر جاتے ہیں؟''

شکورا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کے سوال پر مجھے وہ بھیانک رات یاد آئی جب شیدا اس درد کی شدت میں چیخ چیخ کر مری تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوتا شکورے،'' میں نے آہستہ سے کہا۔''ایسا کچھ نہیں ہوتا۔''

شکورا خاموش ہو گیا۔ جوہڑ کے قریب پہنچ کر میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا۔ پہاڑی کے نیچے نشیبی چٹان کی ڈھلوان روشن ہو گئی۔ ڈھلوان پر پھسل جانے والے چھوٹے پتھر اب بھی موجود تھے جن سے بچپن میں ایک بار پھسل کر میں قلابازی کھا گیا تھا۔

''شکورے،'' میں نے چٹان پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے کہا۔''یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔''

شکورے نے چٹان کو دیکھا، پھر پہاڑ کی چوٹی کی سمت دیکھا، پھر چٹان کو دیکھتے ہوئے مان گیا۔ ہم چٹان کی ڈھلوان پر احتیاط سے توازن برقرار رکھتے ہوئے چڑھے۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے چٹان کی چاروں جانب کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ہم جوہڑ کی سمت رخ کر کے بیٹھ گئے۔ شکورے نے چادر اور ہاکی اور میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو اور ٹارچ چٹان پر رکھ دی۔ بہت اندھیرا تھا۔

''ریڈو لگا،'' شکورے نے کہا۔

''خبریں تو اب بارہ بجے ہی آئیں گی،'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔''وہی خبر ہو گی کہ سکائی لیب آج رات ہی گرے گی۔''

''وہ تو مجھے پتا ہے،'' شکورے نے کہا۔''یہیں گرے گی، اسی بنی میں، اور وہ میری ہو گی۔''

''ہاں شکورے، وہ تیری ہی ہو گی،'' میں نے کہا اور شکورے کے چہرے پر مسکراہٹ یقیناً پھیل گئی ہو گی؛ تاریکی میں مجھے اس کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

''وقت تو بتائیں گے؟'' شکورے نے پوچھا۔

''میرے خیال میں،'' میں نے جواب دیا،''جب گرنے والی ہو گی تو وقت ضرور بتائیں گے۔''

رات تاریک تھی، اس قدر تاریک کہ شہروں کے مقابلے پر بہت زیادہ چمکنے والے تارے بھی پہاڑیوں سے گھرے اس جوہڑ کے آس پاس اندھیرے کو کم کرنے میں ناکام محسوس ہو رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

چاند کا سفر زوال پذیری کے بعد پونم کی چھٹکی ہوئی راتوں کی سمت جاری تھا۔ اسے دیر ہی سے طلوع ہونا تھا، پھر بھی افق پر دھندلاہٹ سی موجود تھی۔ مشرقی افق کی سمت دیکھنے پر مجھے شمالی ہوا کے جھونکوں کا احساس ہوا۔ یہ جھونکے شمال مشرق کی سمت سے آتے محسوس ہوئے۔ کھوڑ میں جب بھی ہوا چلتی ہے، شمال کی سمت سے ہی چلتی ہے اور سردیوں میں تو اس قدر یخ بستہ ہوتی ہے کہ دانت کٹکٹا جاتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے باعثِ سکون تھے۔ ان کی وجہ سے ہم مچھروں سے محفوظ تھے۔ چٹان کے آس پاس خاموشی تھی۔ خلافِ معمول شکورا ابھی خاموش تھا۔ وہ کبھی کبھی آسمان کی سمت چہرہ اٹھاتا تھا۔

''صبح سے تو پہلے ہی گرے گی،'' شکورے نے پوچھا۔

''صبح میں تو ابھی بہت دیر ہے شکورے،'' میں نے جواب دیا۔ ''ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے۔''

جولائی کا آسمان صاف تھا۔ فضا میں دن بھر کی تپش کو خنک ہوا کے جھونکے ساتھ اڑائے لیے جا رہے تھے۔ تپش کا احساس آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ مجھے فل بوٹوں میں نمی کا احساس ہوا۔ پسینے کی نمی ناگوار تھی لیکن میں نے بوٹ نہ اتارے۔ دور کالونی کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی تیز ہوا کے جھونکے سے اجاڑ میدان کی خشک جھاڑیاں سرسرانے لگتی تھیں۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبا کر اردگرد کا پھر جائزہ لیا۔

''سکلیب،'' شکورے نے کہا، ''کس طرف سے آئے گی؟''

''یہ بتانا تو مشکل ہے شکورے،'' میں نے کہا۔ ''کسی طرف سے بھی آ سکتی ہے۔''

شکورا پھر خاموش ہو گیا۔ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ وہ کبھی جوہڑ کے پیالہ نما کناروں میں پانی کی طرف دیکھتا تھا جہاں کبھی کبھی کسی تیز ہوا کے جھونکے سے اٹھنے والی لہر پر ستاروں کا عکس مدھم سی چمک پیدا کر رہا تھا، کبھی آسمان کی سمت دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شکورا مجھ سے اپنے خیالات چھپانا چاہتا ہے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وقت جوہڑ کے کناروں پر کیچڑ میں رینگنے والے کیچوے کی طرح گزر رہا تھا۔ اگلا لمحہ پچھلے کو کھینچتا محسوس ہو رہا تھا لیکن مرتے ہوئے لمحے صرف اپنی یاد ہی کو آگے کی سمت دھکیلا کرتے ہیں۔ بارہ بجے میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی ٹیون کیا۔ وہاں اقتصادیات پر بات چیت ہو رہی تھی۔

''کیا خبر ہے؟'' شکورے نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں؟''

Scanned with CamScanner

''شکورے، وہ...''میں نے کہا، امریکہ کے کسی معاملے پر بات چیت کر رہے ہیں۔''

''کہیں وہ سکلیب کو...''شکورے نے چونک کر کہا،''کہیں وہ سکلیب کو امریکہ میں گرانے کی تدبیریں تو نہیں کر رہے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، شکورے نے غصے سے بازو ہوا میں زور سے گھمایا۔

''کر لیں جتنی تدبیریں کرنی ہیں!''وہ چیخا۔''لگا لیں زور، سکلیب یہیں گرے گی... دیکھ لینا... یہیں گرے گی، اس بنّی میں...''

''شکورے،''میں نے کہا،''وہ تو آسمان سے بہت تیز آئے گی، زور سے گرے گی۔ اس کے ٹکڑے ہوا میں اڑیں گے۔ ہم تو مارے جائیں گے۔''

''کیوں مارے جائیں گے؟''شکورے نے کہا۔''کیا ہم اندھے ہیں؟ ہماری آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا سکلیب کو آتا ہوا دیکھ نہیں لیں گے؟ بیوقوف! جیسے ہی سکلیب نظر آئے گی ہم اُدھر —''اس نے سر گھما کر چٹان کے عقبی حصے کی طرف دیکھا۔ میں نے تارچ کا بٹن دبایا، چٹان کی ٹوٹی پھوٹی کنگریاں روشن ہو گئیں۔''ہم اُدھر کود جائیں گے — پیچھے — کون سی اونچی ہے!''

میں نے عقبی حصے کا پھر جائزہ لیا۔ چٹان کے عقب میں نوکیلی کنگریاں تھیں۔ وہاں سے کسی کوبرے کے آنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ پھر میں نے پہاڑی کی جانب چٹان کے حصے کو روشن کیا، پھر ڈھلوان کو روشن کیا۔

''ٹکڑے اڑیں گے تو پہاڑیوں سے ٹکرا کر پھر بنّی میں گریں گے۔ بنّی میں پانی کم ہے۔''شکورے نے بنّی کی طرف چہرہ گھمایا۔''ہم نکال لیں گے۔''

''لیکن بنّی میں تو جونکیں ہوں گی،''میں نے کہا۔''وہ تو ہمیں چمٹ جائیں گی۔''

''ہا گدڑ!''(گیدڑ!) شکورے نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔''جلموں (جونکوں) سے ڈرتا ہے!''دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے میری طرف دیکھا۔''اچھا، تو باہر رہنا... شہر میں رہ رہ کر ڈرپوک ہو گیا ہے... میں نکال لاؤں گا۔''

''ڈرپوک نہیں ہوں،''میں نے کہا۔''جونکیں گندی ہوتی ہیں۔''اندھیرے میں شکورے کے چہرے کا تاثر میں دیکھ نہ سکا۔''خون پیتی ہیں شکورے۔''

''میں نکالوں گا سکلیب کے ٹکڑے،'' شکورے نے کہا۔ ''میں نہیں ڈرتا۔ اور پھر مجھے جونکیں نہیں چمٹیں گی۔ میرا خون زہریلا ہے۔''

''شکورے!'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''ایسی باتیں نہ سوچا کر۔ کسی کا خون زہریلا نہیں ہوتا۔''

مشرقی افق پر پہاڑوں کے پیچھے سے چاند نمودار ہوا — آدھا چاند۔ اس کا نیم دائرہ زردی مائل سرخ تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں تیزی آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی تیز جھونکے سے ہمارے کپڑے پھڑپھڑاتے تھے۔ شکورے نے ہاکی اٹھا کر چادر کے اوپر رکھ دی۔ میں بار بار تارچ کا بٹن دبا کر اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہوا میں تیزی آنے سے اجاڑ میدان کی جھاڑیاں سرسرا رہی تھیں۔ جوہڑ کے پانی میں بھی ارتعاش سا نمودار ہو چکا تھا لیکن پانی مردہ محسوس ہو رہا تھا؛ نہ کسی مینڈک کی آواز آتی تھی نہ ہی کسی جل مرغے کے پھڑپھڑانے کی۔ اچانک جوہڑ کے سامنے والے کنارے سے چپڑ چپڑ کی آواز آئی۔ شکورے کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ میں نے آواز ختم ہونے کا انتظار کیا۔ کوئی جانور پانی پی رہا تھا۔ آواز میں وقفہ آنے پر میں نے تارچ کا بٹن دبایا۔ روشنی سیدھی پانی پینے والے جانور پر پڑی۔ وہ بدک کر اچھلا، گھوما، اس کی گچھے دار دم بھی گھومی۔ وہ تیزی سے دوڑا اور پہاڑی کے پیچھے نادر خان کے کھیتوں کی سمت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''ہا — حرامی لومبڑ،'' (لومڑ) شکورے نے کہا۔ وہ لومڑی تھی یا لومڑ، یہ تو معلوم نہیں، کچھ دیر بعد نادر خان کی ڈھوک کی طرف سے گدی کتوں کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ وہ بھونک رہے تھے۔

''خبریں تو لگا،'' شکورے نے کہا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔

''سات منٹ رہتے ہیں،'' میں نے کہا۔

''وقت کا پتا چلنا بہت ضروری ہے،'' شکورے نے کہا۔ ''ہم خبردار ہو جائیں گے۔''

میں نے ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی سے اب بھی اکنامکس سے متعلق ہی کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ میں نے ریڈیو کی سوئی گھمائی۔ مختلف اسٹیشنوں کے گزرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر ڈوئچے ویلے ٹیون ہو گیا۔ وہاں سے انگریزی میں کھیلوں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ فٹ بال سے متعلق کوئی کھیلوں کا ماہر اپنی آرا سنا رہا تھا۔ پھر خبروں کا اعلان ہوا۔ شکورا بے چین تھا۔ خبروں میں سکائی لیب کی

Scanned with CamScanner

خبر بھی تھی۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ سکائی لیب کو اب زمین پر گرنے سے روکنا ناممکن ہے اور آج رات وہ زمین کے مدار میں داخل ہو جائے گی۔ سکائی لیب کے الفاظ سن کر شکورا چیخا۔

''آئی... آئی خبر... کیا کہہ رہا ہے؟... کیا خبر ہے؟'' شکورے نے شور مچا دیا۔ اس شور میں نیوز کاسٹر کی بتائی ہوئی اہم معلومات میں نہ سن سکا۔ شاید وہ سکائی لیب کے رخ سے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ شکورے کو غصہ آ چکا تھا، وہ چیخ رہا تھا۔

''کچھ بتا بھی... کیا کہہ رہا ہے وہ؟... کچھ بک بھی!'' اس نے میرا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''بتاتا کیوں نہیں؟ کیا خبر ہے؟''

''شکورے، مجھے سننے تو دے!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''تیرے شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا۔''

شکورے کا اضطراب اس کے بس میں نہیں تھا۔ ''او کچھ مجھے بھی بتا!'' وہ چیخا، ''کیا کہا ہے اس نے؟''

''کوئی خاص خبر نہیں،'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہی بتایا ہے کہ اب سکائی لیب کو گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور وہ آج رات گر جائے گی۔''

''ٹیم (ٹائم) نہیں بتایا؟'' شکورے نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو بند کر دیا۔ شکورے نے میری جانب سے سر موڑ کر ندی کے پانی کو دیکھا، پھر آسمان کی طرف منہ اٹھایا، پھر مجھے دیکھا۔

''چھپانا چاہتے ہیں،'' اس نے کہا۔ ''ٹیم نہیں بتانا چاہتے!''

''وہ کیوں چھپائیں گے؟'' میں نے کہا۔ ''سکائی لیب ان کی تو نہیں ہے۔''

شکورا میری بات نہ سمجھ سکا۔ ''کیا مطلب ہے تیرا؟'' اس نے کہا۔

''جرمن کیوں چھپائیں گے؟'' میں نے کہا۔ ''یہ ریڈیو جرمنی کی خبریں تھیں۔''

''کیا؟'' شکورا چونک کر بولا۔ ''سکلیب امریکہ کی اور خبریں جرمنی کی!... او... تو مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے؟''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا،'' میں نے کہا۔ ''ساری دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں سے خبریں نشر ہو

رہی ہیں۔ کیا تو نے صبح شیر علی کے ہوٹل میں اردو میں خبریں نہیں سنی تھیں؟''

''ہاں، آ تو رہی تھیں،'' شکورے نے کہا۔ ''کیا وہ امریکی خبریں نہیں سنا رہے تھے؟''

''امریکی انگریزی زبان میں خبریں سناتے ہیں،'' میں نے کہا۔ ''ان کی اپنی اور کوئی زبان نہیں ہے۔''

شکورا پھر خاموش ہو گیا۔ مشرقی افق پر چاند بلند ہو رہا تھا۔ نیم دائرے میں پھیکا پن اب بھی نمایاں تھا لیکن لالی مٹ چکی تھی۔ اب وہ زردی مائل سفید ہو چکا تھا۔ فضا کی روشنی میں مکمل اندھیرے کا احساس جوہڑ کے پانی میں ڈوب چکا تھا۔ میرا جی چاہا کہ موسیقی سنوں۔ میں نے ریڈیو آن کیا۔ شکورے نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ برصغیر کے سارے ریڈیو اسٹیشن رات بارہ بجے بند ہو جاتے تھے، صرف چینی، روسی، افغانی، ایرانی اور ترک ریڈیو اسٹیشنوں ہی سے موسیقی سنی جا سکتی تھی۔ مجھے افغانی، ایرانی اور ترکی موسیقی پسند تھی۔ ترکی کی لوک موسیقی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ افغانستان اور ایران کے ریڈیو اسٹیشن ٹیون ہونے سے پہلے ترکی کا ریڈیو اسٹیشن ٹیون ہو گیا لیکن نزدیکی فریکوئنسی کی وجہ سے کوئی عربی اسٹیشن بھی سنائی دے رہا تھا دونوں کی آواز صاف نہیں تھی لیکن ذرا سی کوشش سے ترکی ریڈیو کی آواز صاف ہو گئی۔ وہاں سے موسیقی نشر ہو رہی تھی۔ لوک موسیقی تو نہ تھی لیکن دھن دلکش تھی۔

''بند کر!... بند کر!'' شکورا چیخا، ''بند کر اسے!... ٹلیاں ٹھیک جگہ نہیں ہوتیں... ڈاہڈی[20] ہوتی ہیں... جن آ جائیں گے۔'' شکورے نے جھرجھری لی۔

میں نے بیزاری سے ریڈیو بند کر دیا۔ مجھے خود شکورا کسی تصوراتی بھوت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ پھر ایک یاد نے میری بیزاری کو شرمندگی میں بدل دیا۔ جب میں میٹرک میں تھا، بھائی پہلی بار کسی انگریز سے چھوٹا سا ٹرانزسٹر ریڈیو خرید لائے تھے۔ ٹرانزسٹر ریڈیو میں سیلوں (cells) کی جگہ چھوٹی سی بیٹری لگی ہوئی تھی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو ابھی عام نہیں ہوئے تھے۔ جن گھروں میں ریڈیو تھے، وہ ٹیوبز والے تھے۔ بجلی سے چلنے والے یہ ریڈیو آن ہونے کے پانچ سات سیکنڈ کے بعد گھوں گھوں کرتے

---

[20] ڈاہڈی جگہ دیہاتی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ان کے تصوراتی جن بھوت یا چڑیلیں رہتی ہوں۔ لغوی مطلب سخت ہونا ہے۔

Scanned with CamScanner

ہوے بھنبھنانے لگتے تھے۔ اس بھنبھناہٹ (humming) میں موسیقی اور بھی اچھی لگا کرتی تھی۔ شمالی پنجاب کے لوگوں کے لیے تو ٹیو بز والے ریڈیو بھی عجوبہ تھے۔ شیر علی جب اپنے ہوٹل کے لیے گرنڈِگ کا ریڈیو لایا تھا تو اس کے ہوٹل کے اندر اور باہر ہجوم سا ہو جایا کرتا تھا۔ بھائی کے لائے ہوے ٹرانزسٹر ریڈیو پر میں رات کے وقت بستر پر لیٹ کر موسیقی سنا کرتا تھا۔

سردیوں کے دن تھے۔ دسمبر کی چھٹیاں تھیں۔ ایک صبح آل انڈیا ریڈیو سے اعلان ہوا کہ رات کو اکھل بھارتیہ سنگیت سبھا (نیشنل پروگرام آف میوزک) میں استاد بسم اللہ خاں کا شہنائی وادھن (شہنائی بجانے کا پروگرام) ہوگا۔

مجھے شرارت سوجھی۔ بھائی کے بنگلے کے پیچھے سرونٹ کوارٹروں سے آگے بڑے پہاڑ کے نیچے پتھریلی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں —— شاید اب بھی ہوں گی۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر پھلاہیوں اور کریر کے درخت اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں کے درمیان موسم برسات میں لمبی خوشبودار گھاس اگتی ہے جو خزاں کے موسم میں سوکھ کر زیادہ خوشبو دینے لگتی ہے۔ سنا ہے ہرن یہی گھاس کھاتے ہیں اور ان کی ناف میں کستوری بنتی ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوان کے نیچے ایک بہت چھوٹا سا برساتی جوہڑ ہے۔ جوہڑ کے آس پاس زمین اس قدر پتھریلی ہے کہ اس کی دراڑوں میں صرف ساون بھادوں ہی میں گھاس نظر آتی ہے اور وہ بھی کہیں کہیں۔ ان چٹانوں کے درمیان ایک پتھریلا راستہ، پگڈنڈی نما راستہ، جوہڑ کے شمالی کنارے کے پاس دو پہاڑیوں کے درمیان اُگی جھاڑیوں اور پھلاہی کے درختوں سے ہو کر نشیب میں اتر جاتا ہے۔ دو چار کھیتوں میں آڑا ترچھا ہو کر یہ پگڈنڈی نما راستہ راولپنڈی جانے والی پکی سڑک سے جا ملتا ہے جہاں سے تقریباً آدھے کلومیٹر کی دوری پر احمدال گاؤں واقع ہے۔ اس راستے کو محفوظ سمجھا جاتا تھا، پھر بھی ساون بھادوں میں رات کے وقت دیہاتی یہ راستہ بھی اختیار نہیں کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کمپنی کی آٹو ورکشاپ اور دفاتر کے دو چوکیدار صادقا (صادق حسین) اور فیکا (محمد رفیق) ہر رات شفٹ تبدیل ہونے پر اپنے گاؤں احمدال جانے کے لیے یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ احمدال گاؤں سے کبھی صبح کی شفٹ پر آتے تھے، کبھی دوپہر اور کبھی رات کی شفٹ پر آیا جایا کرتے تھے۔ اُن دنوں وہ دوپہر کی شفٹ پر تھے جو ایک بجے شروع ہو کر رات نو بجے ختم ہوتی تھی، لیکن وہ ساڑھے آٹھ بجے ہی گھروں کی طرف چل پڑتے تھے۔ دونوں

احمد ال گاؤں کے تھے۔ وہ رات نو بجے کے قریب بھائی کے بنگلے کے پاس سے گزرا کرتے تھے۔ پھر پتھریلی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جوہڑ کے پاس پہاڑیوں کے درمیان سے نشیبی کھیتوں میں اتر کر، آڑے ترچھے چلتے ہوئے پکی سڑک پر پہنچ جاتے تھے جو راولپنڈی کی سمت جاتی تھی اور اسی سڑک پر نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ان کا گاؤں تھا۔ یہ قریب ترین راستہ تھا ورنہ اگر وہ پکی سڑکوں پر چلتے ہوئے اپنے گھروں کو جاتے تو انھیں ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔

کھوڑ میں کمپنی کا اپنا پاور ہاؤس ہے، بجلی کبھی بھی نہیں جایا کرتی تھی، پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ بھائی کے بنگلے کے سٹور میں دو تین بڑی موم بتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ میں نے شام گہری ہونے پر سٹور سے ایک موم بتی نکالی، ماچس کی ڈبیا جیب میں ڈالی اور رات آٹھ بجے فل بوٹ پہن کر سویٹر پر موٹا کوٹ پہن کر، مفلر باندھ کر، اونی ٹوپی اور دستانے پہن کر، ٹرانزسٹر ریڈیو اٹھایا اور بڑے پہاڑ کی طرف چل دیا۔ میرے ہاتھ میں ہاکی بھی تھی۔ چادر کا کام مفلر سے لیا جاسکتا تھا۔ جوہڑ کے قریب پتھریلے راستے پر اوپر کی سمت دو بہت بھاری پتھر ہیں، کم از کم چار فٹ اونچے؛ ان کے نیچے سلیٹ نما پتھریلی زمین ہے۔ جگہ بہت محفوظ محسوس ہوئی۔ میں نے ایک پتھر کے پیچھے موم بتی کھڑی کر دی۔ ہوا کے جھونکے نہ ہونے کے برابر تھے۔ مسئلہ صرف وقت کا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا وقت مقامی وقت سے تیس منٹ آگے تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ شہنائی کے پروگرام کے دوران میں ہی دونوں چوکیدار وہاں سے گزریں گے۔ رات نو بجے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے بیک وقت استاد بسم اللہ خاں کی شہنائی شروع ہوئی۔ پہلے سمنت سارنگ کا اعلان ہوا۔ پندرہ منٹ تک یہ خوبصورت ساونی راگ اپنے بھیگے ہوئے سُروں کی پھوار سی برساتا رہا، پھر راگ دُرگا کا اعلان میرے لیے انبساط لایا۔ راگ درگا میرے پسندیدہ ترین راگوں میں سے ایک ہے۔ پندرہ منٹ تک راگ درگا کے میٹھے سر پتھریلی سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر بازگشت کا افسوں پھیلاتے رہے۔ پھر اناؤنسر نے ہندی اور انگریزی میں بتایا کہ آخر میں شہنائی پر راگ مالکونس نشر ہوگا۔ میں مسلسل بھائی کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رات کے نو بج کر پینتیس منٹ پر مجھے بھائی کے بنگلے کے پاس چاندنی میں دو سائے نظر آئے۔ وہ صادقا اور فیکا ہی تھے۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتے، تیز چلتے ہوئے، باتیں کرتے آ رہے تھے۔ دونوں نے کمبل

اوڑھے ہوے تھے۔ میں نے فوراً موم بتی جلائی اور ٹرانزسٹر ریڈیو موم بتی کے پاس رکھ دیا۔ والیوم اتنا اونچا کر دیا کہ پینتیس چالیس قدموں تک سنائی دے۔ میں دوسرے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔ ہوا بند تھی، پھر بھی موم بتی کا شعلہ لہرا رہا تھا۔ فیکا اور صادقا اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوے چلے آ رہے تھے۔ تقریباً چالیس قدم پر فیکا رک گیا۔ دو قدم آگے صادقا بھی رک گیا۔ پھر فیکا تیز قدموں سے صادقے کے پہلو میں آیا۔ وہ ایک دوسرے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ہیجانی کیفیت میں وہ دو چار قدم اور آگے بڑھے۔ ان کے چہروں پر خوف کا تاثر چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر صادقے کا ہاتھ موم بتی والے پتھر کی طرف اٹھا جس کی اوٹ میں موم بتی کی روشنی لہرا رہی تھی اور شہنائی کے سُر پھیل رہے تھے۔

''دھاڑ اوئے... [21]ہی کے؟'' (یہ کیا؟) فیکا خوفزدہ آواز میں چیخا۔ وہ بدکے ہوے گھوڑوں کی طرح اچھل کر مڑے۔

''بچیں او بھائی!'' (بچنا او بھائی!) صادقا چیخا اور وہ دونوں کو کندھوں پر کمبل سنبھالتے، ہاکیاں لہراتے، بھائی کے بنگلے تک سیدھے دوڑتے گئے اور پھر ہاکی گراؤنڈ کی سمت روپوش ہو گئے۔

اگلے روز میں بازار گیا تو رات والے واقعے پر دیہاتی زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

''ماں پیلاں ای پتا ہایا، پہاڑ ہیٹھ جا بہوں ڈاہڈی اے،'' (مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ پہاڑ کے نیچے جگہ سخت ہے) ایک نے کہا۔ ایک دکاندار نے دوسرے کی سمت دیکھا۔

''بہوں جگرا اے بھائی فیکے تے صادقے ناں، ہور کوئی ہووے آتاں اوتھایوں ای مروینداـ'' (بہت جگر ہے بھائی فیکے اور صادقے کا، کوئی اور ہوتا تو وہیں مر جاتا۔)

کمپنی کے ورکشاپ میں کام کرنے والے ایک کارکن نے خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''فیکے تے صادقے قرآن نی قسم چائی اے، اونہاں اپنی اکھیں تکیا اے۔ راتیں اوتھایوں جناں نی جنج ڈھکی کھلی آئی۔'' (فیکے اور صادقے نے قرآن کی قسم کھائی ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں

---

[21] ''دھاڑ'' سرائیکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی حملہ ہیں۔ لیکن دھنی اور گھیبی بولیوں میں یہ ایک مہمل لفظ ہے جسے مقامی لوگ انتہائی خوف میں بے اختیار بولتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

سے دیکھا ہے۔رات وہاں پر جنوں کی بارات آئی ہوئی تھی۔)

اس واقعے کے بعد لوگوں نے پتھریلے راستے پر جانا چھوڑ دیا۔دن بھر کے تھکے شفٹ کے چوکیدار پکی سڑک کے راستے ایک کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلہ طے کرتے ہوئے اپنے گھروں کو جانے لگے۔مجھ پر دو تین دن ندامت چھائی رہی۔کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا؛ گھر سے سخت ڈانٹ پڑتی۔ اس شرارت میں کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔فیکا اور صادق بہت کڑیل جوان تھے ورنہ اور کوئی ہوتا تو بیہوش ہو کر گر بھی سکتا تھا، ہارٹ فیل ہو جانے سے مر بھی سکتا تھا۔بازار میں بتاتا تو کوئی میری بات پر یقین نہ کرتا۔غیر مرئی اشیا پر یقین اور ان کا خوف دیہاتیوں کی فطرتِ ثانیہ ہے۔اگر ٹرانزسٹر ریڈیو دکھا کر دلیلوں سے میں انھیں یہ بتا بھی دیتا کہ میری شرارت کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تو بھی نہ جانے ان کا کس قدر شدید ردِ عمل ہوتا۔میں خاموش رہا۔بے حد شرمندہ تھا اور یہ شرمندگی آج تک میرے ساتھ ہے، کیونکہ اس واقعے کے بعد پیر مراد شاہ کے سو دو سو تعویذ، تین چار سو کالے دھاگے بک گئے تھے۔ فیکے اور صادقے نے ایک ایک سو روپے دے کر پیر سے نقش [22] بنوا کر بازوؤں پر باندھ لیے تھے۔

شکورا اس قدر خاموش تھا جیسے اُونگھ رہا ہو۔

''ان دیکھے کا خوف شاید ہمیشہ سے انسان کے ساتھ ہے،'' میں نے سوچا۔''شاید اسی لیے لوگ اندھیری راتوں سے ڈرتے ہیں۔ایسی راتوں میں کچھ نظر نہیں آتا اور یہی کچھ دکھائی نہ دینا خوف کا محرک بن جاتا ہے۔کسی نابینا شخص کو اندھیرے کا کوئی خوف نہیں ہوتا؛ وہ آوازوں سے، اجنبی آوازوں سے ڈرتا ہے۔جن علاقوں میں درندے اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں، وہاں رات کے وقت لوگوں کا گھروں سے نہ نکلنا جہاں فطری ہے وہاں اس کا باعث یہی ان دیکھے کا خوف بھی ہے۔دن بھر قبرستانوں میں گھومنے پھرنے والے لوگ رات کو قبرستانوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ ان دیکھے کا خوف ان کے قدم روک دیتا ہے۔

''دنیا میں مذاہب نے انسانوں کو جس خوف کا اسیر بنا رکھا ہے، یہی ان دیکھے کا خوف ہے۔''

شکورے کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔وہ اگر بیدار تھا تو بھی غنودگی کے عالم میں تھا۔چاند بلند ہو چکا تھا۔چودھویں رات کے مقابلے میں اگرچہ روشنی کم تھی لیکن ہر چیز نمایاں تھی۔اچانک شکورے نے

---

[22] پیر لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے بعد انھیں نقش سلیمانی باندھنے کا مشورہ دیتے ہیں جس کا ہدیہ کم از کم سو روپے ہوتا ہے۔

سر اٹھایا۔

''بہت دیر ہوگئی ہے،'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا، ''سکلیب نہیں گری۔''

''اپنے وقت پر ہی گرے گی،'' میں نے کہا اور شکورا خاموش ہو گیا۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ شکورا بار بار آسمان پر چاروں سمت دیکھتا تھا۔ اچانک وہ ایک چیخ کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ آئی!... آ گئی!... آ گئی سکلیب!'' اس کا بازو آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ دور آسمان پر ایک روشنی جلتی بجھتی جا رہی تھی۔ شکورا چٹان کے پیچھے کودنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''شکورے، وہ ہوائی جہاز ہے،'' میں نے کہا۔

''نہیں... کیا... ہوائی جہاز؟'' اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

''ہاں شکورے،'' میں نے کہا۔ ''میرا یقین کر، وہ ہوائی جہاز ہی ہے۔''

کوئی انٹرنیشنل فلائٹ تھی جو شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت جا رہی تھی۔ شکورا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر بیٹھ گیا۔

''ہوائی جہاز ہی ہوگا،'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''سکلیب ہوتی تو سیدھی بنی کی طرف آتی۔''

کچھ دیر بعد ہوائی جہاز کی دھیمی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ فلائٹ کافی بلندی پر تھی۔

''کیا سکلیب بھی شور کرتی آئے گی؟'' شکورے نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے،'' میں نے کہا۔ ''ہوا کی رگڑ سے اس میں آواز تو پیدا ہوگی۔ رگڑ سے وہ آگ کا گولہ بن جائے گی۔''

''کوئی فکر نہیں،'' شکورے نے کہا، ''بنی میں پانی ہے۔ شوں شوں کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

شکورا بنی کی طرف دیکھنے لگا جہاں اب پانی کی لہروں پر چاندنی کا عکس جھلملا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔

''شکورے،'' میں نے کہا، ''تیرے خیال میں سکائی لیب کیسی ہوگی؟''

Scanned with CamScanner

میرے اس سوال پر شکورا ایک دم میری طرف گھوما۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے اپنے ذہن میں سکائی لیب کی کوئی تصویر بنا رکھی ہے۔

''اس کا انجن آگے ہوگا،'' شکورے نے مسکراتے ہوئے کہا، ''پیچھے سے بہت لمبی ہوگی۔ اس کے کم سے کم بارہ ٹائر ہوں گے۔'' پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ ''یار — ٹائر بھی بک جائیں گے کہ نہیں؟''

''تمھارا مطلب ہے کہ وہ لمبے ٹرک یا ٹریلر کی طرح ہوگی؟'' میں نے کہا۔ شکورا پھر سوچنے لگا۔

''شاید ٹرک کی طرح نہ ہو...'' اس نے اپنے قیاس کی خود ہی نفی کر دی۔ ''نہیں... وہ پیچھے سے بہت لمبی نہیں ہوگی۔ اس کے اگلے ٹائر چھوٹے ہوں گے اور پچھلے بڑے۔ ٹائر چار ہی ہوں گے۔ انجن لمبا ہوگا اور ڈرائیور کی سیٹ انجن کے پیچھے ہوگی۔'' پھر وہ چونکا۔ ''یار، ڈرائیور تو مر گیا ہوگا!''

''شکورے،'' میں نے کہا، ''سکائی لیب ٹریکٹر کی طرح تو نہیں ہوگی۔''

شکورا پھر سوچنے لگا۔ وہ دو تین منٹ خاموش رہا، پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''اس کا اگلا پہیہ بہت بڑا ہوگا... لوہے کا لمبا اور بڑا سا پہیہ۔ پچھلے پہیے بھی لوہے کے ہی لیکن چوڑے نہیں ہوں، اونچے ہوں گے۔ اس کے انجن سے دھواں نکل رہا ہوگا۔''

''ایسا تو سڑک کوٹنے والا انجن ہوتا ہے شکورے،'' میں نے کہا اور شکورے کے ماتھے پر شکنیں سی نمایاں ہوئیں۔

''بڑا سیانا بنتا ہے تو!'' اس نے غصے سے کہا۔ ''تو بتا، کیسی ہوگی؟''

''مجھے کیا معلوم شکورے،'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس لیے تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔''

شکورے کے ماتھے کی شکنیں مٹ گئیں لیکن چہرے پر کھنچاؤ تھا جیسے ذہن پر بہت زور دے رہا ہو۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''اس کا انجن بہت بڑا اور کالا ہوگا،'' شکورے نے کہا۔ ''انجن میں بہت بڑی انگیٹھی ہوگی۔ آگے انجن کے اوپر گول بمبو (چمنی) ہوگا۔ بمبو سے دھواں نکل رہا ہوگا۔ انجن کے نیچے لوہے کے بڑے بڑے پہیے ہوں گے اور پہیوں کے اوپر سے بھاپ نکل رہی ہوگی۔ سکلیب بہت تیز دوڑتی ہوگی اور سیٹی بجاتی ہوگی۔''

''شکورے،'' میں نے کہا، ''تم تو ریل کے انجن کی بات کر رہے ہو جو فتح جنگ سے جنڈ بسال کے راستے ماڑی انڈس تک ریل گاڑی لے کر جاتا ہے۔''

شکورے کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

''دیکھا ہوا ہے،'' اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے، سکلیب سائیکل ہوگی؟... بیوقوف!... اس کے تو کئی ڈبے ہوں گے۔''

''لیکن شکورے، ریل کی تو لوہے کی پٹریاں ہوتی ہیں جن پر چلتی ہے،'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آسمان پر پٹریاں تو نہیں ہوں گی۔''

''میرے چاچے نے بنائی ہے سکلیب؟'' وہ پھر چیخا۔ ''گرے گی تو دیکھ لیں گے۔''

''شکورے... دیکھ، ناراض نہ ہو،'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ بنی میں تو بہت کیچڑ ہوگا۔ گرے گی تو اچھلے گا۔ ہم چٹان کے پیچھے بھی لتھڑ پتھڑ جائیں گے۔''

شکورے نے قہقہہ لگایا۔ اس کا غصہ فوراً ہی اتر گیا۔

''لبد (لتھڑ) جائیں گے تو کیا ہوا؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں تو بنی میں نہالوں گا۔ تو جلموں (جونکوں) سے ڈرتا ہے، تو گھر جا کر نہالینا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے چاندنی کے باوجود ٹارچ جلا کر ادھر اُدھر کا پھر جائزہ لیا۔

''تو کھوتا ریڑھی لے آنا...'' شکورے کے ذہن میں ابھی تک نادر خان کے گدی کتوں کا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ ''پھر ہم چھوٹے ٹکڑے لے جائیں گے دو تین پھیروں میں۔ پھر میں رسہ لے آؤں گا... ہے میرے پاس۔ چھوٹے ٹکڑے صحن میں رکھ کر رسہ لے آؤں گا اور بڑے ٹکڑے رسے سے باہر کھینچ لیں گے کھوتے سے باندھ کر۔'' شکورے نے میری طرف غور سے دیکھا۔ ''تو کھاتا پیتا کچھ نہیں ہے؟... کمزور چوچے!'' (چوزے!)

پھر خاموشی چھا گئی۔ چاندنی میں پہاڑیوں کی چوٹیاں بہت نمایاں تھیں۔

''غریبی اور محرومی...'' میں نے سوچا۔ ''اس دنیا کے ان گنت لوگوں میں ان کی ناآسودہ خواہشات ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ کوئی محروم انسان زندگی بھر محرومی کے تلخ احساس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ دنیا میں بہت سے نظریات آئے لیکن انسان کو مکمل طور پر محرومی کے احساس سے کوئی بھی

Scanned with CamScanner

نجات نہیں دلا سکا۔ اپنی خواہشات کو سچے دل سے تیاگنے والے بہت کم ہیں۔ مجھے تو اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ رہبانیت کی راہ اختیار کرنے والے اپنی محرومی کو اپنے فرض کی دھند میں چھپاتے رہتے ہیں اور ان کی زندگی میں بار بار یہ دھند چھٹتی رہتی ہے اور وہ بھی زندگی بھر محرومی کے احساس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ وہ لڑکیاں جو حیاتی زندگی کو تیاگ کر اس خود فریبی میں مبتلا رہتی ہیں کہ انھوں نے اپنا مذہبی فریضہ سرانجام دیا ہے، زندگی بھر اپنی جبلت کو کچلتی رہتی ہیں لیکن اس سے نجات حاصل نہیں کر پاتیں۔ وہ مرد جو مجرد زندگی کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں، وہ خود ساختہ جبر کے شکنجے میں جکڑے رہتے ہیں اور نجات نہیں پا سکتے۔"

مجھے اساطیری کہانیوں کا چرواہا اتیس (Attis) یاد آیا۔ اتیس بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ اس پر فریجیائی دیوی سبل (Sibyl) عاشق ہو گئی تھی۔ سبل اسے بار بار گناہ کا راستہ دکھاتی تھی لیکن وہ انکار کر دیتا تھا۔ سبل کی ہوس شدید ہونے پر اتیس نے ایک صنوبر کے درخت کے نیچے اپنا عضو کاٹ کر خود کو مخنث بنا لیا۔ اتیس کی اس خود آختگی کی یاد میں اس کے پجاری ہر سال موسم بہار میں ایک رسم ادا کیا کرتے تھے۔ یہ رسم روم کے سیزر، شہنشاہ کلاڈیس کے عہدِ حکومت میں بھی جاری تھی۔ اس رسم کو مشرقِ وسطیٰ میں سامی دیوی عشترت کے شامی مندر میں بھی ادا کیا جاتا تھا۔ سر جارج فریزر نے اپنی علم الانسانیات سے متعلق اپنے تحقیقی سفر میں اپنی کتاب شاخِ زریں (*The Golden Bough*) میں اس رسم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہ رسم موسمِ بہار میں بائیس مارچ کو شروع ہوتی تھی۔ جنگل سے صنوبر کا ایک درخت کٹ کر سبل کی عبادت گاہ میں آتا تھا۔ تیئیس مارچ کو شنکھ پھونکنے کی رسم ادا کی جاتی تھی اور چوبیس مارچ یومِ خون کہلاتا تھا۔ پجاریوں کے جذبات جھانجھوں، ڈھولوں، شنکھوں اور بانسریوں کی پرجوش موسیقی سے برانگیختہ ہو جاتے تھے اور وہ بال کھولے، رقص کرتے، جنون کی حالت میں سبل دیوی کے بت کے آگے اپنی رجولیت بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔ آدمی پر آدمی گرتا تھا اور خنجر سے اپنا عضو کاٹ کر سبل کے بت پر دے مارتا تھا۔"

پہلی صدی عیسوی کے نامور رومی شاعر کتولس نے بھی سبل کے بت کے آگے خود آختگی کی تھی لیکن جوشِ جنوں اتر جانے کے بعد اس نے انتہائی دردناک پیرائے میں اپنی پشیمانی کو نظم کے پیرائے

میں بیان کیا ہے کہ یہ المیہ اس کے لیے موت کے المیے سے کم نہیں۔ یہ رسم بعد میں ختنہ میں بدل گئی تھی اور اسے یہودیوں نے، پھر مسلمانوں نے اپنالیا تھا۔

"مذاہب نے انسانوں کو اپنی نا آسودہ خواہشات سے پیدا ہونے والے المیے کے تلخ احساس سے نجات دلانے کے لیے دو الفاظ دے رکھے ہیں... بے شعوری کو پختہ کرنے والے دو الفاظ: تقدیر اور صبر۔ پھر ان دونوں کو مزید پختگی دینے کے لیے دو الفاظ مستزاد ہیں: امید اور انتظار۔ اپنے ہر دکھ کو تقدیر سمجھ کر بے بسی کے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے محروم طبقوں کی ساری زندگی گزر جاتی ہے اور وہ امید کے سائے میں اپنی زندگی کا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اپنے ہر دکھ پر صبر کے ساتھ وہ عمر بھر اپنی آرزوؤں کو خود ہی کچلتے رہتے ہیں اور انتظار کے نامختتم فریب میں مبتلا رہتے ہیں، لیکن نہ دکھ ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے احساسات سے نجات ملتی ہے۔ شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ تقدیر پر اعتقاد اور صبر کی تلقین سے عارضی سکون تو مل ہی جاتا ہے، لیکن جو ذہنی عوامل دائمی نہ ہوں وہ انسان کے لیے زندگی بھر عقوبت کی راہیں کھولتے رہتے ہیں۔ نا آسودگی اور محرومی کی چنگاریاں راکھ میں دب کر بھی سلگتی رہتی ہیں۔ حالات و واقعات کے تیز جھونکوں سے جب یہ راکھ اڑتی ہے اور خواہشات سوکھے پتوں کی طرح ان پر گرتی ہیں تو الاؤ بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ آگ زندگی بھر سرد نہیں ہوتی۔ کوئی نظریہ، کوئی مذہب انسانی معاشروں میں محروم لوگوں کی دائمی مدد نہیں کرتا— مذہبی رہنما بھی اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ بظاہر ایک بہت راسخ العقیدہ اور صابر شخص بھی داخلی طور پر محرومی کے الاؤ میں جلتا رہتا ہے لیکن اپنے عقیدے کی خاطر اور مذہبی معاشرت کے دباؤ میں اپنی نا آسودگی کو چھپائے رکھتا ہے۔ اپنے دُودِ دل کو لب و چشم کے دُودِ آہنگ تک نہیں آنے دیتا۔ اگر کسی مذہبی رہنما کو زندگی کے کسی بھی حصے میں اس سنگدلانہ رویوں کا احساس ہو بھی جاتا ہے، اگر وہ اپنے ضمیر کی کسی کرن سے تاریکی میں چھپی اس تلخ حقیقت سے آشنا ہو بھی جاتا ہے، تو فوراً اسے نظام کا نام دے کر پھر تاریکی کے دبیز پردوں میں چھپا دیتا ہے۔ اپنے ہی روشن شعور سے خوفزدہ ہو کر اسے جارحیت قرار دیتا ہے اور دفاع میں لگ جاتا ہے۔ نظام کی تمام تر ذمے داری غیر مرئی ماورائی قوت پر ڈال دی جاتی ہے۔ نظام کی چھاؤں میں وہ پر سکون ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب دنیا بھر میں محروم انسان اپنی نا آسودگی، نارسائی اور بے بسی کے ساتھ جبر کے الاؤ میں جلتے رہتے ہیں۔ اگر اپنا ذہنی

Scanned with CamScanner

توازن برقرار نہ رکھ سکیں تو شکورا بن جاتے ہیں۔"

چاند بلند ہو کر چمک رہا تھا۔ آدھے چمکتے چاند کی روشنی میں اب جھاڑیوں کے میدان میں ہوا کے جھونکوں سے سرسراتی جھاڑیاں اور پہاڑیوں کی ڈھلوانیں روشن ہو چکی تھیں۔ جوہڑ کے تین کناروں پر پہاڑیوں کے نیچے روشنی مدھم تھی۔ جوہڑ کے پانی میں اب ارتعاش نمایاں تھا اور اس تموج سے لہروں پر چاندنی چمک چمک جاتی تھی۔ شکورا پھر اونگھ رہا تھا۔

"یہ المیہ صرف شکورے کا نہیں..." میری سوچ کا رخ بدلا۔ "یہ دنیا کے ان تمام ملکوں کا المیہ ہے جسے بڑی طاقتیں تیسری دنیا کہتی ہیں۔ انھوں نے گزشتہ صدی ہی میں یہ اصطلاحات بنائی تھیں۔ پہلی دنیا... دوسری دنیا... تیسری دنیا... ترقی یافتہ... ترقی پذیر... غیر ترقی یافتہ... شاید ان اصطلاحات سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہوگی۔ یہ اصطلاحات صدیوں پرانی ہیں، ورنہ روم کے سیزر، ماسکوں کے زار، برٹش ایمپائر اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے دانشور یہ بات اپنی تحریروں میں کبھی نہ لکھتے کہ وہ مفتوح ممالک کو ترقی پذیری کے عمل سے گزار کر ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان اصطلاحات کو بدلنے کی مثبت کوشش نہ کبھی ہوئی تھی نہ ہو رہی ہے۔ اگر کہیں کچھ ہوا بھی ہے تو وہ فاتح اقوام کے ہی مفادات کی خاطر ہوا ہے۔ یہ اصطلاحات ہمیشہ سے قائم ہیں کیونکہ ان کو بدلنے کی ہر کوشش اس کرۂ ارض پر قوتِ شر کے خلاف بغاوت ہوگی — پہلا قدم — شاید بغاوت کا پہلا لمحہ، جسے روکنے کے لیے وہ ازل سے راہ میں حائل ہے۔ لیکن میں اپنے تیقن پر ہمیشہ سے قائم ہوں کہ اس کرۂ ارض پر عالمِ ممات میں لمحہ بہ لمحہ مرتے ہوئے لمحات میں کوئی نہ کوئی لمحہ عالمِ حیات میں زندگی کا پہلا قدم اٹھانے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

میری نگاہیں جھاڑیوں والے اجاڑ میدان کی سمت گئیں۔ شکورا اس قدر خاموش تھا کہ یوں محسوس ہو رہا تھا، وہ کسی مویشی کی طرح بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔

"ہم دنیا میں ایسے خطۂ زمین پر رہ رہے ہیں..." میں نے شکورے کی طرف دیکھا۔ "جہاں اکثریت کی زندگی مویشیوں سے بھی بدتر ہے۔ یہاں کے اہلِ اقتدار و اختیار کہتے ہیں کہ ملک غیر ترقی یافتہ نہیں ترقی پذیر ہے۔ کیا بڑے بڑے شہروں میں اونچی اونچی عمارات بنا کر بڑی بڑی سڑکیں بچھا کر، شہروں کے مضافات میں انڈسٹریل اسٹیٹس قائم کر کے، شہروں میں کالج، یونیورسٹیاں اور بڑے

بڑے اسپتال بنا کر، سڑکوں پر بے شمار کاریں لا کر، یہ ملک ترقی پذیر ہو چکا ہے؟ ملک کی اسی فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ ایسے دیہات کثرت سے ہیں جہاں زندگی کی کوئی سہولت میسر نہیں؛ جہاں بجلی نہیں، پینے کا صاف پانی نہیں، تعلیم کی سہولتیں نہیں، طبی سہولتوں کا تصور تک موجود نہیں، جہاں جاہلانہ رویے کوبرے کی طرح سر اٹھائے ہر سمت نظر آتے ہیں— کیا یہی ترقی پذیری ہے؟ ملک میں اگر ترقی پذیری ہے تو وہ صرف شہروں میں نظر آتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد ملک کا ہر صوبہ ضلعی سطح پر ایک برس میں کم از کم بیس گاؤں ایسے تیار کرتا جہاں ہر مکان پختہ ہوتا، ہر گلی پختہ ہوتی، جہاں تعلیم کی ممکن سہولتیں میسر ہوتیں، بچے اور بچیوں کے لیے ہر گاؤں میں ہائی سکول ہوتا جہاں پڑھے لکھے اساتذہ ہوتے۔ ہر پانچ گاؤں کے لیے ایک کالج ہوتا۔ جہاں صحت کی تمام سہولتیں میسر ہوتیں۔ ہر گاؤں کا اپنا اسپتال ہوتا اور ہر پانچ گاؤں کے لیے ایک بڑا اسپتال ہوتا جو جدید طبی سہولتوں سے آراستہ ہوتا۔ ہر گاؤں کی کمیٹی گاؤں کی صفائی کی ذمے داری ہوتی، پینے کا صاف پانی فراہم کرتی، سیوریج کا نظام قائم کرتی۔ ہر گاؤں میں ایک مارکیٹ ہوتی اور مارکیٹ کی دیکھ بھال کے لیے مارکیٹ کمیٹی۔ ہر پانچ گاؤں ایک بڑی منڈی سے جڑے ہوتے جہاں جانے کے لیے پختہ سڑکیں ہوتیں۔ ہر گاؤں میں گھریلو دستکاری کے مراکز ہوتے۔ خواتین کو روزگار ملتا۔ جہاں دیہات کے لوگ فرسودہ عقائد سے آزاد ہوتے، ان کی غلامانہ زندگیوں کی تاریکی ختم ہو جاتی۔ جہاں کوئی شکورا تعلیم سے محروم نہ رہ جاتا، کوئی شیداں تڑپ تڑپ کر نہ مرتی، جہاں کوئی رحمت ڈھولی بیمار بیوی کی کلائی پر کالا دھاگا نہ باندھتا، جہاں کسی نادر خان کا گدھا کوبرے کے کاٹنے سے نہ مرتا، جہاں کسی ذکو کو اپنا جسم نہ بیچنا پڑتا... لیکن ہوا کیا؟ برس گزر چکے ہیں اور اہلِ اختیار و اقتدار نے دیہات کو تقدیر کے حوالے کر رکھا ہے جہاں بڑے بڑے جاگیردار اور مذہبی اجارہ دار سیدھے سادے دیہاتیوں کے زخموں پر صبر کا مرہم لگاتے رہتے ہیں۔"

شکورا واقعی سو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ توازن کھو کر گر نہ جائے۔

"ہمارے دیہاتیوں کے لیے تفریح کے ذرائع محدود ہیں۔ بیساکھی کے کھیل، میلے، صدیوں سے یہی تفریح ہمارے دیہاتیوں کو میسر ہیں یا شادیوں پر عورتوں کے جھرمٹ میں لڑکیاں ناچ لیتی ہیں اور مردوں میں بچوں اور بچیوں کی موجودگی کے باوجود بھانڈ عامیانہ جگتیں کر کے باراتیوں کو

Scanned with CamScanner

ہنساتے ہیں۔"

مجھے شیداں کی وہ جگت یاد آئی جو اس نے ریتیلے میدان میں سکول کے لڑکے سے کی تھی۔ یقیناً اس سے ملتی جلتی کوئی جگت اس نے کسی بھانڈ سے سنی ہوگی۔

"کاش ہمارے دیہات میں دیہی کلب ہوتے جہاں وہ ان ڈور کھیلیں بھی کھیلتے اور اپنے مسائل پر بات چیت بھی کرتے۔ لیکن جو نظام صدیوں سے قائم ہے، حکمران اسے خود ہی ختم نہیں کرنا چاہتے۔ کریں بھی تو کیسے؟ وہ خود بھی اسی استحصالی گروہ کے اراکین ہیں جو دیہات کو پس ماندہ رکھنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس خطۂ زمین کے وہ افراد جو ترقی پذیری سے وابستہ ہیں، یہ سوچ رہے ہیں کہ جس انداز میں بھک مری اور فاقہ زدگی سے گھبرا کر دیہاتی شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں، ہزار دو ہزار سال تک شہری حدود اتنی کشادہ ہو جائیں گی کہ سارا ملک ہی ایک بڑا شہر بن جائے گا اور موجودہ شہر اس شہر کے مختلف علاقے ہوں گے، محلے ہوں گے۔ ترقی پذیری مکمل ہو جائے گی اور ترقی یافتگی کے لیے راہیں استوار ہو جائیں گی... لیکن ہوگا کیا؟ موجودہ ترقی سے وابستہ افراد کی آئندہ نسلیں ایک دوسرے کا منھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گی کہ اناج کہاں سے لائیں، پھل اور سبزیاں کہاں سے فراہم کریں۔ بہیمانہ سیاست کا جو انداز دنیا میں نظر آ رہا ہے، ہزار دو ہزار سال تو بہت ہیں، جلد ہی بڑی بڑی جنگوں کے بعد موجودہ بڑے بڑے شہر کھنڈرات میں بدل جائیں گے۔ اگر موجودہ سیاست کا انداز جاری رہا تو اس زمین پر خاکستر کی سلیٹی تہہ جم جائے گی۔ جلی ہوئی خاکستر زدہ زمین پر کوہساروں، میدانوں اور ساحلی علاقوں پر کہیں بھی ہریالی نظر نہیں آئے گی۔ سلیٹی رنگی زمین اجاڑ ہو جائے گی—— سب کچھ مٹ جائے گا۔"

مجھے ساہیوال میں قائم نپن کمپنی کا جاپانی منیجر سابورو اکوئی (Saburo Akui) یاد آیا۔ وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے کہا کہ یہ ملک جس میں تم رہ رہے ہو، کبھی ترقی نہیں کرے گا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ مجھے چار مہینے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہاں ہر کوئی صرف اپنی ترقی چاہتا ہے۔ جن معاشروں میں یہ رجحان جڑ پکڑ لیتا ہے، وہ معاشرے ترقی نہیں کیا کرتے۔ وہاں صرف خاندان ترقی کیا کرتے ہیں اور وہ دوسروں کے لیے ترقی کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔ کیونکہ عدلیہ انتظامیہ کی محکوم ہو جاتی ہے، انتظامیہ

Scanned with CamScanner

ترقی یافتہ خاندانوں کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور انصاف مٹتے مٹتے مٹ جاتا ہے۔

''کتنی درست بات کی تھی سابورواکوئی نے — یہاں خاندانوں ہی نے ترقی کی ہے اور کر رہے ہیں۔ میونسپل کمیٹیوں میں، قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں، سینٹ میں انھی خاندانوں کے لوگ رعونت سے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ انتظامیہ ان کی محتاج ہے۔ اگر مسلح افواج ان کی سیاست سے تنگ آ کر ملک پر قبضہ کر لیتی ہیں تو پھر جرنیلوں کے خاندان ترقی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ شہری علاقوں کے اہل ثروت کی طرح دیہاتی علاقوں میں جاگیردار اپنے ملازموں اور مزارعین کو زرخرید غلام سمجھتے ہیں۔ نام نہاد مزدور کسان پارٹیوں کی موجودگی میں بھی جبر و تشدد جاری رہتا ہے۔ اہل ثروت اور جاگیردار اس ظلم و تعدی کے ماحول اور استحصال کے ماحول کو نظام، ناگزیر نظام کا نام دے کر، اپنی بقا کی خاطر جاری رکھنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ جور و ستم کا نظام ہی ان کی بقا کا ضامن ہے۔ ایک اور طبقہ پیروں کا ہے، مذہبی رہنماؤں کا ہے، جو شہری اور دیہاتی علاقوں میں ان پڑھ سادہ لوح انسانوں کا زبردست استحصال کر رہا ہے۔ مذہبی قیدوں اور اقتصادات کی آڑ میں یہ طبقہ صدیوں سے انسانیت کا خون چوس رہا ہے۔ ان کے دربار اور ڈیرے دراصل وہ دکانیں ہیں جہاں خوف اور خودغرضی کے اسیر لوگ ہدیے کی رقم دے کر نقش سلیمانی، تعویذ اور کالے دھاگے خریدتے ہیں۔ کوئی اس طبقے کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ اگر اس طبقے کا کوئی رکن بے نقاب ہو جاتا ہے تو باقی سب اسے جعلی کہہ کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ حکمران ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں، عوام پاؤں چومتے ہیں۔ یہ طبقہ اہلِ ثروت اور جاگیرداروں کا داہنا ہاتھ ہے اور یہی طبقہ ان کے لیے جبر و استحصال کی راہیں ہموار کرتا رہتا ہے، بلکہ ان کے لیے ڈھال بھی بن جاتا ہے۔ اس طبقے کی رسائی سادہ لوح افراد کے شعور تک ہی نہیں، ان کے لاشعور تک ہے۔ یہ طبقہ معاشرے میں جاہلیت پھیلانے اور فرسودہ اندھی عقیدتوں کو پھیلانے میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طبقے کی وجہ سے دیہاتی عمر بھر اجڈ اور گنوار رہتے ہیں۔ دیہاتی تو ان پڑھ ہوتے ہی ہیں، میں نے تو پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کرنے والوں کے گلوں میں تعویذ اور کلائیوں پر کالے دھاگے بندھے دیکھے ہیں۔ دیہاتی تو ویسے بھی اجڈ اور گنوار ہیں۔ یہی طبقہ دیہاتی معاشروں میں رحمت ڈھولی اور شکورے جیسے کردار پیدا کرتا ہے۔''

''ٹیم کیا ہوا ہے؟'' شکورے کی آواز پر میں اپنے خیالوں سے نکلا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے تین بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔ میں دو بجے کی خبریں سننا بھول گیا تھا۔

''خبروں میں سات منٹ باقی ہیں شکورے،'' میں نے کہا۔

شکورے نے تھوڑی سی نیند کے بعد جمائی لی اور خمار آلود آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''ریڈوا تو لگا،'' اس نے کہا۔

''ساز بج رہا ہوگا اور تو پھر ڈر جائے گا کہ جگہ ڈاہڈی ہے''، میں نے کہا۔

''تجھے ڈر نہیں لگتا؟'' شکورے نے کہا۔ ''جنوں سے بھوتوں سے اور چڑیلوں سے؟'' شکورے نے پھر جھرجھری لی۔

''نہیں،'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو کوئی ڈر نہیں محسوس ہوتا۔''

''جکموں (جونکوں) سے ڈرتا ہے اور جنوں سے نہیں!'' شکورے کے چہرے پر کھنچاؤ نمودار ہوا۔

''جونکیں بھی تو چڑیلیں ہی ہوتی ہیں شکورے،'' میں نے کہا، ''چمٹ کر خون پیتی ہیں۔''

شکورے کے چہرے کا کھنچاؤ کم ہو گیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔

''اب تو ٹیم بتائیں گے!'' شکورے نے ہتھیلی ہونٹوں پر رکھ کر پھر جمائی لی۔ ''بڑی دیر ہو گئی ہے۔''

کچھ دیر بعد میں نے ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی ٹیون کیا۔ وہاں سے سازینہ بج رہا تھا۔ پھر خبروں کا اعلان ہوا۔

''نیوز ان اسپیشل انگلش۔''

''شکورے،'' میں نے کہا۔ ''مجھے خبریں سن لینے دینا، شور نہ مچانا۔''

بھاری بھرکم آواز والے نیوز کاسٹر نے دھیمے لہجے اور زیادہ سمجھ میں آنے والے انداز میں خبریں شروع کیں۔ اس نے پہلے اقوام متحدہ کی خبر سنائی، پھر امریکی سینیٹ کی، پھر سکائی لیب کی خبر شروع کی۔ سکائی لیب کے الفاظ سن کر شکورا چونکا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شکورا جھٹکے سے اٹھا اور اکڑوں بیٹھ گیا۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ سکائی لیب زیادہ سے زیادہ

Scanned with CamScanner

تو ے منٹ کے اندر زمین پر گر جائے گی۔ ناسا (NASA) اس معاملے میں بہت ذمے داری سے کام لے رہا ہے۔ سکائی لیب...''

''کیا کہا اس نے؟'' شکورا چیخا اور میرا دھیان خبروں سے ہٹ گیا۔ ''وہ کیا بتا رہا ہے؟ کتنی دیر ہے گرنے میں؟ گرنے والی تو نہیں؟'' اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔ ''کچھ بول بھی... کیا خبر ہے؟''

نیوز کاسٹر نے شاید طول بلد اور عرض بلد سے متعلق کوئی معلومات بتائی تھی جو میں شکورے کے شور میں سن نہ سکا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔

''کیا خبر دی ہے؟ — کچھ بک بھی!'' شکورے کی آواز میں غصہ ابھرا۔ وہ جب بھی چیختا تھا تو اس کی آواز آندھی کے تھپیڑوں کی طرح ہو جاتی تھی۔

''شکورے!'' میں نے بلند آواز میں کہا، ''کیا ہو جاتا ہے تجھے؟ سب سے اہم خبر تو تو نے سننے ہی نہیں دی۔''

''بتایا کیا ہے اس نے؟'' شکورے نے غصے میں شاید میری بات ہی نہیں سنی تھی۔ ''کچھ بتا بھی!'' وہ چیخ رہا تھا۔

''سکائی لیب اگلے نوے منٹ یعنی ڈیڑھ گھنٹے میں زمین پر گرے گی۔ اس سے پہلے بھی گر سکتی ہے''، میں نے کہا۔ شکورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گھوم سا گیا۔

''کہاں گرے گی... یہ تو تو نے سننے ہی نہیں دیا''، میں نے کہا۔ شکورے نے شاید پھر میری بات نہ سنی۔

''کس طرف سے آئے گی سکلیب؟'' اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تو سیدھا جوہڑ کے کنارے کیچڑ میں جا گرے گا۔ وہ پھر آسمان کو دیکھتے ہوئے گھوما۔ اس کے چھتے بھی کندھوں پر ہوا کے جھونکوں میں لہراتے ہوئے گھومے۔

''بیٹھ جا شکورے،'' میں نے کہا۔ ''سکائی لیب کس طرف جائے گی، یہ خبر تو نے مجھے سننے ہی نہیں دی۔''

''جائے گی کہاں، بیوقوف!'' شکورے نے بتی کی طرف دیکھا۔ ''یہیں گرے گی۔''

''کہیں اور بھی گر سکتی ہے،'' میں نے پہلی بار بیدردی سے کہا۔ شکورا تیزی سے میری طرف مڑا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں، آنکھیں کھل کر بڑی بڑی سی لگنے لگیں۔

''بک بک نہ کر!'' وہ غصے سے چیخا۔ ''کشف ہوا ہے مجھے! پیر مراد شاہ نے... '' شکورے نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر ہونٹوں سے لگایا، چوما اور پھر انگلی اور انگوٹھے کو آنکھوں سے لگایا۔ ''پیر جی نے خود مجھ سے کہا ہے کہ سکلیب کھوڑ کی اس بنّی میں گرے گی... کیا وہ جھوٹے ہیں؟... توبہ توبہ۔ پیر مراد شاہ جی... توبہ کر توبہ!'' شکورے نے دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں اور انگوٹھوں سے اپنے کانوں کی لوؤں کو پکڑا۔ ''توبہ استغفار... توبہ... ایسا سوچ بھی مت!''

میں خاموش رہا۔ شکورا ایک بار پھر جوہڑ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ چٹان کا سخت ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس وقت مجھے چٹان کچھ زیادہ ہی سخت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے مجھے کولھے کی ہڈی میں دھیما دھیما سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ ہڈیوں سے جڑے عضلات میں اینٹھن سی تھی اور بیرونی جلد بے حس ہو چکی تھی۔ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا؛ اگر آتے ہوئے میں کرسیوں پر پڑی دو گدیاں لے آتا تو اس تکلیف سے شکورا بھی بچ جاتا۔ میں نے شکورے کی طرف دیکھا۔ وہ مزے سے بیٹھا تھا، میری طرح بار بار پہلو نہیں بدل رہا تھا۔ سارا دن دکان پر نہائی کے سامنے لکڑی کی چوکی پہ بیٹھنے والے شکورے کو شاید چٹان کی سختی کا احساس بھی نہیں تھا۔ شکورے کے پاس چادر تو تھی لیکن مجھے چادر مانگنا اچھا نہ لگا۔

''محرومی کی کوئی صورت نہیں ہوتی،'' کچھ دیر پہلے والی سوچ پھر میرے ذہن میں ابھری۔ ''ہر انسان کو، چاہے وہ غریب کے گھر جنم لے یا امیر کے، کسی نہ کسی روپ میں محرومی اپنی تلخی کا احساس دلا ہی دیتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امیروں کی محرومی اگر مادی ہو تو بہت جلد دور ہو جاتی ہے، لیکن غریبوں میں محرومی ان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، لڑکپن میں داخل ہوتی ہے، جوان ہو جاتی ہے، پھر ادھیڑ پنے سے گزرتی ہے اور بالآخر محرومی بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن کسی تصوراتی ہمزاد کی طرح انسان سے خود کو ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہونے دیتی، زندگی کے راستے پر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے کیونکہ اگر کوئی غریب محنت اور ذہانت سے یا کسی ہتھکنڈے سے اہل ثروت کے حلقے میں داخل ہو بھی جاتا ہے تو وہ غریب طبقے سے جدا ہو جاتا ہے۔ محنت اور ذہانت کے لیے کبھی کسی کو سازگار حالات ملتے

نہیں دیکھے لیکن ایسے کئی لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جو مذموم ہتھکنڈوں سے امیروں کے حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن غریبوں کے لیے، محرومی کا دکھ زندگی بھر ان کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ الاؤ جلتا رہتا ہے... شکورا اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ تو اپنے جبلی تقاضوں کا اس قدر اسیر ہے کہ شیداں کی موت کے بیس دن بعد ہی وہ ذکو پھرکی کے پاس چلا گیا تھا۔ اس کا شعور تاریکیوں میں روپوش ہے۔ وہ جاہلیت کی گہرائیوں سے کبھی نکل ہی نہیں پایا۔ اس دنیا میں، انسانوں کے روپوش معاشروں میں، نہ جانے کتنے شکورے ہوں گے۔''

میں نے شکورے کی سمت دیکھا۔ وہ بے چینی سے آسمان پر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''کتنے شکورے ہوں گے جو محرومی کے زخم کھا کر جی رہے ہوں گے... یہ زخم جو کسی مرہم سے مندمل نہیں ہوا کرتے۔ حاصل کا سکھ اس دکھوں کے زخموں کو بھر تو دیتا ہے لیکن داغ اندمال زندگی بھر اپنا احساس دلاتا رہتا ہوگا۔''

شکورے نے پہلو بدل کر میری طرف دیکھا۔

''کتنا لوہا ہوگا سکلیب میں؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''بہت ہوگا،'' میں نے جواب دیا۔

''ہزاروں من ہوگا؟'' اس نے کہا۔

''ہاں اتنا تو ہوگا۔''

میرے اس جواب پر شکورے کی آنکھیں چمکیں۔

''کروڑوں روپے کا ہوگا،'' اس نے خوشی سے کہا۔ ''یار... بہت پھیرے لگیں گے!''

مجھے شدت سے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ جب شکورے کو سکائی لیب کہیں اور گر جانے کی خبر ملے گی تو اس کا ردِعمل بہت خطرناک اور شدید ہوگا۔ اس کے دل میں دبی ہوئی خواہشات، اس کی نہائی کے پاس دھری انگیٹھی کی طرح اس کے دل میں محرومی کے دہکتے ہوئے کوئلے جلیں گے۔ اس صدمے کے بعد تو وہ شاید اپنے وجود ہی کو دہکتے کوئلوں پر اس لوہے کی طرح محسوس کرے گا جس سے وہ سنگل اور زنجیریں بناتا ہے۔

موے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

غالب کے اس مصرعے کا مفہوم مجھے کھلی آنکھوں سے دکھائی دے رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ جبلتوں کی اسیری جب انسان کے ذہن میں کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی ہے تو اس سے آزاد ہونا اس دنیا کے مشکل ترین اعمال میں سے ایک ہوگا۔ کیا ہوگا؟ میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔

''کب گرے گی سکلیب؟'' شکورا بے چین تھا۔

''بتایا تو ہے کہ ایک گھنٹے تیس منٹ کے اندر گر جائے گی،'' میں نے کہا۔

''صبح ہو جائے گی!'' شکورے کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہاں، ہو تو جائے گی،'' میں نے کہا۔

شکورا بار بار آسمان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر سکون محسوس ہو رہا تھا کہ شکورے کے ذہن میں نادرے کی کھوتا ریڑھی سے متعلق یہ بات موجود نہیں تھی کہ وہ صبح صبح سبزی لینے سپیال جایا کرتا ہے ورنہ وہ میرے لیے ایک اور مصیبت کا رستہ کھول دیتا کہ ابھی لے کر آؤ۔

''لوہے کی کیا قیمت ہے بازار میں؟'' شکورے نے پوچھا۔

''مجھے اندازہ نہیں ہے شکورے،'' میں نے جواب دیا۔ ''کبھی کسی سے پوچھا ہی نہیں میں نے۔''

''کروڑوں روپے کا ہوگا لوہا سکلیب میں۔'' شکورے کے ہر لفظ میں بے چینی تھی۔

''کیا کرے گا تو اتنی دولت کا؟''

میرے اس سوال پر شکورے کے پورے بدن نے جھٹکا کھایا۔

''سکلیب میری ہوگی،'' وہ تشویشناک لہجے میں بولا۔

''میں نے کب کہا ہے کہ تیری نہیں ہوگی!'' میں نے کہا اور شکورے کے ذہن میں ابھرنے والا شک مٹ سا گیا۔ اس کے چہرے پر سکون سا نمودار ہوا۔

''کروڑ پتی بن جاؤں گا...'' اس نے پورا بدن گھمایا اور میری سمت دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر بہت صاف تھا۔ ''زندگی بن جائے گی میری۔'' وہ مسکرایا۔

''کچھ تو سوچ رکھا ہوگا تو نے؟'' میں نے کہا۔

''سب سے پہلے تو،'' شکورے کی آواز میں خوشی کا تاثر بھرپور تھا۔ ''میں راولپنڈی جا کر کسی

Scanned with CamScanner

لوہے کے سوداگر سے ملوں گا۔ اسے اپنے ساتھ لاؤں گا اور کروڑوں روپے کا لوہا بیچوں گا۔ پر یار، میں اتنے روپے رکھوں گا کہاں؟''

''بینک میں،'' میں نے جواب دیا۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' شکورے نے پوچھا اور اسے جواب دینے کے لیے مجھے یہ سوال مشکل ترین محسوس ہوا۔

''بینک ایک کمپنی ہوتی ہے،'' میں نے شکورے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ کمپنی کے لفظ سے وہ مانوس تھا۔ ''لوگ اپنا روپیہ بینک میں رکھتے ہیں اور جب ضرورت محسوس ہوتی ہے، نکلوا لیتے ہیں۔ تمام کروڑ پتی لوگ بینک ہی میں روپے رکھتے ہیں۔''

''پر یار،'' شکورے نے پوچھا، ''وہ میرا روپیہ کھا تو نہیں جائیں گے؟''

''نہیں شکورے،'' میں نے کہا، ''جو بڑے بینک ہوتے ہیں وہ حساب صاف رکھتے ہیں۔''

''چھوٹوں کے پاس تو میں نے جانا ہی نہیں!'' شکورے نے کہا۔ ''جب میرے پاس کروڑوں روپے ہوں گے تو میں پہلے راولپنڈی میں زمین خرید کر سنگلوں اور زنجیروں کا کارخانہ لگاؤں گا۔ بہت سے کاریگر رکھوں گا۔ میرے کارخانے میں ہر روز سو سنگل اور دو سو زنجیریں بنیں گی۔ اور کارخانے کے ساتھ ایک بنگلہ بناؤں گا۔''

''وہ کس کے لیے شکورے؟'' میں نے پوچھا، اور شکورے کی آنکھیں چمکیں۔

''تیرے لیے،'' شکورے نے فوراً کہا۔ ''تو میرا اچھا یار ہے۔ تو ہی میرے کارخانے کا ایجنٹ ہوگا۔''

''ایجنٹ تو کمپنی کے ہوتے ہیں شکورے،'' میں نے کہا۔ ''جیسے یہاں ہیں، نارتھ فیلڈ ایجنٹ، ساؤتھ فیلڈ ایجنٹ۔ کارخانوں کے تو جنرل منیجر ہوتے ہیں۔''

ہاں ہاں وہی جرنیل،'' شکورے نے کہا۔

''جرنیل تو فوج میں ہوتے ہیں شکورے،'' میں نے کہا۔ ''جنرل منیجر!''

شکورے کو غصہ آ گیا۔

''پڑھ لکھ کر کیا سمجھنے لگا ہے تو اپنے آپ کو؟'' وہ غصے سے بولا۔ ''میں تجھے خوشخبری سنا رہا ہوں

Scanned with CamScanner

اور تو..."

"دیکھ شکورے،" میں نے کہا، "تو کارخانے کا مالک ہو گا۔ تجھے سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔"

"اچھا..." شکورے کا غصہ فوراً اتر گیا۔ "تو میرے کارخانے کا جن — جن — جرنیل ہو گا۔ میں تجھے ساڑھے تین سو روپے تنخواہ دوں گا۔"

"صرف ساڑھے تین سو روپے شکورے؟" میں نے کہا۔ "اتنی تنخواہ تو تجھ سے کارخانے کا چوکیدار بھی نہ لے گا۔"

"اس کی ماں..." شکورے نے تصوراتی چوکیدار کو گالی دی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "تو بہت لالچی ہے! اچھا چل پچیس روپے اور... ایک پیسہ اور نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے،" میں نے کہا۔ "تو جو بھی دے گا میں لے لوں گا۔"

شکورے کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے بڑے فخر سے سر ادھر اُدھر گھمایا، پھر میری طرف دیکھا۔

"چار حویلیاں بنواؤں گا کھوڑ گاؤں میں زمین خرید کر،" شکورے نے خوش ہو کر کہا۔ "ملکانی کی حویلی سے میری ہر حویلی بڑی ہو گی اور ہر حویلی میں دو جیپیں ہوں گی۔"

"چار حویلیاں کیوں شکورے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر حویلی میں میری ایک بیوی ہو گی۔" شکورے کی وحشت زدہ آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

"چار شادیاں کرے گا تو؟" میں نے کہا۔

"ہاں" شکورے نے کہا۔ "مرد ہوں... مسلمان ہوں... شرع میں جائز ہیں چار شادیاں... میری ایک بیوی..." شکورے نے قہقہہ لگایا، "گوری چٹی میم ہو گی۔"

مجھے شکورے کی اس دبی ہوئی خواہش پر واقعی حیرت ہوئی۔ شاید اس نے کالونی کی انگریز افسروں کی بیوی کو کئی بار دیکھا ہو گا۔ شاید اس نے جولیا کینارڈ کو دیکھا ہو گا کیونکہ وہی ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ باقی تین انگریز عورتوں میں سے دو ادھیڑ عمر کی معمولی خدوخال والی عورتیں تھیں۔ ایک اس قدر بوڑھی تھی کہ آئینے میں اپنے چہرے کی جھریاں بھی نہ گن پاتی ہو گی۔

Scanned with CamScanner

''شکورے،'' میں نے کہا، ''توان پڑھ ہے۔ میم تجھ سے کیوں شادی کرے گی؟''

''پیسہ!... دولت!... ''شکورے نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے انگوٹھا ملا کر اسے اوپر کی سمت جھٹکا دیا جیسے سکہ اچھال رہا ہو۔ ''بیوقوف! میرے پاس دولت ہوگی۔ ایک کیا، ہزار میمیں مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو جائیں گی۔ پر میں... ''شکورے نے آسمان کی طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں مسلمان ہوں... پہلے اسے کلمہ پڑھواؤں گا، پھر نکاح کروں گا۔''

''اور دوسری؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسری بھی گوری چٹی ہوگی،'' شکورے نے کہا۔ ''اس کے گال انار کے دانوں جیسے سرخ ہوں گے... پٹھانی ہوگی وہ۔''

میں نے بمشکل ہنسی روکی۔ شکورا خوشی سے چہرے کو اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر کھنچاؤ نمودار ہوا۔

''پٹھانی سے شادی کا سدّا (دعوت) میں خود دینے جاؤں گا نثار خانے (نثار خان) کو!'' شکورے نے اپنے پڑوسی کا ذکر نفرت آمیز لہجے میں کیا۔ ''خود جاؤں گا سدا دینے۔ آپ جا کر بلاؤں گا اسے پٹھانی سے شادی میں... پرسوں میں نے دُتے (عبداللہ) کی گائے کے لیے سنگلی بنانی شروع ہی کی تھی کہ حرامی مجھے پشتو میں گالی دے کر بھاگ گیا تھا۔''

''پر شکورے،'' میں نے کہا۔ ''میم انگریزی بولے گی، پٹھانی پشتو۔ تو باتیں کیسے کرے گا؟''

''بیوقوف!'' شکورے نے بلند آواز میں کہا۔ ''ہا... بیوقوف ہے تو! او... ہا... شادی میں باتوں کا کیا کام؟''

مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ شیداں کی موت کے بعد شکورا اپنے جبلی تقاضے کا بری طرح اسیر ہو چکا ہے۔ اس کے گنوار ذہن میں اب شادی کا مطلب صرف جنسی تسکین ہے۔ وہ عورت اور مرد کے معاشرتی رشتے کو بھول چکا ہے اور دونوں کے درمیان کسی ارفع تعلق سے قطعی طور پر ناآشنا ہے۔

''اور تیسری بیوی؟'' میں نے پوچھا۔

''سانولی ہوگی۔'' شکورا مسکرایا۔

''ذکو پھر کی جیسی؟'' میں نے کہا اور شکورے کی آنکھوں میں وحشت زدہ آنکھوں میں غصہ

نمودار ہوا۔

''بکواس نہ کر!'' اس نے غصے سے کہا۔ ''گولی مار ذکو پھرکی کو۔ میری بیویاں پاک دامن ہوں گی... خبردار جو میری بیویوں کا مقابلہ ذکو سے کیا۔ وہ کتی تو چاؤں چاؤں کرتے ہوئے میرا مغز خراب کر دیتی ہے۔ میں تو اپنی بیویوں پر کسی کی نظر بھی نہ پڑنے دوں گا۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''مسلمان ہوں میں، پردہ کراؤں گا۔''

''لیکن شکورے،'' میں نے کہا، ''گاؤں کی سب عورتیں مسلمان ہیں۔ ان میں سے تو کوئی پردہ نہیں کرتی۔''

''کبھی دیکھا ہے کسی ملکانی کو؟'' شکورے نے ملکانی کے لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''جیپ میں بھی برقع پہن کر بیٹھتی ہیں۔''

''پر شکورے،'' میں نے کہا، ''میم تو برقعے کی عادی نہیں ہوگی۔ وہ تو برقع نہیں پہنے گی۔ وہ تو گاؤں کی گلیوں میں گھومتی پھرے گی۔''

''ٹانگیں نہ توڑ دوں گا اس کی،'' شکورے نے غصے سے کہا۔ ''نکلے تو حویلی سے باہر!''

''اور چوتھی؟'' میں نے کہا۔ ''شکورا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا، پھر بتی کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

''کالی ہوگی۔'' اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

''کالی؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''ہاں کالی؟'' شکورے نے بھی تیزی سے کہا۔ ''وہ ہے نا خادما توتڑی (سرنائی) والا...''

''کون، استاد خادم حسین؟'' میں نے کہا۔

''ہاں... وہی،'' شکورے نے سر پھر اوپر نیچے ہلایا۔ ''استاد توتڑی والے نے ایک دن لیلا مجنوں کا قصہ سنایا تھا۔''

''شکورے،'' میں نے ٹوکا۔ ''لیلا نہیں لیلیٰ۔ لیلا تو لاہور کی طرف دنبے کو کہتے ہیں۔''

''ہا... او... معشوق بھی دنبہ ہی ہوتی ہے۔''

شکورے کی اس بات پر میں ہنسی روک نہ پایا۔ خلافِ توقع شکورا بھی ہنسنے لگا۔

Scanned with CamScanner

''استاد نے بتایا تھا،'' شکورے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیلا کالی تھی اور مجنوں سردار تھا۔ لیلا کا حسن دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ استاد نے کہا تھا کہ مجنوں لیلا کے غم میں سوکھ کر کیکر کا درخت بن گیا تھا... کالی کا اپنا روپ ہوتا ہے، بیوقوف!''

''شکورے، میں نے یہ تو نہیں کہا کہ کالی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوتی ہیں،'' میں نے کہا۔ ''لاہور میں میں نے ایک دبلی پتلی کالی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے چہرے پر نظریں ٹھہر گئی تھیں۔''

''بس... میں اسی سے شادی کروں گا،'' شکورے نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تجھے کرایہ دوں گا، تو لاہور جا کر اس کے باپ سے میرے لیے رشتہ مانگنا۔''

''لیکن شکورے مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے،'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو اسے ایک بڑے بازار میں دیکھا تھا جہاں بڑی بڑی کاروں پر لڑکیاں آ کر خریداری کرتی ہیں۔''

''دفع کر!'' شکورے نے فوراً کہا۔ ''بازار میں پھرنے والی سے میں شادی نہیں کروں گا۔ کوئی فکر نہیں، فتح جنگ سے پنڈی گھیب تک کسی نہ کسی گاؤں میں مجھے کالی ملکانی مل ہی جائے گی۔ کالی سے شادی تو میں ضرور کروں گا — گوریوں سے جب تنگ آ جاؤں گا، سانولی سے بھی آوازار (بیزار) ہو جاؤں گا تو کیا کروں گا؟ ایک بیوی تو کالی ہونی چاہیے... کالی کا اپنا روپ ہوتا ہے۔''

شکورا کچھ دیر کے لیے رکا، لیکن اس کے دل میں جو طوفان اٹھ چکا تھا اس کو روکنا اب اس کے بس میں بھی نہ تھا۔

''میں اپنی ہر بیوی کے پاس ایک ایک ہفتے رہا کروں گا۔'' شکورے کے چہرے پر جوش سا تھا۔ ''جب ایک گابھن (حاملہ) ہو جائے گی تو تین بیویوں کے پاس دس دس دن رہوں گا، جب دو گابھن ہو جائیں گی تو دو کے پاس پندرہ پندرہ دن رہوں گا، اور جب تین گابھن ہو جائیں گی تو چوتھی کے پاس پورا مہینہ رہوں گا۔ مولوی جی نے ایک بار جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس لیے اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔''

اگر چاروں ایک ساتھ ہو گئیں تو؟'' میں نے پوچھا۔ شکورے نے سوچتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

''راولپنڈی میں بنگلہ ہوگا... اور پھر کیاں بھی!'' شکورے نے مجھے آنکھ ماری۔

''یہ تو زیادتی ہے شکورے،'' میں نے کہا۔ ''بیویاں تو پاک دامن ہوں اور تو...''

شکورے نے جوہڑ کے پانی کی طرف دیکھا، آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جوہڑ کی طرف منہ کر کے تھوڑا سا آگے جھکا۔

''او بیوقوف، مرد کو سب معافی ہوتی ہے!'' شکورے نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ ''مولوی جی نے ایک جمعے کے خطبے میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا مردوں کے لیے بنائی ہے۔ مرد خوش اور مضبوط رہیں گے تو دین کی حفاظت کریں گے۔ عورتوں کا کیا ہے، وہ تو مردوں کی کھیتیاں ہیں — جتنی زیادہ کھیتیاں ہوں گی اتنا ہی ہل چلے گا۔ آئی بات تیری سمجھ میں بیوقوف!... میں مرد ہوں... تیری طرح کھسرا (ہیجڑا) نہیں ہوں کہ ساری جوانی گزار کے اب شادی کی ہے اور وہ بھی ایک — کھسرا زنانہ...''

شکورا مجھے بے عزت کرنا شاید اپنا حق سمجھتا تھا اور میں بھی اس کے اس استحقاق کو لاشعوری طور پر تسلیم کرتا تھا۔ مجھے کوئی توہین محسوس نہ ہوئی۔ مجھے اس کی کسی بات پر غصہ آتا ہی نہیں تھا، شاید اس لیے کہ مجھے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا۔

''وہ جو ہیں اپنے پیر مراد شاہ،'' شکورے نے کہا، ''سات بیویاں ہیں ان کی۔ پھر بھی دربار میں آنے والی جوان لڑکیوں کے چہرے غور سے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی پسند آ گئی تو آٹھواں نکاح کر لیں گے۔ وہ مرد ہیں... میں بھی مرد ہوں۔ تو بس ایک ہی عورت کے ساتھ جی لینا — کھسرے!''

''تو نے بھی تو شیداں کے ساتھ دو سال گزارے تھے،'' میں نے کہا۔ ''جیتی ہوتی تو اب بھی تو اسی کے ساتھ ہوتا۔''

شکورے کے پورے بدن نے جھٹکا کھایا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم سے سنجیدگی سی ظاہر ہوئی۔

''شیداں کی بات اور تھی،'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''پھر ایسی بات نہیں کروں گا... معاف کر دے... رب بھرجائی (بھابھی) کو لمبی زندگی دے... ناراض ہو گیا ہے؟''

Scanned with CamScanner

''نہیں شکورے،'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تجھ سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟ اچھا چھوڑ اس بات کو۔ یہ بتا کہ کارخانہ بھی لگ گیا، بیویاں بھی آگئیں، ان کے لیے حویلیاں بھی بن گئیں، جیپیں بھی آگئیں۔ پھر کیا کرے گا تو؟''

شکورے کے چہرے پر پھر سے شگفتگی سی آئی، پھر کھنچاؤ سا نمودار ہوا۔

''کیا تو سچ کہتا ہے کہ کسی کا خون زہریلا نہیں ہوتا؟'' اس نے تذبذب میں کہا۔

''میرا یقین کر شکورے،'' میں نے کہا۔ ''کسی کا خون زہریلا نہیں ہوتا۔''

''میرے بچے ہوں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ضرور ہوں گے،'' میں نے جواب دیا۔

''بس، میں اپنے بچوں کو بڑے بڑے سکولوں میں پڑھاؤں گا، جہاں ماسٹر محمد جان جیسے لمے کھچر (لمبے خچر) نہیں ہوں گے۔ میں اپنے بچوں کو امریکہ بھیج دوں گا۔ وہ وہاں پر سکلیبیں بنائیں گے... ابھی تک آئی کیوں نہیں؟''

''شکورے، اپنے وقت پر ہی گرے گی سکائی لیب،'' میں نے کہا۔ ''تو یہ بتا کہ تیری اور تمنا کیا ہے؟''

''میرے کھانے میں دال تو بالکل نہیں ہوگی!'' شکورے نے ناک سکوڑا۔

مجھے ہنسی آگئی۔ شکورا بھی ہنسا۔ شیر علی کے ہوٹل پر دوپہر کے وقت سبزی اور رات کو ہمیشہ ماش کی دال پکتی تھی۔ گوشت وہ کبھی کبھی ہی پکاتا تھا۔ جس دن گوشت پکتا تھا، شکورا اس دن بھی دال ہی کھاتا تھا۔ وہ اپنی ساری بچت زکو پھر کی کودے آتا تھا۔

''گوشت کھانے سے تو بیماریاں لگ جاتی ہیں،'' میں نے کہا، ''دل کی بیماریاں۔''

''تو بیوقوف ہے!'' شکورے نے کہا۔ ''گوشت کھایا کر!... تبھی تیری شادی دیر سے ہوئی ہے... گوشت کھایا کر گوشت... میرے کھانے میں تو ہر روز آلو گوشت ہوا کرے گا جسے میں نمبو (لیموں) نچوڑ کر کھایا کروں گا گرم روٹیوں کے ساتھ۔''

میں نے ٹارچ جلا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند ہمارے سروں سے گزر کر مغرب کی سمت جا چکا تھا۔

''شکورے، آلو گوشت تو ہر کوئی کھاتا ہے،'' میں نے کہا۔ ''کروڑ پتی لوگ تو ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی میزوں پر بھنے ہوئے مرغے، بریانیاں، چینی اور یورپی کھانے اور کئی قسم کے پکوان ہوتے ہیں۔ ان کی میزوں پر تو بھنے ہوئے پورے دنبے پڑے ہوتے ہیں۔''

''میں سب چیزیں کھاؤں گا،'' شکورے نے منہ میں آیا ہوا لعاب نگلا۔ ''ایک شے بھی نہ چھوڑوں گا۔ پورا دنبہ تو نہیں، ایک دو سیر تو کھا ہی جاؤں گا۔''

''تیرا پیٹ خراب ہو جائے گا،'' میں نے کہا اور شکورے کو غصہ آ گیا۔

''تو تو یہی چاہتا ہے کہ میں دال کے ساتھ سوکھیاں ٹھنڈی روٹیاں کھاتا رہوں،'' شکورے نے غصے سے کہا۔ ''کروڑ پتی بن کر میں کیوں نہ اچھے اچھے کھانے کھاؤں... بول، کیوں نہ کھاؤں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ تو نہ کھا،'' میں نے کہا۔ ''میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ کھانا ہمیشہ اتنا ہی کھانا چاہیے جس سے پیٹ خراب نہ ہو۔ تھوڑا کھانا صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا،'' شکورے نے کہا۔ ''میں تو تین سیر گوشت بھی کھا جاؤں گا... تیری طرح چڑا نہیں ہوں میں!''

''تیری اور خوراک کیا ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ہر حویلی میں بھینس ہوگی،'' شکورے کے لہجے میں پھر شگفتگی آ گئی۔ ''ہر صبح میں رات کی باسی روٹی کے ساتھ لونی (مکھن) کا پیڑا کھاؤں گا اور لسی کا پیالہ پیوں گا۔ کبھی کبھی انڈے پراٹھے کا ناشتہ چائے کے ساتھ بھی کیا کروں گا — نہیں، چائے کے ساتھ نہیں... دودھ پتی کے ساتھ۔''

''اور کچھ؟'' میں نے پوچھا۔

''دودھی کا حلوہ،[23] گاجر کا حلوہ، گڑ کے میٹھے چاول، کھیر، گری (ناریل) والا زردہ، برفی، جلیبیاں، ساری مٹھائیاں، ہر روز ایک تربوز، چار خربوزے، دو سیر آم، سیب، انگور، آلوچے، آلو بخارے، خرمانیاں (خوبانیاں)، کھجوریں، انار، انجیریں، بادام، پستے — سارے پھل کھاؤں گا۔''

---

23 شمالی پنجاب کا دودھ اور سوجی سے بنا ہوا حلوہ۔

''شکورے تیرا پیٹ واقعی خراب ہو جائے گا،'' میں نے کہا۔ '' کھٹے ڈکار آئیں گے تجھے!''

''میں حکیم خدا بخش سے تمّے کا چورن[24] لے لوں گا،'' شکورے نے کہا۔ ''بھینسیں ہوں گی میرے پاس۔ دہی پر سفید زیرہ ڈال کر کھا لوں گا[25]۔''

چاندنی سے اب جوہڑ کے مشرقی کنارے کی سمت پانی میں جھلملاہٹ تھی۔ مغرب کی جانب پہاڑی کے نیچے جوہڑ کا کنارہ نیم تاریکی میں صرف اپنے دھیمے دھیمے نقوش ہی دکھا رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے میدان کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتی تھی۔

''اور بھی تو کچھ تیری خواہشیں ہوں گی؟'' میں نے کہا اور شکورے کے چہرے پر پھر کھنچاؤ نمودار ہوا۔ چاندنی میں اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی لمبی ناک تھی جس کے اوپر اس کی پیشانی پر شکنیں سی ابھریں۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں غصہ نمودار ہوا۔

''ملک یار محمد کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھوں گا،'' شکورے نے غصے سے کہا۔ ''ملکانی کو اپنی حویلی میں گھسنے نہ دوں گا، کسی بھی حویلی میں۔ اپنی بیویوں کو اس سے دور رکھوں گا... ملک یار محمد کو تو میں گرفتار کرا دوں گا۔ فتح جنگ سے پنڈی گھیب تک ہر گاؤں میں اس کے آدمی شراب، افیم اور چرس بیچتے ہیں۔ جب وہ تھانے میں بند ہو گا اور ملکانی اسے ملنے آئے گی تو میں تھانیدار سے کہوں گا، گیٹ نہ کھولے۔'' شکورے کا غصہ تیز ہو رہا تھا۔ آنکھیں پوری کھل رہی تھیں۔

''ماسٹر محمد جان کو، لُچے کنجر کو تو میں نہیں چھوڑوں گا... زندہ ہے کہ مر گیا ہے؟''

---

24 حکما اندرائن (حنظل) کا سبز کڑوا پھل لے کر اس کا اوپر سے ڈھکن سا کاٹ لیتے ہیں۔ اندر سے آدھا گودا نکال کر کالا نمک اور اجوائن بھر دیتے ہیں اور دھوپ میں رکھ دیتے ہیں۔ چھ سات دن بعد ڈھکن اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اجوائن پھول جاتی ہے۔ اجوائن اور نمک نکال کر اسے خشک کرنے کے بعد پیس لیتے ہیں۔ اسے مقامی لوگ تمّے کا چورن کہتے ہیں۔ یہ آریو ویدک نسخہ شمالی پنجاب کے دیہاتوں میں ہاضمے کے لیے اکسیر سمجھا جاتا ہے۔

25 یہ بھی ایک آریو ویدک نسخہ ہے۔ دہی کے چھوٹے سے پیالے میں دو چمچ پانی ڈال کر اسے دہی میں ملا لیتے ہیں، پھر چٹکی بھر نمک اور چٹکی بھر کالی مرچ اور ایک چمچ سفید زیرہ ملا کر، ہر کھانے کے بعد چمچ سے کھا لیتے ہیں۔ کالا زیرہ ممنوع ہے۔ سفید زیرے والا دہی چند گھنٹوں ہی میں معدے کی تیزابیت ختم کر دیتا ہے۔ سینے کی جلن مٹ جاتی ہے۔ مسلسل تین مہینے باقاعدگی سے استعمال کرنے سے پرانا السر بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

''یہ تو میں نہیں جانتا،'' میں نے کہا۔ ''زندہ بھی ہوا تو بہت بوڑھا ہو گا۔''

''بوڑھا ہے تو کیا ہوا؟'' شکورے کا غصہ اس کے جسم کی ہر حرکت سے نمایاں تھا۔ ''اپنے نوکروں سے کہوں گا اسے اٹھا کر لائیں۔ اپنی حویلی کے صحن میں اسے مرغا بنا کر کس کس کے سوٹیاں ماروں گا۔'' شکورے نے بازو اسی انداز میں گھمایا جس انداز سے وہ دورے کے دوران میں نہائی پر ہتھوڑا مارتا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ وہ غصے میں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

''اور وہ سا کا کانا — اسے بھی حویلی میں لا کر باسی ٹھڈے ماروں گا... اور وہ دائی منظوراں، موٹی گدھی، اسے تو میں حویلی صحن میں بلا کر موہرا (سنکھیا) کھلا دوں گا۔ پھر اس کے سارے کپڑے اتار کر، چڈی پہنا کر، چارپائی پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں گا اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہوں گا جب تک اس کا پیٹ نیلا نہ ہو جائے۔'' شکورے کی آنکھیں غصے سے ابل رہی تھیں۔

''تو تو بہت خطرناک ہے شکورے!'' میں نے کہا۔ ''بدلے میں اتنا ظلم؟''

''وہ ظالم نہیں تھے کیا؟'' شکورا چیخا۔ ''میں گیٹ پر ٹکریں مارتا رہا، مدد مدد چیختا رہا، اس لمی ہتھنی (لمبی اونٹنی) ملکانی نے چوکیدار کو حویلی کا گیٹ ہی نہ کھولنے دیا۔ اور وہ ماسٹر محمد جان... یاد نہیں ہے تجھے؟ اس نے میری شلوار ساری جماعت کے سامنے اتاری تھی۔ مجھے مرغا بنا کر ننگے جسم پر سوٹیاں ماری تھیں۔ بھول گیا ہے تو؟... میری — سوج گئی تھی، رات کو الٹا سویا تھا۔ بچہ تھا میں، ورنہ بتاتا مادر — کو۔ اور وہ سا کا کانا، حرامی میری آٹھ دن کی کمائی کھا گیا۔ اور وہ دائی منظوراں، ڈین (ڈائن)، کھا گئی میری شیداں کو!'' شکورے کی آواز دھیمی ہو گئی۔ ''چار دن پہلے بتا دیتی تو میں شیداں کو راولپنڈی لے جاتا۔ سترہ سو روپے تھے میرے پاس۔''

آخری جملے پر شکورے کی آواز رندھ سی گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں اس کے آنسو تھرتھراتے نظر آئے۔ میری جانب دیکھے بغیر اس نے آستین کو پورے چہرے پر رگڑا۔ مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ شیداں کی شکورے کی زندگی میں کیا اہمیت تھی۔

''شیداں نہ مرتی،'' شکورے نے غمزدہ دھیمی آواز میں کہا، ''تو آج میرے مقدر پر کتنا خوش

ہوتی۔''

ماحول افسردہ ہو گیا۔ مجھے اپنی غلطی کا پھر احساس ہوا۔

''مجھے شکورے کے اس پاگل پن کا ساتھ نہیں دینا چاہیے تھا،'' میں نے سوچا۔ ''غلطی ہو گئی مجھ سے۔ انکار کر دیتا تو کیا تھا؟ دس بارہ گندی گالیاں دیتا، ناراض ہو جاتا اور پھر مان بھی جاتا۔ یہ میں نے کیا کیا!... وہ کس مقدر کی بات کر رہا ہے؟ جو کچھ دیر کے بعد اس کے لیے شدید ذہنی صدمہ لے کر آئے گا؟ جب میں اسے بتاؤں گا کہ سکائی لیب کہیں اور گر گئی ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟... شدتِ غم سے وہ کہیں اپنا بچا کھچا ذہنی توازن نہ کھو دے... یہ میں نے کیا کیا!''

مجھ پر مایوسی کی تاریکی چھا گئی۔ پھر اس تاریکی میں ایک کرن سی چمکی۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ صدمہ اپنی تلخ حقیقت سے اس کے خوابیدہ ذہن کو بیدار کر دے۔ اُس میں شعور پیدا ہو جائے... وہ سنبھل جائے... ممکن ہے کہ اس صدمے سے اس کا پاگل پن ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور وہ اپنی محرومیوں کے ساتھ جینا سیکھ لے!''

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے میرے کپڑے پھڑپھڑائے۔ کولھے کی ہڈیوں سے جڑے عضلات اینٹھے ہوئے تھے، بیرونی جلد بے حس ہو کر اپنا احساس تک کھو چکی تھی۔ میں چٹان سے تھوڑا سا اٹھا، پھر بیٹھ گیا۔ شکورا خاموش تھا۔ چٹان سے تھوڑا سا اٹھنے پر خون کی گردش سے مجھے ناف کے نیچے زندہ جسم کا بھرپور احساس ہوا۔

''انسان کتنا کمزور ہے،'' میری سوچ کا رخ بدلا۔ ''کس قدر ناتواں، خواہشوں کا اسیر، محرومی میں حاصل کے خواب دیکھنے والا۔ خواہشوں سے بلند ہونا اور انھیں تیاگ دینا آسان نہیں ہوتا۔ جہاں یہ خواہشیں حاصل کی ہیں وہاں ان کا ایک بھیانک پہلو انتقام بھی ہے۔ ہر منتقم شخص بدلہ لینے میں ظالم تو ہو ہی جاتا ہوگا، لیکن شکورے کے وجود میں وحشیانہ درندگی کا ایک پس منظر بھی ہے — ہولناک پس منظر۔ نہ جانے کتنی بار وہ نہائی پر ہتھوڑا مار مار کر نڈھال ہوا ہوگا... انتقام کی آگ شاید کہیں بھی کسی انسان میں بھی سرد نہ ہوتی ہوگی۔ شعلوں کی طرح لپک لپک کر دل و دماغ کو جلاتی ہوگی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں منتقم شخص کے دل و دماغ میں انتقام کا زہر بدلہ لینے کے بعد بھی پھیلا رہتا ہے۔ انتقام لینے کے بعد بھی یہ آگ نہیں بجھتی؛ کبھی راکھ میں دبی چنگاری بن کر

Scanned with CamScanner

سلگتی رہتی ہے، کبھی دھواں بن کر انتقام لینے والے کے وجود کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے زندگی بھر چین نہیں لینے دیتی۔ شاید یہی تپش، یہی جلن انتقام لینے والے شخص کی سزا بھی ہے۔''

شکورے کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بے بسی جس کے ساتھ وہ خیالی انتقام لیتا رہا ہے، اس کے چہرے پر عیاں تھی، لیکن اس کا غصہ کسی خوف میں نہیں بدلا تھا، اس نے غم کا ماتمی لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

''ہزاروں خواہشیں ہیں جو محرومی سے جنم لیتی ہیں اور پھر لاحاصلی کے جوہڑ میں ڈوب جاتی ہیں!'' میری سوچ میں جھلملاہٹ سی نمودار ہوئی۔'' رہی آسودگی، تو وہ برساتی پانی کی طرح انتظار کا روپ دھار کر، امید کی دراڑوں میں سے جھرنا بنا کر بہتی رہتی ہے، خوابوں کو بھرتی رہتی ہے اور پھر نارسائی کی تپش سے سوکھ بھی جاتی ہے۔ انسان پیاسے ساغر کی طرح زندگی کے لاحاصل صحرا میں بھاگتا رہتا ہے، دوڑتا رہتا ہے، اور پھر اس کا وجود ہی مٹ جاتا ہے۔ صحرا میں صرف بار بار معدوم ہونے والے سراب ہی رہ جاتے ہیں، لیکن اس دنیا میں انسانی زندگی تمناؤں سے فریب کھا کر بھی امید کے سہارے رواں رہتی ہے اور اس امید سے تشکیل پانے والے انتظار میں شکورے جیسے ان گنت لوگ خود کو فریب دیتے رہتے ہیں... انتظار خود ایک فریب بن جاتا ہے... لاحاصلی کا عفریت، تصوراتی غول بیابانی کی طرح چیختا چلاتا، چکروں میں گھومتا، دھول اڑاتا، اپنی وحشت میں رقص کناں رہتا ہے اور اس ہولناک گردش میں پھنسے اجسام سے خراج میں خون نچوڑتا رہتا ہے... یہاں تک کہ اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، اور وہ خون اُگلنا شروع کر دیتا ہے۔ لہو کے چھینٹے اڑاتا ہے جن میں خود اس کا وجود بھی تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں انسانوں کو لاحاصلی کے اس عفریت سے کون بچائے گا؟... کوئی نہیں۔ کوئی غیر مادی اور ماورائی قوت انسانوں کو نجات نہیں دلا سکتی۔ انسانوں کو خود ہی اس خود فریبی سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔''

اچانک چٹان کے عقبی حصے کے نیچے چر چر... چک چک... کی آواز ابھری۔ ہوا کے جھونکوں کے باوجود سرسراہٹ سی سنائی دی۔ میری طرح شکورے نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ وہ بھی تیزی سے گھوما۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا اور عقبی ٹوٹی پھوٹی چٹان کے کنگروں سے نیچے جھانکا۔ نیچے خاصی بڑی جسامت کی چھچھوندریں نظر آئیں۔ وہ تعداد میں چار تھیں اور اپنی لمبی تھوتھنیوں سے مٹی کو سونگھتی ہوئی، خشک گھاس کے تنکوں میں سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی آگے پیچھے قطار میں چلی جا رہی

Scanned with CamScanner

تھیں۔

''حرامی چک چوندریں،'' (چھچھوندریں) شکورے کی اداس سی ہنسی سنائی دی۔

چھچھوندریں چٹان کی ڈھلوان کا چکر کاٹ کر جوہڑ کی سمت چلی گئیں۔ میری طرح شکورے نے بھی مڑ کر، اچک کر چہرہ جوہڑ کی سمت کر لیا۔ مجھے ایک بار پھر کولھے کے نیچے بیرونی جلد کے بے حس ہونے کا احساس ہوا۔ پتھریلی سطح نے خون کی گردش روک رکھی تھی۔

''یہ حرامی بنّی کی طرف کیا کرنے گئی ہیں؟'' شکورے نے قدرے بہتر لہجے میں کہا۔

''سکائی لیب لینے گئی ہیں،'' میں نے فوراً جواب دیا۔

شکورے نے چٹان پر پڑی ہاکی اٹھالی۔ ''بک بک نہ کر!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ایک لگاؤں گا تیرے سر پہ، ماں یاد آجائے گی۔'' اس کا لہجہ پھر خوشگوار ہو گیا۔

''خبریں کب آئیں گی؟'' شکورے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تو آنے والی ہو گی سکلیب!''

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں بارہ منٹ باقی تھے۔

''ابھی بارہ منٹ رہتے ہیں،'' میں نے کہا۔

مجھ پر غنودگی کی کوئی کیفیت نہ تھی لیکن تھکن کا احساس بوجھل تھا۔ آدھا چاند مغربی افق کی سمت جا چکا تھا اور اپنے راستے کا تعین کر رہا تھا۔ مغربی پہاڑی کی ڈھلوان اب نیم تاریک تھی۔ شکورا پھر خاموش ہو گیا۔

''کیا ستم ظریفی ہے،'' میں نے سوچا، ''دنیا میں ایک طرف تو لوگ محرومی کے الاؤ میں جھلس رہے ہیں اور دوسری جانب اربوں ڈالر خلائی تحقیق پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف اس دنیا میں لوگ بھوک سے بے حال ہیں اور دوسری جانب خلائی سائنسدان کسی ایسے سیارے کو تلاش کر رہے ہیں جہاں کا ماحول زمین جیسا ہو گا۔ آٹھ برس پہلے بنگلہ دیش میں چھوٹے چھوٹے بچے گندی نالیوں سے چاول کے دانے چن چن کر، انھیں دھو کر اپنی بھوک مٹاتے، ٹی وی اسکرین پر انسانیت کا منہ چڑا رہے تھے۔ افریقہ میں آج بھی ڈھانچہ نما بچے، کیڑوں سے پھولے شکموں کے ساتھ زمین پر انسانیت کے چہرے کا کلنک بنے ہوئے ہیں۔ اور خلائی سائنسدان خلا میں کسی نئی زمین کو تلاش کر

رہے ہیں، جہاں خشکی کے ساتھ سمندر بھی ہوں گے، جہاں قطبین پر برف بچھی ہوگی، جہاں کوہسار ہوں گے، جھرنے گریں گے، ندیاں رواں ہوں گی، جھیلیں ہوں گی، میدان ہوں گے، سمندروں کے قریب ساحلی پٹیاں ہوں گی، جہاں جھیلوں سے نکلتے ہوئے دریا میدانوں کو سیراب کرتے ہوں گے، جزیروں میں، ساحلی علاقوں میں، میدانوں میں، کوہساروں پر، ہر سمت ہریالی ہوگی، جہاں جنگل بھی ہوں گے، صحرا بھی، جہاں اناج ہوگا، سبزیاں ہوں گی، پھل ہوں گے، زندگی کا بھرپور اظہار ہوگا... اور یہ زمین... جب اس زمین پر ہولناک ایٹمی جنگوں کے بعد زندگی ناپید ہونا شروع ہو جائے گی تو وہ اپنی اپنی قوم کے سرکردہ افراد اور دنیا بھر کے اہلِ ثروت لوگوں کو ان کے مال و متاع کے ساتھ دریافت شدہ سیارے میں لے جائیں گے۔ دنیا بھر کے دولت منداپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ نئی زمین پر نئی دنیا بسانے چلے جائیں گے — لیکن نقل سیارگی کرتے ہوئے وہ اس زمین پر، جلتی سلگتی خاکستر زدہ زمین پر اربوں انسانوں کو سسک سسک کر مرتا چھوڑ جائیں گے... کیا یہ خود غرضی کی بدترین مثال نہ ہوگی؟''

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں آٹھ منٹ باقی تھے۔ شکورے کا اضطراب بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت اس کی اندرونی ہیجانی کیفیت کی غماز تھی۔ وہ بار بار آسمان کی سمت نظریں دوڑا رہا تھا۔

''دنیا بھر میں جتنی دولت خلائی تحقیق کے پروگراموں پر خرچ کی جا رہی ہے، اس سے کروڑوں انسانوں کو سال بھر کے لیے دو روٹیاں روزانہ فراہم کی جا سکتی ہیں، زراعت کو فروغ دیا جا سکتا ہے، اسی زمین پر انسانوں کو جینے کے لیے بہترین ماحول دیا جا سکتا ہے، صحتِ عامہ کی سہولتیں فراہم کی جا سکتی ہیں، فرسودہ عقائد کو ختم کرتے ہوئے علم کی روشنی پھیلائی جا سکتی ہے، اس علم کی روشنی جو اس دنیا میں موجود لوگوں کی نسل اور قومیت کے امتیاز کے بغیر تمام لوگوں کی، فلاح کے لیے ہو؛ شعور کو فروغ دے کر، خوف اور خود غرضی کے ستون گرا کر، انسانوں میں عزتِ نفس کو فروزاں کرتے ہوئے، اسی دنیا کو تصوراتی نئی زمین اور جنت بنایا جا سکتا ہے۔''

شکورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ بار بار چٹان پر ایک ہی جگہ گھوم گھوم کر آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ گھڑی پر چار بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔

Scanned with CamScanner

''کیا مستقبل میں بھی صرف امیروں ہی کو جینے کا حق ملے گا؟... شاید آج کی دنیا کے اہل اقتدار و اختیار اس ادراک سے قطعی طور پر محروم ہیں کہ اس دنیا سے نقل سیارگی کرنے کے بعد جس نئی زمین پر بھی جائیں گے، ہوس کا عفریت ان کے ساتھ جائے گا۔ وہ خاکستر میں تبدیل ہوتی ہوئی اس زمین سے چلے تو جائیں گے لیکن کروڑوں، اربوں انسانوں کو تڑپ تڑپ کر مرتا چھوڑ جائیں گے۔ وہ انسانی ہمدردی اور رحم کے تمام تر جذبات سے محروم ہو کر ہی جائیں گے۔ پھر وقت گزرے گا، ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا، نئی زمین پر سال گزریں گے، صدیاں گزریں گی، قومیت کی بنیاد پر ان کے قبیلے بنیں گے۔ نئی زمین پر جغرافیائی حدود نمودار ہوں گی، ملک قائم ہوں گے، حکومتیں بنیں گی... پھر ان کے معاشروں میں ہوس کا عفریت طبقات قائم کرے گا، آقا اور غلام کی روایت دوبارہ اپنی جڑ کو مضبوطی سے پکڑے گی۔ پھر نئی زمین پر مذاہب، علاقائی تقسیم اور وسائل کے لیے جنگیں شروع ہو جائیں گی، دریافت شدہ سیارے پر خون بہے گا، بھیانک ہتھیار بنیں گے اور بہیمانہ سیاست کے چھلاوے، قوتِ شر کے اشاروں پر ناچتے ہوئے وہاں بھی انسانی زندگی کو عذاب بنا دیں گے۔ اور پھر وہاں کے سائنسدان ایک بار پھر کائنات میں کسی نئے سیارے کی تلاش شروع کر دیں گے جہاں امن و آشتی ہو تاکہ دریافت شدہ سیارے سے، نئی زمین سے سرکردہ افراد اور اہلِ ثروت کو کسی اور نئی زمین پر لے جا سکیں... یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا!''

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے۔

''اس دنیا کو اگر ہوس کی آلودگی سے نجات مل جائے، انسانوں کے لیے بہترین جینے کا ماحول فراہم ہو جائے تو میں ابھی سے ہر قسم کی خلائی تحقیق کی زبردست حمایت کروں گا۔ اس دنیا کو تصوراتی جنت بنا کر اگر کسی نئے سیارے کی تلاش کی جائے گی تو وہ بہت مثبت اور خوش آئند اقدام ہوگا تاکہ انسانی مساوات اور کسی قسم کے بھی قومی اور نسلی امتیاز کے بغیر اس دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر، یہاں کے انسانوں کو نقل سیارگی کرائی جا سکے۔ ایسی صورت میں کسی نئے سیارے میں جانے والے آباد کار ہوس سے آلودہ نہیں ہوں گے۔ وہ انسانی ہمدردی اور انسانی اقدار کو ساتھ لے کر جائیں گے۔''

شکورے پر جنون سا طاری تھا۔ ہیجانی کیفیت اپنے عروج پر پہنچتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ

Scanned with CamScanner

مسلسل آسمان کی طرف سر اٹھائے سکائی لیب کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے پاؤں مسلسل گھوم رہے تھے۔ میری کلائی پر بندھی گھڑی نے مجھے بتایا کہ چار بجنے میں دو منٹ باقی ہیں۔ شکورا مجسم انتظار تھا، آسمان کی سمت منہ اٹھائے چکر کھاتا انتظار...

''دنیا میں قوتِ شر نے ضمیر اور شعور کا راستہ روک رکھا ہے۔ مفادات، تاریک مفادات، انسانی شعور کو تاریکی میں روپوش کر رہے ہیں۔ ہر آتا ہوا لمحہ جاتے ہوئے لمحے کے ساتھ انسانی ذہنوں پر ہوس کی تاریکی کو تہہ بہ تہہ بٹھاتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی تصوراتی جہنم رسیدگی سے بھی بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں کوئی تصوراتی جنت کیا محض ایک فریب نہیں ہے؟''

''اب تو آ گئی ہوں گی خبریں؟'' شکورے کی آواز میں اس کی داخلی ہیجانی کیفیت تھرتھرا رہی تھی۔ گھڑی کے بغیر بھی اس کی وقت کا تعین کرنے کی صلاحیت پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی سے خبروں کی ہیڈ لائنز میں پہلی خبر سکائی لیب ہی کی تھی۔ ایک چھوٹی سی خبر، جو اپنے ساتھ طوفان لانے والی تھی۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ سکائی لیب بحرِ ہند میں گر گئی ہے اور اس کا تیرتا ہوا ملبہ تلاش کرنے کے لیے امریکہ کا بحری جہاز قریبی بندرگاہ سے روانہ ہو گیا ہے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔

''کیا خبر ہے؟'' شکورا چیخا۔ ''ریڈوا کیوں بند کر دیا ہے؟''

میرے لیے وہ لمحات انتہائی کٹھن تھے، پھر بھی میں نے شکورے کو سب کچھ سچ بتانے کا فیصلہ کیا۔

''شکورے، خبر اچھی نہیں ہے...'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا؟'' اس کا منہ آنکھوں کی طرح کھل گیا۔ ''نہیں!... نہیں!''

''سکائی لیب سمندر میں گر گئی ہے شکورے،'' میں نے بیدردی سے کہا۔

''تو جھوٹ بول رہا ہے!'' شکورا پھر چیخا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟... نہیں ہو سکتا! تو جھوٹ بول رہا ہے!''

''نہیں شکورے،'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ امریکی ریڈیو اسٹیشن سے امریکی خبریں سنانے والے نے بتایا ہے کہ سکائی لیب سمندر میں گر گئی ہے اور

Scanned with CamScanner

امریکہ کا سمندری جہاز اسے لینے چل پڑا ہے۔''

شکورے پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر تاریک، بھیانک اور بوجھل غم کا احساس پوری شدت سے گر چکا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، دونوں بازو آسمان کی طرف اٹھائے۔

''ہال نی کوڑیے تقدیرے، ہینڈی میں... '' شکورے نے تقدیر کو اسی انداز میں گالی دی، جس کربناکی سے اس نے شیداں کی موت پر دی تھی۔ وہ گالی دیتے ہوئے گھوم گیا۔ اب اس کی پشت جوہڑ کی سمت تھی۔ وہ آگے کی سمت جھکا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ چٹان پر منہ کے بل گر جائے گا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ اسے پکڑ بھی نہ پایا تھا کہ وہ گھٹنوں کے بل چٹان پر گرا۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑا۔ وہ ''ہال او... '' کہہ کر پیچھے کی سمت گرا۔ میں نے اس کا کندھا مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ورنہ اس کا سر چٹان سے ٹکراتا اور وہ الٹ کر جوہڑ کے کنارے کیچڑ میں جا گرتا۔

''شکورے!'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''ہوش کر شکورے!''

شکورے نے اپنا بایاں بازو زور سے گھمایا۔ اُس کا ہاتھ تیزی سے میرے چہرے کے قریب سے گزرا۔

''ہال او — مار گھتیا نیں!'' (ہائے، مار ڈالا ہے!) اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیے۔

''شکورے!'' میں بھی چیخا۔ ''ہوش میں آ شکورے! حوصلہ کر، گولی مار سکائی لیب کو... گرنی تھی، گر گئی۔ شکورے!''

شکورے کا سر دائیں بائیں جھٹکے کھا رہا تھا۔ پھر اس نے دایاں بازو بلند کیا۔

''ہال او مرادو یا نا مرادا، ہینڈی میں... '' اس نے پیر مراد شاہ کو گالی دی۔ پھر اس کی سماعت ہی ختم ہو گئی۔ وہ میری کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ میں بار بار اس کے کندھے کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھنچ گئیں۔ اس کا دایاں کندھا چٹان پر تھا۔ اس کا سر بھی دائیں جانب ڈھلک گیا۔ میں نے اس کا بایاں کندھا چھوڑ کر اسے چٹان پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا، دل کی دھڑکن بہت تیز تھی۔

''شکورے!'' میں پھر چیخا۔ ''شکورے!''

مجھ پر ایک تاریک اندیشہ خوف بن کر اترا۔ میں شکورے کو وہیں چھوڑ کر ڈھلوان کے پھسل جانے والے پتھروں کا خیال کیے بغیر دوڑ کر نیچے اترا۔ سیدھا جوہڑ کی سمت گیا۔ میں نے اپنے کرتے کا دامن جوہڑ کے پانی میں بھگویا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے فل بوٹ کنارے کی کیچڑ میں دھنس گئے۔ دوبارہ چٹان پر چڑھتے ہوئے میں پھسلا، سنبھلا اور چٹان پر چڑھ کر میں نے کرتے کے دامن میں جذب پانی کو ہتھیلی پر نچوڑا اور زور سے شکورے کے منہ پر چھینٹا دیا۔ شکورے نے جھرجھری سی لی۔ میں نے اپنے کرتے کے دامن سے اس کا چہرہ بھگو دیا۔

''شکورے!'' میں نے زور سے آواز دی۔ شاید میری آواز پہاڑی کی دوسری جانب سرونٹ کوارٹروں تک گئی ہو گی۔

''ہوں... اوں...'' شکورے نے نحیف سی آواز میں کہا۔

''شکورے، اٹھ!'' میں نے کہا۔

''کیا ہے؟'' شکورے کی آواز بہت دھیمی تھی۔ میں نے سہارا دے کر اسے چٹان پر بٹھا دیا۔ ٹرانزسٹر ریڈیو گلے میں لٹکایا۔ ہاکی کو توازن کے ساتھ چادر میں باندھا۔

''اٹھ شکورے،'' میں نے کہا، ''چل میرے ساتھ۔''

''کہاں؟'' اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''گھر... گھر چل شکورے!''

میں نے ہاکی بندھی چادر کو بائیں ہاتھ میں گٹھڑی کی طرح اٹھایا، بائیں بازو سے اس کی کمر کے گرد حلقہ بنایا اور اسے چٹان پر کھڑا کر دیا۔

''شکورے... چل، گھر چل،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

پہلی بار اس نے بند آنکھیں تھوڑی سی کھولیں، دو لکیروں کی طرح۔ شکورے کا بایاں بازو بے جان سا تھا۔ کندھے آگے کی سمت جھکے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے دائیں بازو کو اپنی گردن کے گرد حمائل کیا اور ٹارچ والے ہاتھ سے اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیا۔ صبح کی دھیمی دھیمی روشنی پھیل رہی تھی، پھر بھی میں نے ٹارچ کو مستقل طور پر جلا دیا۔ ہوا کے جھونکے مدھم ہو رہے تھے۔

''چل شکورے... شاباش... ہمت کر!''

Scanned with CamScanner

میرے اس جملے پر شکورے نے قدم اٹھایا۔ وہ نڈھال سا تھا۔ تقریباً اٹھا کر میں نے اسے ڈھلوان سے نیچے اتارا، اور راستے پر آتے ہی شکورا کچھ سنبھل گیا۔ ہم آہستہ آہستہ پکی سڑک کی طرف چلنے لگے۔

تارکول کی پکی سڑک سے پہلے دائیں جانب جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے فوراً انگلیاں گھما کر ٹارچ کی روشنی جھاڑی پر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوبرا تھا بھی تو روشنی اور ہمارے قدموں کی آہٹ سے ڈر کر جھاڑی میں چھپ گیا تھا۔ نہایت احتیاط سے میں شکورے کو تارکول کی سڑک پر لایا۔ سڑک پر آتے ہی شکورے نے اپنا بازو میری گردن سے ہٹا لیا۔ میں نے بھی اس کی کمر کو چھوڑ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلنے لگا۔

''کتھایوں گدی وینا ایں؟'' (کہاں لیے جا رہے ہو؟) شکورے نے کہا۔

''گھر لے جا رہا ہوں،'' میں نے کہا۔

''گھر...'' اس نے آہستہ سے کہا، جیسے خود سے ہی کہہ رہا ہو۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شکورے کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، کیوں ہے... ورکرز کلب کے پاس دائیں جانب لوہے کے جنگلے کے پاس دو کتے بیٹھے تھے۔ وہ بھونکتے ہوئے ہماری سمت دوڑے۔ میں تیزی سے نیچے جھکا جیسے پتھر اٹھا رہا ہوں۔ کتے تیزی سے واپس مڑے، بھاگے۔ پیدائش کے بعد ہی سے انھوں نے دیہاتیوں کے ہاتھوں اتنے پتھر کھائے ہوئے تھے کہ پتھر کا خوف ان کی ثانوی جبلت بن چکا تھا۔ کچھ دور جا کر وہ پھر مڑے اور کھڑے ہو کر بھونکنا شروع کر دیا۔ ایک کتا غصے میں پچھلے پیروں سے مٹی اڑانے لگا۔ شکورا تیزی سے مڑا۔ کتوں کی طرف منھ کر کے وہ تھوڑا سا جھکا، پھر اس نے دونوں بازو آگے بڑھائے۔

''بھاؤ... واؤ... بھاؤں بھاؤں... خواو... اُو... بھاؤں'' شکورے نے کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ سیدھا ہو کر پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

کتے ہمارے پیچھے سڑک پر آ گئے۔ وہ بھونک رہے تھے۔ شکورے نے سر گھما کر انھیں دیکھا۔ ''خُواُواُوں... بھاؤں...'' شکورا پھر کتے کی طرح بھونکا۔ میں نے اسے پھر کھینچا اور وہ سیدھا سڑک پر چلنے لگا۔

Scanned with CamScanner

آسمان مدھم سا روشن ہو چکا تھا۔ مشرقی افق پر بادلوں کے دو تین سفید ٹکڑے نظر آئے۔ ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے مجھے چہرے پر خنکی کا تاثر دیتے بہت اچھے لگے۔ افق پر بکھرے بادلوں کے درمیان گہری دھندسی تھی اور اس کے نیچے آسمان پر نیلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ ہم اسپتال کے آہنی جنگلے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ شکورا رک گیا۔ اس کی نگاہیں افق کی سمت تھیں۔

''آسمان کے پیٹ میں بچہ پھر مر گیا ہے،'' شکورے کی سرگوشی نما آواز میں خوف تھا۔

پرائمری سکول کی دیوار کے پاس ایک مریل سی کتیا لیٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اٹھی اور دم ہلانے لگی۔ بازار کا احاطہ خاموش تھا۔ راولپنڈی جانے والی ایک بس کھڑی تھی۔ شیر علی کے ہوٹل کے سامنے چارپائیوں پر سوئے مسافروں کے قریب سے گزر کر ہم عقبی گلی میں پہنچے۔ شکورے کے گھر کی گارا بھوسا لپی دیواریں بنیادوں پر نیم روشن تھیں۔ گھر کے پیچھے کھیتوں میں اُگے چھوٹے چھوٹے پیڑوں سے پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ دور کسی کوارٹر سے مرغ کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے کی کنڈی میں تالا لٹکا ہوا تھا۔

''چابی دے شکورے،'' میں نے کہا، اور شکورے نے بغلی جیب سے چابی نکال دی۔

تالا کھول کر میں نے دروازے کا پٹ کھولا۔ صحن میں چارپائی پر چادر اور تکیہ موجود تھا۔ میں نے گٹھڑی نما چادر ہا کی سمیت گارے کی لپی دیوار کے پاس رکھ دی۔ مڑ کر دیکھا تو شکورا باہر ہی کھڑا تھا۔ باہر آ کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

'تو بہت تھک گیا ہے شکورے،'' میں نے کہا۔ ''سو جا۔''

میرا جملہ سن کر شکورا بندر کی طرح اچھلا، دوڑ کر گھر میں گھسا اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ تالا اور چابی میرے ہاتھ میں تھی، دروازے کی کنڈی اِدھر اُدھر جھول رہی تھی۔ میں نے احتیاط سے، اندر بچھی چارپائی کا اندازہ لگا کر، اس سے کچھ آگے دیوار پر سے چابی لگا تالا اندر پھینک دیا۔

10

جب میں بھائی کے بنگلے پر پہنچا، صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ میں نے بیرونی گیٹ کھول کر لان میں لگے نلکے پر فل بوٹ دھوئے۔ بوٹوں کے اوپر جو ہڑ کی کیچڑ خشک ہو چکی تھی، تاہم بوٹوں کے

Scanned with CamScanner

اطراف میں ابھی تک نم آلود تھی۔ بوٹ دھو کر میں نے برآمدے کا دروازہ کھولا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھڑکی کے پردوں پر بیرونی روشنی کی دھندلاہٹ تھی۔ کمرے میں روشنی کم تھی۔ میں نے بلب کا سوئچ آن کیا۔ غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھو کر واپس کمرے میں آیا۔ مجھ پر نسیانی کیفیت طاری تھی۔ بستر پر لیٹنے لگا تو پاؤں بھاری لگے۔ میں بوٹ اتارنے بھول گیا تھا۔ کمرے میں گرمی تھی۔ میں نے پنکھا آن کر کے ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں کا بوٹ اتارنے کی کوشش کی، نہ اترا۔ میں تسمے کھولنا بھول گیا تھا۔ بوٹ اتار کر لیٹنے لگا تو رک گیا۔ میں کپڑے بدلنا بھول گیا تھا۔ پھر غسل خانے میں گیا، کپڑے بدلے۔ واپس آ کر بستر پر لیٹا، پھر اٹھا۔ میں کمرے کا بلب آف کرنا بھول گیا تھا۔ کمرے کا بلب آف کرنے کے بعد میں بے سدھ ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کولہے کی ہڈی میں درد تھا، عضلات میں کھچاؤ تھا، لیکن بیرونی جلد اب حساس تھی۔ سر پر سیلنگ فین گھوں گھوں کرتا گھوم رہا تھا۔ جسم پر تھکن اور ذہن پر غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

''میں شکورے کو اتنی بات تو سمجھا ہی سکتا تھا،'' میں نے سر پر گھومتے پنکھے کو دیکھتے ہوئے سوچا، ''چھوٹی سی بات... کہ سکائی لیب پر قانونی طور پر امریکہ کا حق ہے، لیکن میں خاموش رہا۔ یہ تو کہہ سکتا تھا کہ اگر سکائی لیب اسے مل بھی جائے تو بھی اس سے ملبہ چھین لیا جائے گا، لیکن میں خاموش رہا۔ دنیا میں قانون کی حکمرانی ہے کہاں پر؟... موجودہ دنیا میں اہل ہوس کے ہاتھ اس قدر مضبوط ہو چکے ہیں کہ وہ قانون سے بالا ہو چکے ہیں۔ ماضی کے بادشاہوں کی طرح وہ قانون بھی خود بناتے ہیں اور خود ہی قانون سے بالاتر بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کچھ دیر کے لیے... پاگل پن ہی میں سہی، شکورے نے سکائی لیب کو اپنی ملکیت تصور کر لیا تھا تو کیا ہوا؟ کیا ایک غریب اور محروم شخص سے اس کے خواب بھی چھین لیے جائیں؟... ہاں، یہ بات خوش آئند ہے کہ وہ اب کشف کے فریب میں کبھی نہیں آئے گا۔''

مجھے شکورے کی وہ گالی یاد آئی جو اس نے پیر مراد شاہ کو دی تھی۔ اس تمام المیے میں یہی ایک خوش آئند بات تھی کہ اس کے لاشعور پر پیر کی حکمرانی کا سحر ٹوٹ چکا تھا، اس کے وجود پر پیر کی حکومت کا تختہ الٹ چکا تھا۔ ناشائستگی ہی سے سہی، اس نے یہ اظہار تو کر ہی دیا تھا کہ اب اس کا لاشعور بھی اس کا اپنا ہے۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پردوں کے پیچھے روشنی بڑھ چکی تھی۔

Scanned with CamScanner

''خود کو قانون سے بالا سمجھنے والے اہلِ ہوس ہی صداقت اور راستی کا راستہ نہیں روک رہے ہیں،'' میری سوچ کا رخ بدلا۔ ''ان کا سایہ دنیا بھر کے انسانی معاشروں پر ہے اور انھی کے سیاہ اعمال دیکھ کر اور انھیں معاشرے میں تمام تر برائیوں کے ساتھ باعزت دیکھ کر اربوں چھوٹے چھوٹے، خوف اور خود غرضی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے لوگ بھی انسانیت کی راہ روک رہے ہیں۔ شکورے جیسے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو محروم کس نے کیا؟ وہ کون سے اصول ہیں جو محرومی کی چنگاریاں اڑا کر انسانوں کے ہاتھ اور چہرے جھلساتے رہتے ہیں، ان کے جسموں کے ساتھ ان کی روحوں کو بھی اس کرۂ ارض پر جلاتے رہتے ہیں؟... وہ کون سے قوانین ہیں جنھوں نے اس دنیا میں طبقاتی رویوں کو مستحکم کیا ہوا ہے؟ انھیں کس نے فطرت کے شدید پہلو کے اکتساب سے تشکیل دیا اور فطرت کے لطیف پہلو کو فراموش کر دیا؟ یہ اصول، یہ قوانین، فطرت کے مکمل اور اصول و قوانین تو نہیں ہیں۔ خود کو مخدوم بنا کر دوسروں کو خادم بنانا فطرت کا لطیف پہلو تو نہیں ہے۔ خود کو داتا بنا کر دوسروں کو محتاج بنانا اصولِ فطرتِ لطیف تو نہیں ہے۔ خود کو آقا اور دوسروں کو غلام بنانا لطیف فطرت کا قانون تو ہو نہیں سکتا۔ کرۂ ارض پر قائم قوانین کی تشکیل فطرت کے مطابق تو نہیں ہے، نہ ہی یہ اصول فطرت کا مکمل اکتساب ہیں۔ تو پھر مذاہب کس بنیاد پر داعی ہیں کہ ان کے اصول اور قوانین عینِ فطرت ہیں؟ کیا وہ خود فطرتِ شدید کے مذاہب ہیں؟ جو طاقتور ہیں وہ خوف کو اپنا ہتھیار بنا کر کمزوروں کو نہ صرف ہراساں کرتے ہیں بلکہ ان کا بدترین استحصال بھی کرتے ہیں۔ خود غرضی نے انسانی معاشروں میں ضمیر کی شعاعوں کے سامنے مفادات کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور ابھی تک انسانوں کو حقیقی اور سچا شعور حاصل نہیں ہو سکا۔ زمین پر انسانیت ہوس آلود ہو چکی ہے۔ اگر کوئی ان تاریکیوں کو مٹانے کی انفرادی کوشش کرے تو اسے پاگل اور دیوانہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگ مل کر اجتماعی کوشش کریں تو ان کا وجود ہی مٹا دیا جاتا ہے۔ اس زمین پر، اس دنیا میں، انسانیت کو قوتِ شر سے کون نجات دلائے گا؟ کون قوتِ شر کے نمائندوں کی بہیمانہ سرگرمیوں سے انسانوں کو بچائے گا؟''

مایوسی اور اداسی میرے خواب آلود ذہن پر بوجھ بن کر اتری... نہ جانے میں کب سو گیا۔

Scanned with CamScanner

''یہ ابھی تک سو رہا ہے؟'' بھائی کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑے تھے۔ میری نظریں دیوار پر لگے کلاک کی سمت گئیں۔ سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ میں نے تکیے سے سر اٹھایا۔

''کب آئے؟'' بھائی نے پوچھا۔

''صبح پانچ بجے،'' میں نے جواب دیا۔ ''شکورے کے ساتھ ساری رات باتیں ہوتی رہیں۔''

''وہ پاگل ہے،'' بھائی نے کہا۔ ''اس کے ساتھ تو پندرہ منٹ گزارنا مشکل ہوں گے، تم رات کیسے گزار آئے؟''

''نہیں بھائی،'' میں نے کہا، ''اس کے ساتھ تو وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔''

''ٹھیک ہے، تمھارا بچپن کا دوست ہے، لیکن اسے دورے پڑتے ہیں۔ ایسا آدمی خطرناک ہوتا ہے،'' بھائی نے کہا۔

''شکورا ایسا نہیں ہے بھائی،'' میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ساری جارحیت تصوراتی ہے۔''

''تبھی ہتھوڑا مار مار کر گالیاں دیتا ہے،'' بھائی نے مسکرا کہا۔

''آج تک اس نے...'' میں نے بستر سے نیچے ٹانگیں اتارتے ہوئے کہا، ''کبھی جسمانی جارحیت نہیں کی۔ ہاں، اگر کوئی جسمانی جارحیت کرے تو اپنا دفاع ضرور کرتا ہے۔''

بھائی چلے گئے۔ میں غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

''اسے کچھ نہیں ہوگا،'' میں نے خود کو تسلی دی۔ ''چٹان پر اس کے دل کی دھڑکن سے تو میں ڈر ہی گیا تھا۔''

میرے بدن میں اب بھی تھکن تھی۔ کولھے کی ہڈی کے نیچے دھیما دھیما سا درد بھی تھا۔ شکورے کے لیے میری بے چینی ناگزیر تھی۔

''کل یا پرسوں مجھے سٹاف ٹریننگ سکول جانا ہے،'' میں نے سوچا۔ ''جو کچھ کل رات ہوا ہے فطرت نے میری تربیت، سچی تربیت تو کر دی ہے۔ سٹوڈیو میں شخصیات اور فنکاروں کو بلانا،

ریکارڈنگ کرنا، ٹیپ ایڈیٹنگ کرنا، او بی (آؤٹ ڈور براڈ کاسٹ، بیرونی نشریات) یہ تو ثانوی تربیت کے حصے ہیں۔ سچ اور اصلی تربیت تو مجھ مل ہی چکی ہے۔'' میں نے الماری سے کپڑے نکالے۔

''جنرل ضیاء الحق کا دور ہے،'' میں نے آنے والے دنوں، مہینوں، برسوں کا تصور کرتے ہوئے سوچا۔ ''نشریات پر غیر معمولی اور نا قابلِ برداشت پابندیاں تو ہوں گی، پھر بھی میں اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ قواعد وضوابط میں رہتے ہوئے فرسودہ عقائد اور جاہلیت کے خلاف جدوجہد کرتا رہوں۔ میں ہار نہیں مانوں گا، فرد کی شکست کو تسلیم نہیں کروں گا۔ میں معاشرے میں موجود جبر وتشدد کے ماحول میں اپنے کردار سے یہ ثابت کردوں گا کہ ایک تنہا انسان بھی فطرت کے لطیف اصولوں کے ساتھ جی سکتا ہے۔ میں قوتِ شر کا کوئی تقاضا پورا نہیں کروں گا۔ میں اپنے وجود سے یہ ثابت کردوں گا کہ ہوسناکیوں سے آلودہ اس تاریک دنیا میں ایک فرد بھی خوف اور خودغرضی سے بلند ہو کر عزتِ نفس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔''

شکورے کے لیے میری بے چینی تجسس میں بدل چکی تھی۔ میں شام ہونے تک بنگلے پر ہی رہا، پھر بازار کے احاطے میں پہنچا۔ پرائمری سکول کی دیوار کے پاس ہی مجھے شیر علی کا ہوٹل ایک اندیشے کی طرح نظر آیا۔ ہوٹل میں قہقہے گونج رہے تھے۔ احاطے میں پنڈی گھیب جانے والی بس کھڑی تھی۔ ہوٹل کے قریب پہنچنے پر مجھے بس کا ڈرائیور، کنڈکٹر اور چند مسافر اندر بیٹھے زور زور سے باتیں کرتے اور ہنستے نظر آئے۔

''اج مرادے نی خیر نئیں!'' (آج مراد کی خیر نہیں!) بس کے کنڈکٹر نے کہا۔ ''میں پنڈی گھیب ونج کے اس ناں بہوں بہوں ریکارڈ لاساں...'' (میں پنڈی گھیب جا کر اس کا بہت بہت ریکارڈ لگاؤں گا۔)

میرا اندیشہ سوال بن چکا تھا۔ شیر علی نے پوچھے بغیر ہی اس سوال کا جواب دے دیا۔

''صاب، آپ نے بھی کس پاگل سے یاری لگائی ہے!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پرسوں پنڈی گھیب جانے والی دوسری بس کے ڈرائیور مراد علی نے شکورے کے سامنے بازو اٹھا کر ہتھوڑا مارنے کے انداز میں نیچے لا کر شکورے کو گالی دی تھی۔ شکورے کے ساتھ اس کی گالی گلوچ ہوگئی تھی۔ وہ حرامی بہت شرارتی ہے۔ آج دو دن بعد...'' شیر علی زور سے ہنسا، ''دو دن بعد شکورے نے

وہاں... ''شیر علی نے پرائمری سکول کی دیوار کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کیا،'' وہاں کھڑے ہو کر شکورے نے مراد علی کو بڑی گالیاں دیں۔ مراد علی پنڈی گھیب میں ہے اور شکورے نے دو دن بعد... ''شیر علی اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔'' بڑی گالیاں دیں... بڑا تماشا ہوا... یہ... '' شیر علی نے ہوٹل کے اندر بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔'' یہ اسی بات پر ہنس رہے ہیں... دو دن بعد... گالیاں... ''شیر علی ہنسے جا رہا تھا۔

''شکورا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میرے سنجیدہ سوال پر شیر علی نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''وہ جی... سکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ... چلتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے اسپتال تک گیا تھا۔ پھر دائیں ہاتھ مڑ کر پاور ہاؤس کی طرف گیا۔ ابھی ابھی سلیمے (سلیم) الیکٹریشن نے پاور ہاؤس سے آ کر بتایا تھا کہ وہ کھوڑ گاؤں کی طرف چلا گیا ہے۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ شکورا ڈکو پھر کی کے پاس گیا ہو گا۔ واپس بھائی کے بنگلے کی طرف آتے ہوئے میری بے چینی اور تجسس، مایوسی اور اداسی میں تبدیل ہو رہے تھے۔

''یہ میں نے کیا کیا... حماقت ہو گئی مجھ سے... برباد کر دیا میں نے شکورے کو... اس نے دکان سے باہر نکل کر کبھی پاگل پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا... آج وہ بھی ہو گیا!''

ندامت اور اندیشہ، مایوسی اور اداسی، ساری کیفیات میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ لیکن ایک خیال باعثِ سکون بھی تھا کہ نام کی اتفاقیہ یکسانیت نے شکورے کو ایک بڑی مصیبت سے، بڑے حادثے سے بچا لیا تھا۔ اگر مریدوں کو پتا چل جاتا کہ شکورا بس کے ڈرائیور مراد علی کو نہیں، پیر مراد شاہ کو گالیاں دے رہا تھا تو شاید وہ اسے جان سے مار دیتے۔

12

اگلی صبح میں جلدی اٹھا۔ سات بجے بھائی کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھا۔

''تمھاری ٹریننگ کب شروع ہو رہی ہے؟'' بھائی نے پوچھا۔

''تین چار دنوں میں،'' میں نے جواب دیا۔ بھائی مجھے ملازمت کے گر سمجھانے لگے۔

Scanned with CamScanner

''اپنے سے بڑے افسروں کی ہر بات کو اہمیت دینا۔ اگر تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے چھپانے کی کوشش نہ کرنا، فوراً مان لینا اور معذرت کر لینا۔ اپنے ساتھی پروڈیوسروں سے بہت زیادہ میل جول نہ رکھنا اور نہ ہی ان سے قطعی طور پر الگ رہنا۔ اگر ماتحت عملے کے کسی ملازم سے کوئی غلطی ہو جائے تو سب کے سامنے اسے ہرگز نہ ڈانٹنا، کچھ نہ کہنا۔ اسے اکیلے اپنے کمرے میں بلا کر بیٹھک اس کی ایسی تیسی کر دینا۔ جہاں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں، وہاں گروہ بندیاں ہوا کرتی ہیں۔ کسی گروہ بندی میں شامل نہ ہونا۔'' پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک شکورے کا ذکر چھڑ گیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو،'' بھائی نے کہا، ''اسے لوگوں نے پاگل بنا رکھا ہے۔ وہ واقعی مفت کی تفریح ہے۔''

''یہاں کے لوگوں کے پاس تفریح کے ذرائع بھی تو نہیں ہیں،'' میں نے کہا۔ ''ورکرز کلب میں ہر ہفتے ایک فلم تو دکھائی جاتی ہے لیکن ورکرز کے علاوہ چوکیدار کسی کو اندر نہیں جانے دیتا۔ یہاں کے دیہات میں تفریح کا سامان صرف بھانڈ ہیں۔ اگر ان دیہات میں کوئی اوپیرا، کوئی تھیٹر ہوتا تو دیہاتی اُدھر متوجہ ہو جاتے۔ ان دیہاتوں میں فنکاروں کی کمی نہیں ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں بہترین ڈانسر ہیں، سنگر ہیں۔ انھیں روزگار بھی مل جاتا۔''

بھائی نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

''تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایسے ملک میں رہ رہے ہو جہاں دیہاتیوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا مل جانا ہی غنیمت ہے۔ اوپیرا، تھیٹر — خوابوں کی دنیا سے باہر نکلو۔ یہاں اگلے پانچ سو برسوں میں بھی ایسا کچھ نہ ہوگا۔ یہ صرف آئیڈیلزم ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب میں بازار کے احاطے میں پہنچا۔ میری نظریں سیدھی شیر علی کے ہوٹل کی سمت گئیں۔ وہ ایک بڑے سے دیگچے میں بڑا سا چمچ پھیر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دور ہی سے مسکرایا۔ میں اس کے پاس گیا۔

''کمال ہو گیا صاب!'' شیر علی نے کہا، ''ہمارے لیے تو آج کا سورج حیرت لے کر طلوع ہوا ہے۔ شکورا بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج صبح وہ خوش خوش کھوڑ گاؤں سے آیا۔ نلکے پر غسل کیا۔ پھر مجھ سے ناشتے پر انڈا پراٹھا مانگا۔ اس بخیل نے تو سوکھی روٹی اور چائے کے علاوہ کبھی کوئی ناشتہ کیا ہی

Scanned with CamScanner

نہیں!'' شیر علی ہنسا۔ ''آج تو کمال ہو گیا! انڈا پراٹھا اور چائے کے ساتھ ناشتہ کر کے وہ خوش خوش دکان پر گیا ہے اور اب دکان میں بیٹھا دُتے (عبداللہ) کی گائے کے لیے سنگلی بنا رہا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ شکورے کے پاس جاؤں، لیکن اس خیال سے کہ کہیں مجھے دیکھ کر اس کے ذہن پر صدمے کا ہتھوڑا پھر سے ضرب نہ لگائے، میں واپس بنگلے کی طرف چل دیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے!'' میں نے سوچا۔ ''جو کچھ شیر علی نے بتایا ہے، اگر وہ سچ بھی ہے تو بھی میں اس بات پر کیسے یقین کر لوں کہ شکورا اپنے دکھوں سے آزاد ہو گیا ہے؟... اتنا آسان تو نہ ہو گا شکورے کے لیے اپنی خواہشات اور محرومی سے نجات پا جانا... اگر اسے تلخ حقائق کا شعور حاصل ہو گیا ہے... اگر اس کے خوابیدہ ذہن کو شدید صدمے نے بیدار کر بھی دیا ہے تو بھی یہ آسان نہ ہو گا۔ اگر وہ اپنی محرومیوں کے ساتھ جینا چاہتا ہے تو اسے کون جینے دے گا؟ وہ بازار کے لوگوں اور دوسرے افراد کے لیے مفت کا تماشا ہے، تفریح ہے۔ وہ اپنی اس تفریح سے کسی صورت بھی محروم ہونا نہیں چاہیں گے۔ کوئی نہ کوئی مراد علی جیسا شخص اسے چھیڑ دے گا اور وہ پھر بھڑک اٹھے گا۔''

13

سہ پہر کے وقت میں پھر بازار کی طرف گیا۔ تمام راستہ گرمی کی تپش کا احساس دلاتا رہا۔ جولائی کی سہ پہر میں حدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔ اگرچہ جون کی دوپہروں کی طرح تارکول سڑکوں پر جگہ جگہ پگھلی ہوئی نہ تھی۔ پھر بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سڑکوں کے نیچے الاؤ سے جل رہے ہیں۔ پرائمری سکول تک پہنچتے پہنچتے میں پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ میں پرائمری سکول کی دیوار کے پاس ہی تھا کہ مجھے دھیما سا شور سنائی دیا۔ میں تیز قدموں سے احاطے میں پہنچا۔ شیر علی کے ہوٹل کے عقب گلی میں شور مچا ہوا تھا۔

میں دوڑتے ہوئے عقبی گلی میں پہنچا۔ شکورے کی دکان کے آگے بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ بازار کے دکاندار، ان کے گاہک، بسوں کے ڈرائیور، کنڈیکٹر، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا عملہ، مسافر، سبھی وہاں موجود تھے۔ وہ سب زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے، ہنس رہے تھے۔

شکورے پر معمول کا دورہ پڑ چکا تھا۔

بے ہنگم شور میں، لوگوں کی بھیڑ میں راستہ بنانا مشکل تھا۔ میں دکان کی مخالف سمت میں، شیر علی کے ہوٹل کی عقبی دیوار سے اپنی پشت گھسیٹتا، ہجوم میں راستہ بناتا، شکورے کی دکان کے سامنے پہنچا۔ میرے سامنے ہجوم سا تھا۔

دکان کی دائیں سمت نثار خان کھڑا شکورے کو پشتو میں گالیاں دے رہا تھا۔

بھیڑ ایک بے سروپا عفریت کی طرح شور مچا رہی تھی، زور زور سے بازو ہلا رہی تھی۔ شکورا پوری قوت سے نہائی پر ہتھوڑا مارتے ہوئے گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا، آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں، پیشانی پر گہری شکنوں کے اوپر پسینے کے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔ اس کا کرتا پسینے سے بھیگ کر اس کی چھاتی اور پیٹ سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے بدن کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ اس کے پورے بدن میں ارتعاش سا تھا۔ لوگ مسلسل اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتمائے ہوئے تھے، آنکھوں میں وحشت آمیز چمک تھی۔ شکورے کی ہر گالی ہتھوڑے کی ضرب پر ختم ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر قوت سے خالی نہائی پر ہتھوڑا مار رہا تھا کہ دھماکوں کی سی آواز بلند ہو رہی تھی۔

بھیڑ میں شور مچاتے ہوئے دیہاتی انگلیوں سے پیشانیوں کا پسینہ پونچھتے، قطرے نیچے مٹی میں گراتے، بازو گھما کر شکورے کو بھڑکا رہے تھے۔

''ہلا بھائی ہلا — اج نہ چھوڑ ئیں — بھن چھوڑ، منج بھن چھوڑ!'' (ہاں بھائی ہاں، آج اسے نہ چھوڑنا، توڑ دے — گردن توڑ دے!) ایک دکاندار چیخا۔ ہر سمت قہقہے بلند ہوئے۔ ایک اور دیہاتی اچھل کر آگے بڑھا۔

''شابا بھائی شابا — سرے تے مار، سرے تے — چتھ چھوڑ!'' (شاباش بھائی شاباش، سر پہ مار سر پہ! کچل دے!)

بے ہنگم شور کے مرغولے سے اٹھ رہے تھے۔ شور کسی گردباد کی طرح گلی میں چکر کاٹ رہا تھا۔ شور میں سنسناہٹ سی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شور میں ان دیکھی چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں، غیر مرئی شعلے سے لپک رہے ہیں۔ شکورے کی گالیوں میں تین گالیوں کا اضافہ ہو چکا تھا، اور یہی اضافہ ہجوم میں قہقہوں اور گونجتے شور کا باعث بنا ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

طیش میں شکورے کی بڑی بڑی آنکھیں، سرخ ڈوروں والی آنکھیں ابل کر باہر نکلی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہال اوئے مراد یا نامرادا، تینڈی میں...'' (ہائے او مراد نامراد، تیری میں...)

''ہال نی چیٹے میے، تینڈی میں...'' (ہائے ری گوری میم، تیری میں...)

''ہال او امریکی چک چوندرو، تساں نی میں...'' (ہائے او امریکی چھچھوندرو، تمھاری میں...)

❋❋

Scanned with CamScanner

خالد طور

ہاں گھِن[1]

جنوری کے ابتدائی ایام تھے۔ بستر پر لحاف میں دبکے ہوئے، اگر سویرے سویرے آنکھ کھل بھی جاتی تو بھی میں نیند کا بہانہ کیے چپ چاپ لیٹا رہتا تھا۔ کبھی والدہ، کبھی والد صاحب کی آواز آتی کہ ''چلو اٹھو... سکول جانا ہے... اٹھو... جلدی کرو...'' میں مکر کیے پڑا رہتا۔ لحاف کی گرمی، بستر کی نرم و گرم سطح، تکیے پر دبا ہوا سر اور آہستہ آہستہ آتی جاتی سانس، سب کچھ ایک ایسے سکون میں بدل جاتا تھا کہ آنکھیں کھولنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ پورے جسم پر ایک ایسی کیفیت چھا جاتی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ اسی بے نام کیفیت سے لپٹ کر میں نیم خوابیدہ حالت میں گزشتہ دن کے واقعات کو یاد کیا کرتا تھا۔ سکول کی باتیں، کھیل کی باتیں، ریڈیو پر سنے ہوئے گیت، سب مجھے سرد جمی ہوئی صبح میں، گرم بستر پر چپ چاپ لیٹے رہنے پر اکسایا کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں جنگِ عظیم دوم میں تیار کیا گیا ایک ریڈیو تھا۔ کبھی کبھی منجھلے بھائی اس پر ریڈیو سیلون کے بیوپار وبھاگ کے پروگرام لگا دیا کرتے تھے اور خوبصورت فلموں کی موسیقی سے جڑے کتنے ہی خوبصورت خیالات اور دلکش تصورات مجھے کسی خواب آلود جزیرے میں لے جایا کرتے تھے۔

''اب اٹھ بھی جاؤ'' امی کی آواز آتی تو میں چونک اٹھتا۔ ''سکول نہیں جانا کیا؟'' میرے خواب ٹوٹ جاتے، نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا ہی پڑتا تھا۔ پھر وہی سکول، کتابیں، تختی، ماسٹر محمد جان کی

---

[1] شمالی پنجاب کی زبانوں میں دھنی اور گھیبا میں گھِن کا مطلب ''لو'' ہے۔ کوئی چیز دیتے ہوئے ''ہاں گھِن'' کہا جاتا ہے اس کا مفہوم ''یہ لے'' ہے۔ اگر کہا جائے کہ ''گھِن ونجو'' تو اس کا مطلب ''لے جاؤ'' ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سخت غصیلی آواز اور گالیاں... کھوڑ میں لڑکوں کے لیے ایک ہی پرائمری سکول تھا۔ یہ سکول کھوڑ میں، کمپنی کالونی میں، کھوڑ گاؤں کی سمت جانے والی کچی سڑک پر واقع تھا۔ سکول میں کل چھ کمرے تھے، کسی بیرک کی طرح سیدھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے کے سامنے کھلا میدان نما صحن۔

اٹک آئل کمپنی کے انگریز افسروں کے بچے راولپنڈی میں مورگاہ ریفائنری کے انگلش سکول میں پڑھتے تھے، اور وہ کالونی کے بنگلوں میں اکیلے رہتے تھے۔ ہر ہفتے کو وہ راولپنڈی چلے جاتے تھے، بچوں سے ملنے۔ صرف ایک دو بوڑھے انگریز ہی کالونی میں چھٹی کا دن گذارتے تھے۔ وہ اکثر اتوار کو کھوڑ کے چھوٹے سے گرجا گھر میں بنچوں پر بیٹھے نظر آیا کرتے تھے۔

کمپنی کے مقامی افسروں اور کارکنوں کی لڑکیوں کو صبح صبح کمپنی کی ویگن پنڈی گھیب لے جایا کرتی تھی، جہاں وہ گورنمنٹ مڈل سکول فار گرلز میں پڑھتی تھیں۔ ویگن سہ پہر کو انھیں واپس کالونی میں لے آیا کرتی تھی۔ کھوڑ گاؤں کی لڑکیاں ہر قسم کی سہولت سے محروم تھیں، ان کے لیے پرائمری سکول بھی نہیں تھا، لیکن کھوڑ گاؤں کے لڑکے صبح صبح بستے اور تختیاں اٹھائے کمپنی کی کالونی میں قائم ڈی بی (ڈسٹرکٹ بورڈ) سکول میں آجایا کرتے تھے۔

سکول میں ایک ہی ماسٹر تھے، ماسٹر محمد جان۔ وہ پہلی کلاس سے پانچویں تک سب لڑکوں کو بھی مضامین پڑھاتے تھے، کبھی اِس کلاس میں، کبھی اُس کلاس میں۔ وہ دن بھر سکول میں پھرتے رہتے تھے۔ سردیوں میں سب کلاسیں سکول کے گراؤنڈ نما صحن میں بچھے ٹاٹوں (بوریوں) پر ہوا کرتی تھیں۔ دن بھر صحن میں شور سا مچا رہتا تھا۔ صحن میں کلاسوں کے لیے جگہیں مخصوص تھیں۔ ماسٹر محمد جان بہت ہی سخت گیر تھے۔ ان کی شکل وصورت بھی انتہائی کرخت تھی۔ چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، غصیلی آنکھیں، مہندی رنگی مونچھیں اور چھوٹی سی ڈاڑھی، لمبا قد، دبلا جسم؛ شلوار قمیض پر کھڑے شملے کی پگڑی باندھتے تھے۔ وہ کھوڑ کے قریب ہی ایک گاؤں سپیال کے رہنے والے تھے اور گھوڑی پر سکول آیا کرتے تھے۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہی گھوڑی پر سوار ہو جاتے تھے۔ انھیں دیکھ کر سکول کا ایک لمبا سا لڑکا غلام حسین گھنٹی بجا دیا کرتا تھا۔ ماسٹر محمد جان کے ہاتھ میں ہمیشہ لمبی سی بید کی چھڑی رہتی تھی، جو ہتھیلی پر پڑتی تو یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ کو کسی نے گرم سلاخ سے داغ دیا ہو۔ ہتھیلی پر سرخ سی لکیر نمودار ہو جاتی تھی جو دن بھر درد اور جلن کا احساس دلاتی رہتی تھی۔

Scanned with CamScanner

ایک بار دینیات کے پیریڈ میں میں بھی داغا جا چکا تھا۔

ہماری پانچویں کلاس میں تین چار لڑکے اپنے اپنے انداز کی وجہ سے بہت نمایاں تھے۔

ایک ارشاد تھا، چھوٹے قد اور پہلوانوں جیسے بدن والا۔ جہلم کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا ارشاد بہت لڑاکا تھا، ہر وقت اپنی دھونس جمانے والا، ہر لمحے جھگڑا کرنے کے لیے تیار۔ ارشاد کے برعکس انتھونی نہایت ہی صلح پسند اور خاموش رہنے والا لڑکا تھا۔ کالے رنگ کا، لمبی ناک والا دبلا پتلا انتھونی کمپنی کے کسی انگریز افسر کے خانسامے کا بیٹا تھا۔ وہ تقسیم ہند سے پہلے کھوڑ ہی میں پیدا ہوا تھا۔ مقامی زبان بہت روانی سے بولتا تھا۔ اس کا اینگلو انڈین باپ شاید جنوبی ہند کا رہنے والا تھا، جو شاید اپنی مادری زبان بھول چکا ہوگا۔ کلاس میں ایک محمد سرور تھا، کھوڑ کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا۔ اس کا باپ کالونی کے اکلوتے ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ سرور بہت موٹا تازہ، لمبے قد کا تھا، لیکن شکل ہی سے بہت بے وقوف نظر آتا تھا۔ ماسٹر محمد جان نے مزاحیہ انداز میں ایک بار اسے 'نوری فرشتہ' کہہ کر پکارا تو یہی نام سکول کے ہر طالب علم کی زبان تک پہنچ گیا۔ پہلے پہل وہ اس نام سے بہت چڑتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ عادی ہوگیا۔ سارا اسکول اس کا اصلی نام بھول گیا۔ صبح حاضری لیتے ہوئے ماسٹر محمد جان، اسے 'نوری فرشتہ' کہہ کر حاضری لگاتے تھے اور وہ بھی 'نوری فرشتہ' نام سنتے ہی فوراً ''حاضر جناب'' کہا کرتا تھا۔ ایک اور نہ بھولنے والا لڑکا فیض لاہوریا تھا، چھوٹے قد کا، موٹا اور چوڑے جبڑے والا۔ اس کے سفید چہرے پر آنکھیں اتنی گول گول تھیں کہ انھیں دیکھ کر مجھے تصویروں میں دیکھا ہوا الو ضرور یاد آتا تھا۔ فیض لاہوریے کا باپ کمپنی میں کلرک تھا۔ فیض لاہوریا مقامی زبان بھی لاہوری لہجے میں بولتا تھا۔ وہ بہت ہی بگڑا ہوا، فلم زدہ لڑکا تھا۔ آدھی چھٹی یا چھٹی کے بعد وہ لڑکوں کی ٹولی بنا کر انھیں فلموں کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ کھوڑ گاؤں کے لڑکوں نے فلم تو کیا دیکھی ہوگی، انھوں نے فلمی گانے بھی بہت کم سنے ہوئے تھے۔ فیض لاہوریا انھیں فلمی لڑکیوں کی باتیں اس طرح بتایا کرتا تھا جیسے وہ ان ہی کے درمیان پلا بڑھا ہو۔ وہ فلمی ہیروز کی بہادری کے ساتھ ساتھ ہیروئنوں کی جنسی کشش کو چٹخارے لے کر بیان کرتا تھا۔ کبھی کبھی نہایت بے ہودہ باتیں کرتا تھا، بہت فحش، اور گاؤں کے سیدھے سادے لڑکوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ وہ ہر لڑکے سے اسے لاہور لے جانے کا وعدہ کیا کرتا تھا۔ ہر لڑکے کو یوں دعوت دیا کرتا تھا جیسے لاہور میں اس کے باپ کی بہت بڑی حویلی ہو۔ ایک دن کمپنی

کے الیکٹریشن کے بیٹے سے کہنے لگا:

''تو میرے ساتھ چھٹیوں میں لاہور چل،'' فیض لاہوریے نے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کیا۔ ''وہاں... میں تجھے سورن لتا کے پاس لے جاؤں گا... عیش کرنا۔''

ایک دن پلمبر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر بولا:

''تو میرے ساتھ لاہور چل، میں تجھے منور سلطانہ کے گھر لے جاؤں گا۔ کیا یاد کرے گا تو بھی...!''

مجھے تو وہ لاہور سے بھی آگے لے گیا۔ ایک دن میری طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگا:

''تجھے تو میں پہلے لاہور لے جاؤں گا،'' اس کی گول گول آنکھیں گھومیں۔ ''پھر ہم بمبے چلیں گے۔ اوئے یار... تو اتنا سوہنا ہے، تجھے دیکھ کر تو نرگس کی مت ماری جائے گی ... بھول جائے گی راج کپور کو۔''

سب لڑکوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے انھیں جلن ہو رہی ہو۔ اس دن سکول سے واپس آ کر میں دیر تک امی کی سنگھار میز کے سامنے کھڑا ہو کر آئینے میں خود کو دیکھتا رہا ... فیض لاہوریے نے کمپنی کی کالونی میں مختلف مقامات سے آئے ہوئے لڑکوں اور خصوصی طور پر کھوڑ گاؤں کے سیدھے سادے لڑکوں کے ذہنوں کو جنسی جذبات اور فحش خیالات سے بری طرح آلودہ کر دیا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔

گرمیوں کی چھٹیوں سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ایک دن فیض لاہوریا آدھی چھٹی کے وقت برآمدے میں بیٹھا، اپنی فلمی داستانوں میں مگن تھا۔ بہت سے لڑکے اس کے اردگرد چوکڑیاں لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے کھوڑ گاؤں کے ایک لڑکے کو لاہور چلنے کی دعوت دی۔

''تو ضرور چلنا میرے ساتھ،'' فیض لاہوریے نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں تجھے نور جہاں سے ملواؤں گا۔ پکا وعدہ... اوئے وہی نور جہاں، چن دیا ٹوٹیا، دلاں دیا کھوٹیا والی!'' وہ لڑکا گھٹنوں کے بل ٹاٹ پر کھڑا ہو گیا، شاید اس نے گانا سن رکھا تھا۔ فیض لاہوریے نے اپنی موٹی آواز میں گانا شروع کیا، فلمی دھن پر اس کی انگلیاں تختی پر تال دینے لگیں۔ ایک دو بول گا کر وہ کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ ماسٹر محمد جان دروازے کے پیچھے سے برآمدے میں آ گئے۔ انھوں نے سب کچھ سن لیا

Scanned with CamScanner

تھا۔ پھر جو کچھ فیض لاہوریے کے ساتھ ہوا... وہ تمام لوگ جنھوں نے دیہاتی سکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کیا ہوا ہوگا! اس کے بعد فیض لاہوریا جیسے مر گیا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ آدھی چھٹی کے وقت وہ سہما سہما سا چپ چاپ بیٹھا رہتا اور چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ماسٹر محمد جان کو گھوڑی پر سوار ہوتے دیکھ کر بستہ اور تختی اٹھا کر سکول سے بھاگ جایا کرتا تھا۔

اُس صبح سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں کپکپاتا ہوا سکول پہنچا، سویٹر، کوٹ، اونی ٹوپی، مفلر، دستانے، جرابیں... یوں لگتا تھا اون کی کوئی پوشاک پہاڑوں کی طرف سے آنے والی ہوا کو نہیں روک سکتی تھی۔ دھوپ میں ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھنا اسی دن اچھا لگتا تھا جس دن ہوا بند ہو۔ آدھی چھٹی کے وقت ارشاد اور نوری فرشتہ کسی بات پر الجھ پڑے۔ نوری فرشتہ بے وقوف ضرور تھا، لیکن خاصا طاقتور تھا۔ وہ دونوں گالی گلوچ پر اتر آئے۔ انتھونی نے بیچ بچاؤ کیا اور آدھی چھٹی کا وقت ختم ہو گیا۔

چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے، ماسٹر محمد جان جیسے ہی گھوڑی پر سوار ہو کر سکول کے صحن سے نکلے، نوری فرشتہ اٹھا اور اس نے سامنے تین ٹانگوں والے بلیک بورڈ پر چاک سے ایک گندی، بہن کی گالی لکھ دی۔ ارشاد نے اسے ذاتی توہین سمجھا۔ وہ اٹھ کر گالیاں دیتے ہوئے نوری فرشتے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس نے نوری فرشتے کے سینے پر بیل کی طرح ٹکر ماری۔ نوری فرشتہ دھب کی آواز کے ساتھ بلیک بورڈ پر اور بلیک بورڈ کھٹاک سے پیچھے کی سمت صحن کے کچے فرش پر گرا۔ نوری فرشتے کو ارشاد کی ٹکر سے زیادہ چوٹ بلیک بورڈ پر گرنے سے لگی۔ وہ اٹھا اور سیدھا اپنے بستے کی طرف گیا۔ یوں لگا جیسے ڈر گیا ہو۔ ارشاد نے سینہ پھلا کر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ پھر وہ نوری فرشتے کے سامنے آیا۔

"دے گالی!" اس نے چیخ کر کہا، "دے گالی... تیری میں... دے گالی!"

نوری فرشتہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے تیزی سے بستے کے نیچے سے لکڑی کی تختی نکالی اور پوری طاقت سے ارشاد پر برسانا شروع کر دی۔

"ہاں گھن... ہاں گھن... ہاں گھن..." (یہ لے... یہ لے... یہ لے...) نوری فرشتہ چیخ رہا تھا۔ انتھونی نے ایک دو تختی کے وار ہاتھ پر روکے، لڑکوں نے بڑی مشکل سے ارشاد کو بچایا، ورنہ اس کا سر پھٹ جاتا۔

Scanned with CamScanner

اگلے روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ سکول کے لڑکے تو کیا، خود ارشاد اور نوری فرشتہ گزشتہ دن کی لڑائی بھول گئے۔ کالونی کے چوکیدار عبداللہ کی جوان لڑکی بختاں کو کھوڑ کے تین اوباش نوجوانوں ملک محمد نواز، ملک محمد جہانگیر اور ملک محمد شریف نے رات کے وقت اس کے گھر سے اغوا کرنے کی کوشش کی، جو بختاں کی ماں کے شور مچانے اور اردگرد کے کوارٹروں کے بلب جل جانے پر ناکام ہوگئی۔ تینوں اندھیرے میں بھاگ گئے۔ عبداللہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔

بختاں کو میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ عبداللہ چوکیدار کا کوارٹر کھوڑ جانے والی کچی سڑک پر ہمارے سکول کے قریب تھا۔ عبداللہ کے پاس ایک گائے بھی تھی، جسے چراتے ہوئے بختاں اکثر ہمارے بنگلے کے پاس آجایا کرتی تھی۔ گندمی رنگ، درمیانہ قد، نہ موٹی نہ پتلی، بختاں خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے بال سر پر کسے رہتے تھے اور گُت (چوٹی) کمر سے بھی نیچے تک لٹکی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی رہتی تھی، جسے کبھی کبھی وہ گائے پر غصے سے برسانا شروع کر دیتی تھی۔ صبح سے دوپہر تک وہ گھر میں ماں کے ساتھ کام کرتی ہوگی، دوپہر سے شام تک وہ گائے چراتی تھی۔ میں نے کئی بار صبح صبح سکول جاتے ہوئے بختاں کو کوارٹر کی بیرونی دیوار پر اُپلے چپکاتے بھی دیکھا تھا اور میں اکثر سوچتا تھا کہ سردیوں میں اپلے چپکاتے ہوئے بختاں کے ہاتھ سُن ہو جاتے ہوں گے۔

اُس دن سکول میں ہر لڑکا بختاں کے اغوا کی کوشش پر ہی بات کر رہا تھا۔ آدھی چھٹی کے وقت لڑکوں کے شور کو اس خبر نے دگنا کر دیا کہ عبداللہ، اس کی بیوی اور بختاں، تینوں رپٹ لکھوانے تھانے گئے ہیں۔ چھٹی کے وقت پتا چلا کہ تھانیدار نے رپورٹ نہیں لکھی۔ تینوں اوباش نوجوانوں کا تعلق ملک خاندان سے ہے۔ تھانیدار ان کے خلاف پرچہ نہیں کاٹ سکا اور الٹا ملکوں نے بختاں کی ماں پر دَلّی (دلالہ) ہونے کا الزام لگا دیا ہے اور پولیس ماں باپ کو چھوڑ کر بختاں کو تھانے لے گئی ہے۔

سہ پہر کو میں جب سکول سے گھر آیا تو کچھ ہی دیر بعد والد صاحب بھی دفتر سے آگئے۔ مجھے چھپ کر باتیں سننے کی بری عادت نہیں تھی، لیکن اس روز میں نے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی باتیں سن لیں۔

"بہت بری بات ہوئی ہے!" والد صاحب کی آواز آئی۔ "اس سے پہلے کالونی میں کبھی ایسا

نہیں ہوا تھا۔ عبداللہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔'' والد صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ ''وہ بہت شریف آدمی ہے۔''

''شریف ہے تو اس کی بیوی بھی شریف ہوگی،'' امی کی آواز آئی۔ ''اثر و رسوخ والے امیر بدمعاشوں کا تو کام ہی یہی ہے کہ جب جرم کرتے ہیں تو الزام غریبوں پر لگا دیتے ہیں، طاقت اور پیسے کے زور پر صاف بچ جاتے ہیں۔''

''ایسی بات ہی لگتی ہے،'' والد صاحب کی آواز آئی۔ ''ملک برادری اس علاقے کی سب سے طاقتور برادری ہے، اور پھر تھانیدار بھی تو ملک ہی ہے۔''

''بیچاری بختاں!'' امی کی آواز میں اداسی سی تھی۔ ''خدا جانے کیا حال کریں گے بیچاری کا۔''

میں اداس سا ہو کر باہر لان میں جا بیٹھا۔ سرمائی سہ پہر کی دھوپ میں تمازت تو تھی، لیکن ہوا کا ہر جھونکا خنکی کا تھپیڑا محسوس ہوتا تھا۔

''کیا کریں گے بختاں کے ساتھ؟'' میں نے سوچا، ''بہت ماریں گے اسے۔''

پل بھر کے لیے بختاں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا اور میں بہت غمزدہ ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں میں تیزی آ رہی تھی۔ شام سے پہلے سردی کا احساس بڑھ گیا اور میں گھر کے اندر چلا گیا، جہاں آتشدان میں پتھر کے کوئلوں کو سلگایا جا رہا تھا۔ پتھر کے کوئلے ایک بار جل اٹھیں تو صبح تک ان میں حرارت باقی رہتی ہے، سارا گھر گرم ہو جاتا ہے۔ اب تو پتھر کے کوئلوں کے آتشدان خواب و خیال ہو چکے ہیں۔ رات آتے آتے باہر ہوا کی سنسناہٹ بھی مدھم ہو گئی۔

ہمارے بنگلے کے ساتھ بائیں جانب والا بنگلہ شنو کمار جی کا تھا۔ وہ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے اور تقسیم ہند سے پہلے بھی کھوڑ ہی میں رہتے تھے۔ ان کے بیوی بچے کہاں تھے، معلوم نہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ یقیناً بہت قابلِ تعظیم ہوں گے، لیکن اب مقامی لوگ انھیں ہندو ہونے کی وجہ سے مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ کالونی میں ان کا نام 'سکھ مار' رکھ دیا گیا تھا۔ شاید اسی نفرت کی وجہ سے وہ جلد ہی کہیں چلے گئے — بھارت، انگلینڈ یا آسٹریلیا، مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ ہمارے بنگلے کے دائیں جانب ولی اللہ خان صاحب کا بنگلہ تھا۔ ولی اللہ خان صاحب کے بنگلے سے تیس قدم آگے جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا جنگلا تھا، جس کے آگے گارڈینیا کی باڑ تھی۔ یہ جنگلا اور باڑ ہمارے بنگلوں کو اس تھانے سے جدا

Scanned with CamScanner

کرتی تھی جس میں بختاں موجود تھی۔

ان دنوں نہ ٹی وی تھا نہ کمپیوٹر۔ شام سات بجے کھانا کھا کر رات ساڑھے آٹھ بجے تک پڑھائی ہوتی تھی اور پھر سارے گھر کے بلب بجھ جایا کرتے تھے۔ منجھلے بھائی ان دنوں کھوڑ میں اپرنٹس شپ کر رہے تھے۔ وہ رات نو بجے تک دھیمی آواز میں ریڈیو سنتے تو تھے، لیکن صرف ہفتے کی رات کو۔

اُس رات کو ساڑھے آٹھ بجے سب بستروں میں دبک گئے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بختاں کا خیال ہر خیال پر چھایا ہوا تھا۔ بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ تھانے میں بختاں کو مارا جا رہا ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ مار پڑنے پر وہ چیخے گی تو سب اٹھ کر اسے بچا لیں گے۔ پھر ایک خیال نے مایوسی کو گہرا کر دیا کہ انھوں نے بختاں کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا ہوگا تاکہ چیخ نہ سکے۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بستر پر بیٹھا رہا۔ اس یقین پر کہ سب سو گئے ہیں، میں نے پلنگ کے قریب کرسی پر لٹکا ہوا سویٹر پہنا، سر پر اونی ٹوپی پہنی، گرم جرابیں پہنیں، بستر کے قریب پڑے ربر کے سلیپر پہنے اور آہستہ آہستہ غسل خانے کی سمت گیا۔ غسل خانے سے پہلے وارڈروب کو آہستہ سے کھولا اور گرم کوٹ نکال کر پہنا۔ گلے میں مفلر ڈالا۔ احتیاط سے وارڈروب کو بند کیا اور غسل خانے میں آ گیا۔ غسل خانے کا ایک دروازہ باہر دالان کے سامنے برآمدے میں بھی کھلتا تھا۔ میں نہایت احتیاط سے شور کیے بغیر برآمدے میں آیا اور پھر ایک دو بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے دالان عبور کیا۔ باہر سرونٹ کوارٹرز کی طرف کھلنے والے چھوٹے گیٹ کو کھول کر میں گھر سے باہر آ گیا۔ سب سے پہلا احساس ہوا میں موجود سردی کا تھا۔ میں نے گردن پر مفلر لپیٹا، سر کی اونی ٹوپی کو پیشانی پر ابروؤں تک کھینچا۔ ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے مجھے دستانے بھول آنے کی غلطی کا احساس ہوا۔ گھر سے باہر نکل کر ڈر بھی لگا، کیونکہ والد صاحب نے رات کے وقت گھر سے باہر نکلنے پر سخت قسم کی پابندی لگائی ہوئی تھی۔ یہ علاقہ خطرناک قسم کے کوبرا سانپوں کا علاقہ ہے جو ہر سال کتنی ہی جانیں لے لیتے ہیں۔ والد صاحب کا حکم تھا کہ سردیوں میں بھی باہر نہ نکلا جائے، کیونکہ سردترین راتوں میں بھی سیاہ رنگ کوبرے کی ایک انتہائی زہریلی قسم بلوں سے باہر نکل آتی ہے۔ مجھے بختاں کے خیال نے پریشان کیا ہوا تھا۔ میں ولی اللہ خان صاحب کے بنگلے کے پاس سے گذر کر ٹوٹے ہوئے جنگلے تک آیا اور پھر آگے بڑھتے ہوئے

گارڈینیا کی باڑ تک پہنچا۔ باڑ کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جب میں اس جگہ پہنچا جہاں تھانے کا برآمدہ ہے، تو میں ٹھٹک گیا۔ تھانے کے باہر تھانیدار کی جیپ کھڑی تھی اور برآمدے کے علاوہ بھی تھانے کے بلب جل رہے تھے۔ چند قدم آگے باڑ کے ساتھ والے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں، جو قریب جانے پر صاف سنائی دینے لگیں۔

''کنجری ہے تو!'' میں تھانیدار کی آواز پہچانتا تھا۔ ''پیشہ کرتی ہے!'' اس نے گرجدار لیکن دبی دبی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی بختاں کے رونے کی آواز آئی۔ میرے بدن میں جھرجھری سی نمودار ہوئی۔

''مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھوا لے...'' روتے ہوئے بختاں کی آواز بھی دبی دبی سی تھی۔ ''میں قسم اٹھاتی ہوں .... میں نے کوئی برا کام نہیں کیا۔''

''بک بک نہ کر!'' تھانیدار اور بختاں مقامی زبان اور لہجے میں بول رہے تھے۔ ''میرے علاقے میں یہ گندگی اور مجھے پتا ہی نہیں — کب سے کر رہی ہو پیشہ؟'' ہوا کے ایک یخ بستہ جھونکے سے میرے کان اور ناک ٹھٹھر سے گئے۔ مجھے جھرجھری سی آئی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا...'' بختاں رو رہی تھی۔ ''ملک نواز، جہانگیر اور شریف، بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ گائے چرانے جاتی ہوں تو بولیاں مارتے ہیں۔ کل رات ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماں سمجھی ابا آیا ہے۔ دروازہ کھولا تو زبردستی اندر گھس آئے۔ ماں نے شور مچایا۔ میرے منھ پر ہاتھ رکھ کر شریف نے اٹھانے کی کوشش کی۔ میں مڑی، اس کے بال کھینچے ... باقی دونوں نے مجھے اور ماں کو قابو کرنے کی کوشش کی ... پھر ساتھ والے کوارٹر کی بتیاں جل جانے پر تینوں باہر اندھیرے میں بھاگ گئے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر تھانیدار کی غصیلی آواز ابھری۔

''بکواس نہ کر!'' وہ بولا، ''جھوٹ بولتی ہے تو۔ تین گاہکوں کو دیکھ کر تیری دَلّی ماں نے زیادہ پیسے مانگے تھے، نہ ملنے پر شور مچا دیا تھا۔''

''میری ماں کو گالی نہ دے!'' بختاں نے چیخ کر کہا۔ ''سارے کوارٹروں والے جانتے ہیں، ہم شریف لوگ ہیں... پوچھ لے ان سے... ہمارے پڑوسیوں سے پوچھ لے... ایسی باتیں چھپی نہیں

رہتی ہیں تھانیدار..."

"ہا آ آ!" یوں لگا جیسے تھانیدار نے زور سے اپنا بوٹ کمرے کے فرش پر مارا ہو۔ "سب پتا چل جائے گا!" تھانیدار کے لہجے سے میرے بدن میں سنسنی کی لہر اٹھی۔ "بہت دیکھی ہیں تیری جیسی رنڈیاں... سب اگلوالوں گا۔"

بختاں کے رونے کی آواز آئی۔ ہوا میں سردی کا احساس اس قدر بڑھ چکا تھا کہ میرے پورے بدن پر کپکپی سی طاری ہو چکی تھی۔

"دلاور خان،" تھانیدار نے بلند آواز میں تھانے کے سب سے بوڑھے سپاہی کو بلایا۔ دلاور خان ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ میں نے کئی بار شام کے وقت، اسے تھانے کے باہر لان میں کرسی بچھائے ہوئے، کرسی پر لیٹنے کے انداز میں اونگھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس پر ہر وقت تھکن سی چھائی رہتی تھی۔ اس کی ڈیوٹی بھی رات ہی کی ہوا کرتی تھی۔ دلاور خان کے بال سفید ہو چکے تھے، چہرے پر جھریاں تھیں؛ دبلا پتلا، منہ میں اگلے دو دانت غائب۔ دلاور خان کے جسم پر وردی اتنی ڈھیلی نظر آیا کرتی تھی جیسے اس نے کسی موٹے سپاہی کی وردی پہن لی ہو۔

"جی ملک صاحب،" دلاور خان کی آواز میں بھی تھکن تھی۔ آواز کے ساتھ اس کے بوٹوں کی آواز بھی نزدیک آتی محسوس ہوئی۔

"وہ جو پرسوں چور پکڑا تھا،" تھانیدار کی آواز آئی۔ "کچھ منوایا محمد حسین نے یا نہیں؟" محمد حسین تھانے کا بہت ہی خوفناک قسم کا سپاہی تھا، بھاری بھرکم بدن والا، بہت چوڑے جبڑے اور بڑی بڑی سیاہ مونچھوں والا۔ "کچھ مانا کہ نہیں؟"

"بک دیا ہے سب کچھ اس نے ملک جی۔" دلاور خان کی آواز آئی۔ "چوریاں بھی مان لی ہیں۔"

"ہوں!" تھانیدار نے لفظ ہوں کو کچھ لمبا کھینچا۔ "جا دیکھ، کیا کر رہا ہے،" تھانیدار نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کوٹھڑی کا تالا اچھی طرح چیک کر لینا۔"

"اچھا ملک صاحب،" دلاور خان کے بوٹوں کی آواز آہستہ آہستہ دور جاتی ہوئی سنائی دی۔ ہوا کے ایک جھونکے نے جیسے میرے پورے چہرے پر برف مل دی۔ میرے دانت بجے۔ یوں

Scanned with CamScanner

محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ناک اور کان میرے جسم پر ہیں ہی نہیں۔ میں نے ہاتھوں سے ناک کو رگڑا، اونی ٹوپی کو کانوں پر کھینچا۔ گارڈینیا کے سبز پتے چہرے سے مس کر رہے تھے۔ گہرے سبز پتوں کی مہک نتھنوں میں محسوس ہوئی۔ یہ دھیمی دھیمی خوشبو پتا مسلنے پر بہت تیز ہو جایا کرتی ہے اور مجھے اچھی بھی لگتی ہے۔

"بڑی سوہنی ہے تو،" لہجے کے ساتھ تھانیدار کی آواز بھی بدل گئی۔

"رب کے لیے مجھ پر رحم کر،" بختاں نے روتے ہوئے کہا۔ "میں غریب اور شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں۔"

"غریب اور شریف..." تھانیدار کی آواز پھر کرخت ہو گئی۔ "بڑی دولت اکٹھی کر لی ہو گی تیری ماں نے!"

"میں نے کچھ نہیں کیا..." بختاں نے روتے ہوئے پھر کہا۔ "میری ماں بے قصور ہے۔ تو قرآن لے آ، میں ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں، ہم شریف لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی... میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں... میں بے قصور ہوں۔"

"بکواس نہ کر!" تھانیدار کی گرجدار آواز پھر ابھری۔ "تو رنڈی ہے، تیری ماں دَلّی ہے۔"

"ہم پر رحم کر ... میں ہاتھ جوڑتی ہوں ... ہم پر رحم کر ... ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

بختاں کی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ میرا جسم زور سے کانپا۔ یہ کپکپاہٹ، سردی سے پیدا ہونے والی کپکپاہٹ سے کہیں زیادہ اور مختلف تھی۔

"کتنے عاشق ہیں تیرے؟" تھانیدار کی آواز پھر بدل گئی۔ "بیس تیس تو ہوں گے۔ کتنی دیر سے کر رہی ہے دھندا؟ کتنے روپے لیتی ہے ایک باری کے؟"

"شرم نہیں آتی تجھے؟" بختاں چیخ اٹھی۔ "تیری کوئی بیٹی نہیں ہے؟ کوئی بہن نہیں ہے؟ یہ کیا پوچھ رہا ہے مجھ سے؟— میں نے اللہ کی قسم کھائی ہے، میں بے قصور ہوں، قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کے لیے تیار ہوں، لے آ قرآن — یہ کیا پوچھ رہا ہے؟" چند لمحے خاموشی سی رہی۔ وقفے وقفے سے بختاں کی سسکیاں ابھریں۔

"بڑی قسمیں سنی ہیں میں نے تیرے جیسی بدکار لڑکیوں کی!" تھانیدار کی آواز ابھری،

''بول، کتنے روپے لیتی ہے؟ بیس، پچیس — یا اس سے بھی زیادہ؟ بول کتنے روپے لیتی ہے ایک باری کے؟ — تیس تو میری جیب میں بھی ہیں!''

مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا لیکن فیض لاہوریے نے ایک بار بتایا تھا کہ لاہور میں ایک ہیرا منڈی ہے، جہاں رنڈیاں روپے لے کر گاہکوں کو خوش کرتی ہیں۔

''بہت گاہک ہوں گے تیرے،'' تھانیدار یوں بول رہا تھا جیسے دانت پیس رہا ہو۔ ''بہت ہوں گے — چل ایک اور سہی — بول، کتنے روپے؟''

کچھ دیر کے لیے پھر خاموشی سی چھا گئی، یخ بستہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا گارڈینیا کی باڑ سے گذرتا تو سنسناہٹ سی ابھرتی تھی۔

''میرا باپ کالونی کا چوکیدار ہے،'' پہلی بار بختاں کی بہت مضبوط آواز آئی۔ ''رکھوالا ہے کالونی کا... یہ جو پرسوں چور تھانے میں آیا ہے، جو تیری کوٹھڑی میں بند ہے، اسے تیرے سپاہیوں نے نہیں، میرے باپ نے پکڑا ہے۔'' بختاں کی مضبوط آواز بلند ہو گئی۔

''کل رات تین ڈاکو میرے باپ کے گھر اس کی عزت لوٹنے آئے۔ تیرے سپاہی کہاں تھے؟ تو تو راکھا ہے یہاں کا، کہاں تھے تیرے سپاہی؟ میرا باپ تو ڈیوٹی پر تھا۔ آج صبح وہ، ماں کے ساتھ تیرے تھانے میں رپٹ لکھوانے کیوں آیا تھا — راکھا سمجھ کے — دیگر ویلے[2] تو مجھے پکڑ کر تھانے لے آیا۔ میں تجھے وڈا ابھرا[3] سمجھ کے فریاد کر رہی ہوں اور تو ... میری قیمت لگا رہا ہے... میں تیری چھوٹی بہن جیسی ہوں اور تو میری عزت لوٹنا چاہتا ہے!'' ہر جملے کے ساتھ بختاں کی آواز بلند ہو رہی تھی، آخری جملہ تقریباً چیخ بن گیا۔ ''عزت لینا چاہتا ہے میری — عزت لینا چاہتا ہے تو —'' بختاں چیخ اٹھی۔ ''ہاں گھن... ہاں گھن... ہاں گھن ...'' (یہ لے۔ یہ لے۔ یہ لے!) اس کے ساتھ ہی کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ میرا بدن جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔

''ہاں گھن... توں چا گھن...'' (یہ لے... تو لے لے...)

اس کے ساتھ ہی بختاں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی تھانیدار برآمدے میں نظر آیا۔ برآمدے کے بلب کے نیچے آتے ہی وردی میں ملبوس چالیس پینتالیس برس

---

[2] دیگر ویلے: سہ پہر کے وقت۔ [3] وڈا ابھرا: بڑا بھائی۔

Scanned with CamScanner

کے لمبے تڑنگے تھانیدار کا چہرہ نظر آیا، اس پر بدحواسی طاری تھی۔

''دلاور خان!'' اس نے زور سے کہا۔

''جی ملک صاحب،'' دور سے بوڑھے سپاہی کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے وہ بھی برآمدے میں نظر آیا۔ تھانیدار نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلاور خان سے کچھ کہا، اتنا آہستہ کہ مجھے ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا۔ پھر وہ تیزی سے جیپ کی سمت گیا، جیپ اسٹارٹ کی۔ میں گارڈینیا کی باڑ کے نیچے تقریباً بیٹھ گیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس جلیں اور وہ تھانے کے بیرونی گیٹ سے بائیں جانب تیزی سے نکل گئی۔ دلاور خان بختاں والے کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد بختاں برآمدے میں نظر آئی۔ دلاور خان اس کے پیچھے برآمدے میں آیا۔ میں باڑ کی ٹہنیوں اور پتوں میں سے بھی بختاں کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس نے اونی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سر بھی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا اور سامنے چھاتی پر ایک ہاتھ سے چادر یوں پکڑی ہوئی تھی، جیسے چادر کے نیچے کرتے کو پکڑ رکھا ہوں۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

''چل... گھر چل،'' دلاور خان نے کہا۔

''رہنے دے بابا،'' بختاں نے کہا، ''چلی جاؤں گی۔''

''جھلّی ہو گئی ہے کیا؟'' دلاور بولا۔ ''راستے میں کتے ہوں گے اور سڑک پر کالا ناگ بھی آ سکتا ہے، وہ سردیوں میں بھی نکلتے ہیں۔''

بوڑھا سپاہی اور بختاں تھانے کے بیرونی گیٹ کی طرف چلے گئے، اور ان کے گیٹ سے نکلتے ہی میں آہستہ آہستہ باڑ کے ساتھ چلتا ہوا جنگلے کے پاس پہنچا۔ پھر ولی اللہ خان صاحب کے بنگلے کے پاس سے ہوتا ہوا اپنے بنگلے کے عقب میں آیا۔ ہوا میں تیزی سی تھی۔ سردی سے میرے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے کندھے اوپر کی سمت اٹھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ بنگلے کا چھوٹا سا عقبی گیٹ کھول کر پھر بند کرنا بھی مشکل محسوس ہوا۔ میں دالان سے ہو کر برآمدے میں آیا، پھر غسل خانے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اندر داخل ہوا۔ غسل خانے میں آتے ہی سردی کم ہونے کا احساس ہوا۔ احتیاط سے میں نے غسل خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اندر سے چٹخنی لگائی۔ کانپتے بدن کے ساتھ میں نے وارڈروب کے سامنے آ کر مفلر اور کوٹ اتارا، آہستہ

Scanned with CamScanner

سے انھیں لٹکایا، وارڈ روب بند کرتے ہوئے میں نے کٹکٹاتے دانتوں پر قابو پانے کی شعوری کوشش تو کی لیکن ناکام... کمرے میں آ کر میں نے دانت زور سے دبائے، بستر تک پہنچا، اونی ٹوپی اتاری، سویٹر اتارا، جرابیں اتاریں اور لحاف میں دبک گیا۔ دانت اب بھی وقفے وقفے سے کٹکٹانے لگتے تھے۔ کچھ دیر بعد بدن کی کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔

"کیا بختاں گھر پہنچ گئی ہو گی؟" میں نے سوچا۔ "نہیں، ابھی راستے میں ہو گی۔" ایک اندیشے نے سر اٹھایا۔ "کہیں تھانیدار اسے ملکوں کے پاس نہ لے گیا ہو۔" پھر ایک خیال نے اندیشے کو ختم کر دیا۔ "لے جانا ہوتا تو جیپ میں لے کر جاتا اور پھر..." مجھے بوڑھا دلاور خان جیسے تصور میں سامنے کھڑا نظر آیا۔ "دلاور خان نے بھی کہا تھا کہ چل گھر چل — بختاں گھر ہی گئی ہو گی۔"

بستر جیسے جیسے گرم ہو رہا تھا، مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

"بختاں گھر والوں کو سب کچھ بتا تو دے گی،" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔ "ماں سے تو کچھ نہیں چھپائے گی۔" پھر سب خیالات، سب احساسات کو نیند نے لپیٹ لیا۔

صبح جب میں سکول پہنچا تو شور مچا ہوا تھا۔ کھوڑ گاؤں کے لڑکے ہاتھ ہلا ہلا کر، چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ تھانیدار سویرے سویرے سپاہی محمد حسین کے ساتھ کھوڑ گاؤں پہنچا، جیپ گاؤں کے باہر کھڑی کی اور اس نے ملک محمد نواز، ملک محمد جہانگیر اور ملک محمد شریف کو گرفتار کر لیا ہے۔

"ہتھکڑیاں لگا کے لے گیا ہے حرام توپوں[4] کو،" ایک لڑکے نے کہا۔

"کسی کی نہیں سنی،" دوسرا بولا۔

"تھانے لے گیا ہے،" تیسرے نے بتایا۔

"وہ ملکوں کے بیٹے ہیں،" ایک تنگ ماتھے والے گہرے سانولے لڑکے نے کہا، "دیکھ لینا، شام تک چھوٹ جائیں گے۔"

"مت چھوٹے!" فوجی گالی دینے والے لڑکے نے کہا۔ "اب نہیں چھوڑے گا، بہت غصے میں تھا۔"

---

[4] حرام توپ: شمالی پنجاب کے فوجی گھرانوں کی مخصوص گالی۔

ارشاد دونوں بازو ہلاتا ہوا، سب کے سامنے آیا۔

''چھوٹ کے جائیں گے کہاں بہن —'' اس نے گندی گالی دی۔ ''یہاں ہی سے گذریں گے۔'' اس نے سکول کے سامنے کھوڑ گاؤں جانے والی کچی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم سب میرے ساتھ رہنا،'' اس نے نوری فرشتے کی طرف دیکھا۔ ''تو بھی — مار مار کے ان کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔''

انتھونی گھبرا کر سامنے آیا۔

''نہیں نہیں!'' وہ تیزی سے بولا۔ ''کوئی ضرورت نہیں۔ کل فادر کہہ رہے تھے کہ خداوند کی پکڑ سے کوئی مجرم نہیں بچ سکتا... کوئی ضرورت نہیں... تمھیں بدمعاشوں سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں،'' انتھونی نے لفظ بدمعاشوں پر زور دے کر کہا اور بہت دنوں سے خاموش رہنے والے فیض لاہوریے میں بھی جان سی پڑ گئی۔

''سب کچھ اگلوالے گا تھانیدار،'' فیض لاہوریے کی آواز سن کر سب لڑکوں کے چہرے اسی کی طرف مڑ گئے۔ ''بڑے طریقے ہوتے ہیں پولیس والوں کے پاس۔ ہزار واٹ کا بلب جلا کر آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ سونے نہیں دیتے۔ الٹا لٹکا کر ہنٹر سے کھال اتار دیتے ہیں اور پھر برف کے بلاک پر لٹاتے ہیں — ننگا —'' فیض لاہوریے نے خوفزدہ سی آواز میں آخری جملہ سرگوشی کے انداز میں کہا اور کچھ لڑکے سہم گئے۔

''پر یہ ہوا کیسے؟'' نوری فرشتہ بازو ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کس کے حکم پر ہوا ہے یہ سب کچھ؟''

نوری فرشتے کا یہ سوال سن کر سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ انھیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ نوری فرشتہ اس قدر عقلمندی کا سوال کر سکتا ہے۔ وہ یوں نوری فرشتے کو دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار انھیں نوری فرشتے کی اہمیت کا احساس ہوا ہو۔ کسی کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ پھر کھوڑ گاؤں کے ایک دبلے پتلے لڑکے نے نوری فرشتے کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں سیدھا دیکھا۔

''کوئی بڑی ہستی ہی ہوگی،'' اس نے مقامی زبان اور لہجے کی لوچ کے ساتھ کہا، ''ملکوں سے بھی بڑی!''

❄❄

خالد طور

انتظارِ خواب

1

ایرک رابنسن دل کا مریض تھا۔ اس پر مستزاد بے خوابی کا عارضہ تھا جس میں وہ گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے مبتلا تھا۔ کوئی رات ایسی نہ تھی کہ وہ صبح چار بجے سے پہلے سو جاتا ہو۔ وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ دراز قد، گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر اس کی ناک پتلی تھی۔ اسے کبھی اس حقیقت پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا کہ وہ دل کا مریض ہے۔

''میں تو دبلا پتلا ہوں،'' وہ اکثر سوچا کرتا تھا، ''غذا بھی سادہ کھاتا ہوں، ڈاکٹر لوگ نہ جانے کیوں مجھے دل کا مریض کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، مجھے دل کی جگہ پر درد ہوتا ہے۔ یہ درد گیسوں کی وجہ سے بھی تو ہو سکتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ انجائنا ہی کا ہو۔ سینے اور بازو کے پٹھوں کا بھی ہو سکتا ہے۔''

وہ اپنی غیر یقینی پر ہمیشہ قائم تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ ڈسکہ[1] کے پرائمری سکول میں ریاضی کے ٹیچر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ تک وہ بھلا چنگا رہا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن اب بھی گھنے تھے۔ اس کی بھنویں، اس کی آنکھوں پر بہت گھنی تھیں۔ اس کی بیوی اس کی ہم عمر تھی۔ دبلی پتلی، درمیانے قد کی، سانولی، گول چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی سوزن اکثر اپنے بالوں کو، سفید بالوں کو، اپنے دوپٹے سے باندھے رکھتی تھی۔ وہ آدھے سر کے درد میں پچھلے دس برسوں سے مبتلا تھی۔ سیدھی سادھی، شوہر سے بہت محبت کرنے والی سوزن اکثر ایرک کی بیماری سے متعلق پریشان رہتی تھی۔

---

[1] ڈسکہ سیالکوٹ جانے والی سڑک پر عیسائیوں کی اکثریت والی بستی ہے۔

Scanned with CamScanner

''سوزن،'' ایرک نے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن بیوی سے کہا، ''ڈاکٹر جھوٹ بولتا ہے۔ دیکھ لے، میں نے اپنی سروس مکمل کر لی ہے۔''

ایرک کا ایک ہی بیٹا تھا، پیٹر ایرک۔ وہ سیالکوٹ سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور کی وائی ایم سی اے انسٹیٹیوٹ میں الیکٹریشن کا ڈپلومہ حاصل کرنے کے لیے زیرِ تعلیم تھا۔ پیٹر اپنے چچا سیموئیل رابنسن کے پاس لاہور میں سرکاری ملازموں کے لیے بنائے گئے چوبرجی کوارٹرز میں رہتا تھا۔ سیموئیل پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن بے حد ہوشیار شخص تھا۔ وہ برسوں پہلے خاکروب کی حیثیت سے لاہور میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہوا تھا۔ پھر اس نے کارپوریشن کے پبلک ریلیشنز افسر تک رسائی حاصل کی۔ پی آر او کی سفارش پر وہ لاہور کے میئر کے گھر کی صفائی کرنے لگا، اور پھر میئر کی بیوی کی سفارش پر کارپوریشن کے تمام خاکروبوں کے انچارج کا اسسٹنٹ بن گیا۔ وہ اس قدر چاپلوس تھا کہ اس کے ماتحت کام کرنے والے تمام خاکروب اس کی میٹھی میٹھی باتوں کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ اسے کسی بات پر بھی 'نا' نہیں کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا لیڈر بن گیا۔ میئر کی سفارش پر اسے چوبرجی کوارٹرز میں دو کمروں کا کوارٹر بھی مل گیا۔ اس نے کوارٹر کے صحن میں ایک اور کمرہ بنوالیا، جس کی اجازت نہ تھی، اور کمال یہ کہ سارے اخراجات بھی کارپوریشن سے وصول کر لیے۔ پیٹر اسی کمرے میں رہتا تھا۔ سیموئیل کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ سانولی، معمولی خدوخال والی مارگریٹ اس کی بڑی بیٹی تھی جس نے میٹرک کے بعد نرسنگ کا کورس مکمل کیا اور لاہور ہی کے لیڈی ولنگڈن اسپتال میں تعینات ہو گئی۔

سیموئیل بھی اپنے بھائی ایرک کی طرح گہرے سانولے رنگ کا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش بڑے بھائی سے ملتے جلتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ قد کا قدرے چھوٹا اور موٹا تھا۔ اس کے سر کے بال اڑ چکے تھے لیکن سر کی دونوں جانب سفید بالوں کو رنگنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ لاہور کی ایک ہاؤسنگ اسکیم میں پانچ مرلے کا پلاٹ لے کر وہ اس پر مکان بنوا رہا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں تین سال باقی تھے۔ سیموئیل کی بیوی رانی چھوٹے قد کی موٹی عورت تھی، سیموئیل ہی کی طرح گہری سانولی۔ وہ بھی سیموئیل کی طرح اپنے سفید بال رنگتی رہتی تھی۔

ایرک رابنسن نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی تھیں لیکن ڈسکہ میں اپنا آبائی گھر بیچ کر

Scanned with CamScanner

لاہور آ جانا اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی محسوس ہوا کرتی تھی۔ ڈسکہ میں اس کا گھر کھلے سرسبز کھیتوں کے سامنے تھا۔ لاہور کی بستی کرشن نگر میں سیموئیل نے اسے اڑھائی مرلے کا دو کمروں والا مکان خرید دیا۔ سوزن آبائی گھر فروخت کرنے پر تیار نہیں تھی لیکن ایرک کو اس کے بھائی نے زبردست ترغیب دی۔

"بڑا اثر ورسوخ ہے میرا،" سیموئیل نے ایرک سے کہا۔ "میئر میری ہر بات مانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میرے ایک اشارے پر کارپوریشن کے ورکرز کام چھوڑ سکتے ہیں اور لاہور شہر میں گندگی ہی گندگی پھیل جائے گی۔ میں ڈپلوما ملتے ہی پیٹر کو واپڈا میں ملازمت لے دوں گا۔ پیٹر کی نوکری پکی سمجھ۔ بیٹے کے ساتھ رہے گا تو تیری دیکھ بھال بھی اچھی طرح ہوتی رہے گی۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا،" ایرک نے کہا۔ اسے اپنی دل کی بیماری کا یقین ہی نہیں تھا لیکن جب اس کے بیٹے نے بھی چچا ہی کا ساتھ دیا تو وہ مان گیا۔ سیموئیل آبائی گھر بیچ کر اپنا حصہ لینا چاہتا تھا۔ پھر وہ اپنی معمولی خدوخال والی بیٹی کے لیے پیٹر کا رشتہ بھی چاہتا تھا۔ پیٹر اگر خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں تھا۔ موٹی سانولی مارگریٹ بھی پیٹر کو چاہتی تھی اور سیموئیل یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔

لاہور کے علاقے کے کرشن نگر میں جو مکان سیموئیل نے بھائی کے لیے خریدا تھا وہ بظاہر اچھی جگہ پر تھا۔ سامنے بچوں کے لیے پارک بنا ہوا تھا لیکن پارک میں نہ کوئی درخت تھا نہ پودا، یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں تھی۔ محلے کے لڑکوں نے پارک کو گراؤنڈ میں تبدیل کر دیا تھا۔ وسط میں کرکٹ کھیلنے کے لیے پچ بنائی تھی۔ مکان میں آگے پیچھے دو کمرے تھے۔ پچھلا کمرہ ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا تھا اور برآمدے کے آگے چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ برآمدے کے ساتھ باورچی خانہ تھا اور صحن میں غسل خانہ اور لیٹرین۔ صحن میں دائیں جانب چھت پر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔

"ذرا بہتر حالات ہو جائیں،" سیموئیل نے ایرک سے کہا، "پیٹر کی ملازمت شروع ہو جائے تو اوپر ایک یونٹ بنوا لینا۔ ایک کمرہ، اٹیچڈ باتھ اور باورچی خانہ۔"

ایرک بھائی کی ہر بات مانتا تھا۔ وہ مستقبل کے تصور میں اپنے چھوٹے سے خاندان کو دیکھنے لگا جس میں وہ، سوزن، پیٹر اور اس کی بیوی اور پوتے پوتیاں شامل تھیں۔ ایرک نے سوزن کی معمولی سی مزاحمت کے بعد گھر بیچا تھا۔ جس دن وہ ٹرک پر سامان لادے سوزن کے ساتھ نئے گھر میں آیا تو

Scanned with CamScanner

بہت خوش تھا لیکن شام سے کچھ پہلے پڑوس سے ایک عورت کی بلند آواز سنائی دی۔

''گوانڈ اِچ چوہڑے آ گئے نیں، رب خیر کرے۔'' (پڑوس میں خاکروب آ گئے ہیں، رب خیر کرے۔)

ایرک پر مایوسی چھا گئی۔ وہ ڈسکہ میں ایک باعزت شخص تھا۔ اتوار کے روز چرچ کے کوائر (choir) میں اس کی موجودگی لازم سمجھی جاتی تھی۔ سکول میں ہر کوئی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ محلے کے لوگ کسی بھی معاملے میں اس کی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے...

وہ مایوسی سے نڈھال ہو گیا۔ سوزن نے اسے سمجھایا کہ نئی جگہ ہے، ایسی باتیں تو ہوں گی۔

''تو دیکھ لینا ایرک،'' سوزن نے کہا۔ ''یہی لوگ تیری عزت کریں گے۔''

ایرک کے اس نئے مکان میں صرف ایک ہی چھت کا پنکھا تھا، سامنے والے کمرے میں۔ ایرک پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ مسلسل چھت کے پنکھے کو دیکھ رہا تھا جہاں پنکھے کے قریب ہی چھت پر ایک چھپکلی چمٹی ہوئی تھی۔ سوزن کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔ ایرک کی شرافت دیکھ کر اور پیٹر کو واپڈا میں لائن مین کی نوکری مل جانے کے بعد محلے کے لوگ اس کی عزت کرنے لگے۔ سیموئیل نے پیٹر کی ڈیوٹی اسی علاقے میں لگوا دی تھی۔ ایرک بہت کم گھر سے نکلتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان لانا، ہر اتوار کو مال روڈ کے کتھیڈرل جا کر عبادت کرنا، سوزن کے مجبور کرنے پر سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر سے ملنا، بس یہی اس کی زندگی تھی۔ محلے میں سب اسے بھلا مانس کہنے لگے تھے اور رمضان کے مہینے کے بعد جب عید آئی تو پہلے ہی دن طعنہ دینے والی پڑوسن نے سویوں کی تھالی بھجوا دی۔ اس کے باوجود ایرک کو ڈسکہ چھوڑنے کا غم تھا، اور یہ غم اسے اپنے ذہن کی چھت پر چھپکلی کی طرح چمٹا محسوس ہوا کرتا تھا۔ اسے ڈسکہ میں پرائمری سکول بہت یاد آیا کرتا تھا۔ وہ اپنے سکول کی ایک ایک اینٹ سے بہت محبت کیا کرتا تھا۔ یہ محبت اب بھی اس کے دل میں تھی۔ سکول کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی کھلے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ انھی سرسبز کھیتوں کے سامنے اس کا آبائی مکان بھی تھا۔

ایرک کو کھیتوں سے آتی ہوئی ہوا میں دھان کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔ ملک بھر میں سب سے بہترین چاول اسی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایرک ہر صبح سکول جاتے ہوئے کچھ دیر کھیتوں کے کنارے ٹھہر کر دھان کی خوشبو سے حاصل ہونے والے شگفتہ احساس میں مسکرایا کرتا تھا۔ وہ اس

Scanned with CamScanner

خوشبو کو زندگی کی خوشبو کہا کرتا تھا۔ ایرک بہترین گویا بھی تھا۔ بچوں کو پہاڑے یاد کراتے ہوئے وہ خود بھی گانے لگتا تھا: ''ایک دُونی دُونی، دو دُونی چار، تین دونی چھ، چار دونی آٹھ...'' وہ اکثر اپنا ہارمونیم سکول میں لاکر بچوں کو گیت اور نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس کی طبیعت میں غیر معمولی برداشت بھی تھی۔ بچے اسے بہت چاہتے تھے۔ ریاضی جیسے خشک مضمون کو وہ اس انداز میں پڑھایا کرتا تھا کہ اس کی کلاس میں حاضری سو فیصد رہتی تھی۔ اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تھا تو وہ اسے ملنے کے اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ اب اس کے پاس یادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوزن نے اس کا ہارمونیم پڑچھتی[2] پر رکھ دیا تھا، جس پر مٹی کی تہہ جم چکی تھی۔

2

اتوار کے روز کتھیڈرل میں عبادت کے بعد سیموئیل نے ایرک کا ہاتھ پکڑا۔

''پیٹر کی نوکری لگ گئی ہے،'' سیموئیل نے کہا۔ ''کیا سوچا ہے تو نے؟ اس کا گھر بسائے گا کہ نہیں؟'' ایرک فوراً سمجھ گیا۔ اس نے سیدھا بھائی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اگر تیرا اشارہ مارگریٹ کی طرف ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، اور سوزن کو بھی نہ ہوگا۔ مارگریٹ ہماری اپنی بچی ہے۔''

سیموئیل کا چہرہ خوشی کے تاثرات سے بھر گیا اور وہ اسی شام مٹھائی کا ڈبا لے کر ایرک کے گھر پہنچ گیا۔

سردیوں میں ایرک خشک کھانسی کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔

''تو جو مجھے انجائنا کی گولیاں کھلاتی رہتی ہے،'' ایرک نے کھانستے ہوئے سوزن سے کہا، ''انھوں نے میری چھاتی خشک کر دی ہے۔'' وہ اداس سا تھا۔ ''یہ شہر کا دھواں، گھٹا گھٹا سا ماحول... میری جان چلی جائے گی۔ کاش میں ڈسکہ نہ چھوڑتا۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی مجھ سے۔''

''بڑھاپے میں سبھی کو کوئی نہ کوئی بیماری لگ ہی جاتی ہے،'' سوزن نے کہا۔ ''مجھے دیکھ، دس برسوں سے سر باندھے پھر رہی ہوں۔ تو نے جو بھی کیا ہے، ٹھیک ہی کیا ہے۔''

[2] کمرے کی اندرونی چھت کے نیچے مختصر سی چھت، جس پر صندوق، لحاف اور دیگر سامان رکھا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سوزن کبھی بھی ایرک سے ایسی کوئی بات نہ کہتی تھی جس سے اسے صدمہ پہنچے۔ وہ ہمیشہ ایرک کو تسلیاں دیتی رہتی تھی، لیکن ایرک کو اس کے لہجے میں بناوٹ کا احساس ہو جایا کرتا تھا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہے،'' وہ سوزن سے کہا کرتا تھا۔ ''میں جانتا ہوں، تو یہاں خوش نہیں ہے۔''

کرسمس پر سیموئیل نے ایرک سوزن اور پیٹر کو ڈنر پر بلایا۔

ایرک بہت کم شراب پیتا تھا۔ ایسٹر اور کرسمس کے علاوہ وہ کبھی کبھار ہی وسکی کا ایک پیگ لیا کرتا تھا۔ اس رات ایرک نے وسکی کے تین پیگ پیے اور وہ بھی سوڈا ملائے بغیر۔ وہ بار بار کھانس رہا تھا۔

''بھائی، یاد ہے تجھے،'' ایرک نے سیموئیل سے کہا، ''ماں کرسمس پر کیا کیا کرتی تھی؟''

''میں بتاتی ہوں،'' موٹی رانی نے فوراً کہا۔ ''دیسی گھی میں دیسی مرغا روسٹ کیا کرتی تھی۔''

''تجھے ابھی تک یاد ہے؟'' سوزن نے کہا۔

''یاد ہی نہیں باجی،'' رانی نے ہنستے ہوئے کہا، ''مارگریٹ نے آج دیسی گھی میں دیسی مرغا روسٹ کیا ہے۔''

''او تیری خیر ہو!'' ایرک خوشی سے بولا، ''جی خوش کر دیا۔''

ڈنر کے بعد پیٹر اور مارگریٹ گھومنے پھرنے چلے گئے۔ ایرک، سیموئیل، سوزن اور رانی نے ان کی شادی مارچ کے مہینے میں طے کر دی۔

اپنی معمولی سی پنشن کے باوجود ایرک نے پیٹر کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے اسے کمیوٹیشن کے ایک لاکھ روپے ملے تھے جو اس نے قومی بچت اسکیم میں رکھوا دیے تھے۔ وہاں سے اسے ہر ماہ نو سو روپے مل جایا کرتے تھے۔ اس نے سوزن کی پریشانی کے باوجود ان میں سے پچاس ہزار روپے نکلوا لیے۔ مارچ میں پیٹر کی شادی مارگریٹ سے ہو گئی۔ ایرک نے سارا گھر جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا۔ سوزن نے پنکھے والے کمرے میں جھنڈیاں لگائیں، پلنگ پر نئی چادر بچھائی، تکیہ لگایا اور گلاب کی پتیاں چادر پر بکھیر دیں۔ وہ بہت خوش تھی، لیکن سیموئیل نے پہلے ہی سے ملتان روڈ کے ایک ہوٹل میں پیٹر اور مارگریٹ کے لیے ایک کمرہ بک کرا رکھا تھا۔

Scanned with CamScanner

پیٹر اپنی سفید جوڑے میں ملبوس دلہن کے ساتھ چرچ سے سیدھا ہوٹل میں چلا گیا۔

سوزن رونے لگی لیکن ایرک نے اسے سنبھالا۔

"آج ان کی پہلی رات ہے سوزن... یہاں دو ہی کمرے ہیں... میں جانتا ہوں، تو نے بڑے چاؤ سے ان کے لیے کمرہ سجایا ہے، لیکن شاید وہ یہاں اتنے خوش نہ ہوتے جتنا وہ ہوٹل میں ہوں گے۔"

سیدھی سادھی سوزن نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اگلی صبح پیٹر اور مارگریٹ آئے تو سوزن نے مارگریٹ کو گلے لگایا، ماتھا چوما۔ بہت پیار سے ان کا ناشتہ تیار کیا اور لنچ کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ کھانے کے بعد پیٹر نے کہا:

"ماں ہم آج شام ہی ہنی مون پر ہل اسٹیشن جا رہے ہیں۔ چاچا جی نے ہمارے لیے مری میں کمرہ بک کرا دیا ہے، تین دنوں کے لیے۔"

چوتھے روز وہ دونوں واپس لاہور پہنچ گئے۔

مارگریٹ بہت خوش تھی۔ رات کو وہ پنکھے والے کمرے میں پیٹر کے ساتھ اور سوزن، ایرک کے ساتھ صحن میں سوئی۔ ایرک کو رہ رہ کر کھانسی آ رہی تھی۔ اگلی صبح جب ایرک اٹھا تو پیٹر نے اس کے سامنے بیٹھ کر کہا:

"بابا، میں جلد ہی ٹیبل فین یا پیڈسٹل فین خرید لاؤں گا۔" اس نے سوزن کی طرف دیکھا۔

"یہ وعدہ تو تو پچھلے چھ ماہ سے کر رہا ہے پیٹر،" سوزن نے کہا۔

"کیا کروں ماں،" پیٹر نے کہا۔ "شادی اور سیر سپاٹے میں میری اور مارگریٹ کی ساری بچت ختم ہوگئی ہے۔ پر تو فکر نہ کر، جلد ہی انتظام کر دوں گا۔ پھر تو اور بابا چھت پر سو جایا کرنا۔"

"رہنے دے،" ایرک نے کہا، "دو پنکھوں سے بجلی کا بل بڑھ جائے گا۔"

"نہیں بڑھے گا بابا!" پیٹر نے کہا، "میں کس لیے ہوں۔ بیس پچیس روپے سے زیادہ بل آیا تو مجھے کہنا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ایرک نے کہا اور سوزن اٹھ کر باورچی خانے میں جانے کے لیے برآمدے میں چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

''ہو کیوں نہیں سکتا؟'' پیٹر نے کہا۔ ''لائن مین ہوں اس علاقے کا۔ میٹر کو ٹمپر کر دوں گا۔ نہ میٹر تیز چلے گا نہ بل آئے گا۔''

''کیا؟'' ایرک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''چوری کروں گا میں؟''

''او بابا!'' پیٹر نے کہا، ''سبھی کرتے ہیں۔ میں نے چاچے کا میٹر بھی وہاں کے لائن مین سے کہہ کر ٹمپر کرا دیا ہے۔ ایر کنڈیشنر بھی چلائے گا تو بھی بل سو روپے ہی آئے گا۔''

''تو یہ کام کرتا ہے؟'' ایرک نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' پیٹر نے کہا، ''سبھی لائن مین کرتے ہیں۔ تنخواہ میں کہاں گزارہ ہوتا ہے!''

ایرک کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔

''تو چوری کراتا ہے؟'' ایرک نے کہا۔ ''کیا نہیں جانتا کہ چور اور چوری کرانے والا برابر ہوتے ہیں؟ کیا تو نے بائبل میں نہیں پڑھا کہ چور آٹھویں حکم کا توڑنے والا ہوتا ہے؟ اور تو... کیا نہیں جانتا کہ خداوند ہم سے انصاف، راستی اور صداقت چاہتا ہے؟... کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں مر کر جب خداوند کے سامنے جاؤں تو میرے چہرے پر چور ہونے کی کالک ملی ہو؟''

پیٹر، جس نے کبھی بائبل کھول کر بھی نہ دیکھی تھی، سٹپٹا گیا۔

''کیا ساری ایمانداری ہمارے لیے ہی رہ گئی ہے؟'' اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ''مسلمان جو جی چاہے کریں اور ہم بائبل کو سینے سے لگائے ان کا منہ دیکھتے رہیں؟ اسی محلے میں کئی گھروں کے میٹر ٹمپرڈ ہیں۔ اور... رہی حکومت تو اس نے کون سے ہمارے گھر دانے ڈال رکھے ہیں۔ ہم...''

سوزن برآمدے سے کمرے میں آئی اور پیٹر خاموش ہو گیا۔

''ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے،'' سوزن نے کہا۔ اس نے بیٹے کی سب باتیں سن لی تھیں۔ پیٹر غصے سے اٹھا اور بڑبڑاتا باہر چلا گیا۔ مارگریٹ سویرے سویرے اسپتال چلی جاتی تھی۔ رات کی شفٹ کے دنوں میں وہ دوپہر دو بجے تک سوئی رہتی تھی۔ سارا کام کاج بوڑھی سوزن ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ مارگریٹ دن کی شفٹ کے دنوں میں رات کے وقت بہت بیزار رہتی تھی۔

''ایسے کب تک چلے گا ڈیر؟'' ایک رات اس نے پیٹر کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے

Scanned with CamScanner

کہا۔ ''تایا جی کی کھوں کھوں سے میں تنگ آ گئی ہوں۔''

پیٹر کو یوں لگا جیسے مارگریٹ نے اسی کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ وہ اپنی حیاتی زندگی کے لمحوں کو بار بار برباد ہوتے دیکھ کر نالاں رہتا تھا۔

''تو فکر نہ کر،'' اس نے کہا۔ ''بہت جلد ہی میں کرائے کے مکان کا انتظام کرلوں گا۔ کام کاج والی بھی رکھ لیں گے۔''

مارگریٹ شاید اس جملے کی ہی منتظر تھی۔ اگلے ہی دن اس نے باپ سے بات کی اور پندرہ دن کے اندر ہی سرکاری کوارٹرز میں سے ایک خالی ہونے والا کوارٹر پیٹر کے نام ہو گیا۔ پیٹر اور مارگریٹ کوارٹر میں شفٹ ہو گئے۔ ایرک اور سوزن انھیں جاتا دیکھتے رہے۔ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

پیسے کمانے کی ہوس میں پیٹر بہت بدعنوان لائن مین بن چکا تھا۔ وہ جس گھر کا میٹر ٹمپر کرتا، وہاں سے ایک سو پچاس روپے ماہانہ لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے ایک اور سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے علاقے میں کئی محلے تھے۔ ان محلوں کے لڑکے اکثر گرمیوں میں رات کو پارکوں اور گراؤنڈوں میں فلڈ لائٹس لگوا کر کرکٹ میچ کھیلا کرتے تھے۔ پیٹر ایک سو روپے لے کر انھیں اجازت دے دیا کرتا تھا۔ وہ خود ہی لڑکوں کو فلڈ لائٹس لگا دیا کرتا تھا۔

جون کی ایک تپتی دوپہر میں ایرک کے محلے دار لڑکے پیٹر سے ملے۔ وہ رات کو ایرک کے گھر کے سامنے پارک میں کرکٹ کھیلنا چاہتے تھے۔ پیٹر نے سو روپے لے کر انھیں فلڈ لائٹس لگانے کے لیے کنڈیاں تاروں پر ڈال دیں اور سوئچ لگاتے ہوئے کہا کہ میچ رات گیارہ بجے کے بعد شروع کریں۔

ایرک کی طبیعت کئی دنوں سے ناساز تھی۔ اسے وقفے وقفے سے سینے میں دل کے قریب درد محسوس ہوتا تھا جو اٹھ کر لہر سی بناتا ہوا بائیں کندھے سے ہو کر بازو کی سمت جاتا تھا۔ سوزن دوائی لائی تو اس نے الٹے ہاتھ سے سوزن کا ہاتھ پرے کر دیا۔

''رہنے دے سوزن،'' ایرک نے کہا، ''بس کر... دوائی بے اثر ہو چکی ہے۔''

اس نے پہلی بار لاشعوری طور پر اپنی بیماری کو تسلیم کر لیا۔ وہ دونوں پارک کے سامنے والے

Scanned with CamScanner

کمرے میں تھے۔ ایرک پلنگ پر اور سوزن بان کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ بان کی ایک چارپائی صحن میں تھی۔ رنگین پایوں والی یہ چارپائیاں سوزن نے بڑے شوق سے دس سال پہلے بنوائی تھیں۔ سوزن نے پارک کی طرف کھلنے والی کھڑکی ہوا کے لیے کھول رکھی تھی۔ اس نے اپنے پرانے دوپٹے سی کر پردے سے بنا کر کھڑکی پر لٹکا رکھے تھے۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پنکھا اوپر سے لُو نیچے پھینک رہا ہو۔

ایرک کو ڈسکہ یاد آ رہا تھا۔ ڈسکہ میں وہ مچھر دانیاں لگا کر چھت پر سویا کرتے تھے۔ دن چاہے جتنا بھی گرم ہوتا، رات ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھی۔ ایرک کو دھان کے کھیتوں سے آنے والی خنک ہوا یاد آئی۔ ایرک بے خوابی کی کیفیت میں بھی ٹھنڈی خوشبودار ہوا سے بہت سکون محسوس کیا کرتا تھا۔

''سوزن،'' اس نے کہا، ''میں بچپن، لڑکپن اور جوانی کے خواب بھول چکا ہوں۔ مجھے اب یہ بھی یاد نہیں کہ خواب کیسا ہوتا ہے۔''

سوزن نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ''تو سوئے گا تو خواب دیکھے گا،'' سوزن نے کہا۔ ''نیند کے بغیر خواب کیسے آ سکتا ہے؟''

''تو تو ایسے کہہ رہی ہے،'' ایرک ہنسا، ''جیسے نیند میرے اختیار میں ہو۔''

رات کے ساڑھے گیارہ بجے فلڈ لائٹس آن ہوئیں تو کمرہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ باہر لڑکوں میں ٹاس ہو رہا تھا۔ سوزن گھبرا گئی۔ دوپٹے سے بنا ہوا پردہ روشنی روکنے میں ناکام تھا۔ باہر فیلڈنگ کے لیے لڑکوں نے پوزیشنیں سنبھالنی شروع کر دی تھیں۔ شور سا مچا ہوا تھا۔ سوزن رہ نہ سکی، دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

''لائٹ کا منہ دوسری طرف کرو،'' اس نے قریب کھڑے دو لڑکوں سے کہا۔ ''کھڑکی سے پرے ہٹاؤ، سارا کمرہ دن بنا دیا ہے۔''

ایک گورے چٹے چوڑے منہ والے لڑکے نے، جو پوزیشن سنبھالنے دوسری سمت جا رہا تھا، مڑ کر سوزن کو دیکھا۔

''تو نے کھڑکی میں بیٹھ کر کمنٹری کرنی ہے مائی؟'' اس نے بدتمیزی سے کہا، ''بند کر دے۔''

سوزن واپس کمرے میں آ گئی۔ پچھلے کمرے کی سمت گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں

Scanned with CamScanner

موٹا سا کھیس تھا۔ سوزن نے کھیس کھڑکی کے اوپر لگی کیلوں پر لٹکا دیا۔ روشنی تو کم ہو گئی لیکن باہر لڑکوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

''ٹھاہ...'' بیرونی دروازے پر گیند آ کے لگی۔

''تیرا بیڑا غرق ہو،'' سوزن نے بے اختیار کہا۔

وہ باہر جانے لگی تو ایرک نے اسے روکا۔

''وہ تیری کوئی بات نہیں سنیں گے،'' ایرک نے آہستہ سے کہا، ''رہنے دے۔''

اس سے پہلے کہ سوزن کوئی جواب دیتی، گیند پھر آ کر دروازے سے لگی۔ دھماکا سا ہوا، ایرک کے بدن کو جھٹکا سا لگا۔ سوزن غصے میں باہر نکلی۔

''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو؟'' وہ بلند آواز میں بولی۔ ''اندر پیٹر کا باپ بیمار ہے، کیا سونے بھی نہ دو گے؟''

ایک دو لڑکوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ قریب فیلڈنگ کرنے والا لڑکا سوزن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بیمار ہے تو ہم کیا کریں؟'' اس نے کہا۔ ''میچ نہ کھیلیں؟... اسے چھت پہ لے جا۔ باقی سب لوگ بھی تو چھتوں پر سوئے ہوئے ہیں۔''

''وہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا،'' سوزن نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تو ہم کیا کریں؟ اسپتال لے جا،'' لڑکے نے درشتی سے کہا۔ ''میچ تو ہم کھیلیں گے۔ سو روپے لیے ہیں تیرے بیٹے نے فلڈ لائٹس لگانے کے۔''

سوزن بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور روہانسی سی ہو کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے ایرک سے کچھ نہ کہا۔ باہر صحن میں گئی اور پھر واپس کمرے میں آئی۔ اس نے کمرے میں بچھی چارپائی اٹھائی۔

''میں نیچے سو جاؤں گی،'' سوزن نے کہا۔

''کیا کرنے لگی ہے؟'' ایرک نے کہا، لیکن سوزن نے جواب دیے بغیر باہر کا دروازہ کھولا اور چارپائی عمودی انداز میں دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔ چند لڑکے یہ دیکھ کر ہنسے۔ کچھ دیر بعد گیند آ کر چارپائی کے بان پر لگی۔ دھب کی آواز آئی۔ سوزن نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''کیوں جان کھپاتی ہے؟'' ایرک نے کہا، ''وہ نہیں مانیں گے۔''

Scanned with CamScanner

وقت گزر رہا تھا۔ گیند کئی بار بان کی چارپائی پر آ کر لگی لیکن دھماکوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔ لڑکے ہر ہٹ پر شور مچاتے تھے۔ یہ شور ایرک اور سوزن کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ پڑوسی اور وہ لوگ جن کے گھر پارک کے سامنے تھے، چھتوں پر پیڈسٹل فین لگائے سو رہے تھے۔ اونچی منڈیروں کی وجہ سے روشنی بھی انھیں پریشان نہیں کر رہی تھی۔ اگر کچھ جاگ بھی رہے تھے تو خاموش تھے کیونکہ ان کے اپنے لڑکے بھی میچ کھیل رہے تھے۔

اچانک ایک کھلاڑی نے چھکا لگانے کے لیے گیند ہوا میں اچھالی۔ ایک لڑکا کیچ کرنے کے لیے سر اٹھائے گیند کو دیکھتے ہوئے دوڑا۔ گیند سیدھی چارپائی کی طرف آئی۔ لڑکا دوڑتے ہوئے چارپائی سے ٹکرا گیا اور کیچ چھوٹ گیا۔

''اوئے ایہہ عسین مائی اج سانوں جتن نہیں دے گی!'' (او یہ عیسائی بڑھیا آج ہمیں جیتنے نہ دے گی،) وہ غصے سے چلایا۔ پھر اس نے طیش میں چارپائی اٹھائی اور پوری قوت سے زمین پر پٹخی۔ کڑاک کی آواز کے ساتھ چارپائی کا رنگین پایہ ٹوٹ گیا۔ سوزن گھبرا کر باہر نکلی۔ کچھ دیر چارپائی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے چارپائی اٹھائی۔ ٹوٹا ہوا رنگین پایہ، جو ادوائن میں الجھا ہوا تھا، اوپر اٹھ کر پھر گر گیا۔ سوزن چارپائی کو کمرے میں لا کر برآمدے میں لے گئی۔ تین پایوں والی چارپائی کے چوتھے پائے کی جانب بان لٹک گیا۔ سوزن پھر باہر گئی اور ٹوٹا ہوا پایہ لے کر اندر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سیدھی برآمدے میں گئی، ٹوٹا ہوا پایہ چارپائی پر رکھا جو کھسک کر لٹکتے ہوئے بان کی طرف لڑھک گیا۔ سوزن نے صحن میں جا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوا بند تھی۔ وہ برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں آئی، ایک گدا اٹھایا اور صحن میں بچھی چارپائی پر پھیلا دیا۔ پھر دو تکیے لے کر آئی۔ تکیوں کو اوپر نیچے رکھنے کے بعد وہ کمرے میں گئی جہاں ایرک لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔

''چل باہر صحن میں سوتے ہیں،'' اس نے ایرک سے کہا۔ ''کچھ تو ٹھنڈک ہو گی۔''

سوزن نے پنکھا بند کر دیا۔ ہاتھ پکڑ کر ایرک کو اٹھایا اور باہر صحن میں لے جانے کے لیے بازو کا سہارا دیا۔ ایرک کو اپنے بدن میں ناطاقتی کا احساس کئی دنوں سے تھا۔ صحن سے ایک اینٹ اونچے برآمدے سے اترتے ہوئے وہ لڑکھڑایا۔ سوزن اسے سنبھال کر صحن میں لے گئی اور بستر پر لٹا دیا۔

Scanned with CamScanner

''تو کہاں سوئے گی؟'' ایرک نے کہا، ''چارپائی تو لڑکوں نے توڑ دی ہے۔''

''نیچے سو جاؤں گی۔'' سوزن اپنے لیے بھی گدا لے آئی اور فرش پر صحن کی سرخ اینٹوں کے فرش پر بچھا دیا۔ وہ تکیے پر سر رکھنے ہی والی تھی کہ گیند پھر آ کر دروازے پر لگی، دھما کا سا ہوا۔ سوزن پھر اٹھی۔ کمرے میں جا کر اس نے پہلے کھڑکی بند کی، پھر دوسرے کمرے میں آ کر پہلے کمرے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا، پھر برآمدے اور کمرے کے درمیان کھلنے والا دروازہ بھی بند کر دیا۔

''سو جا،'' سوزن نے ایرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کب تک ایک ہی بات کہتی رہے گی!'' ایرک کی نحیف سی ہنسی میں کرب تھا۔

''پانی پیے گا؟'' سوزن نے صحن میں رکھے مٹی کے گھڑے کی طرف دیکھا۔

''نہیں،'' ایرک نے کہا، ''پیاس نہیں ہے مجھے۔''

ایرک اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ گرم رات میں، ہوا کے ایک جھونکے کے بغیر بھی، اس کے بدن پر پسینہ نہیں تھا۔ سوزن بار بار اپنے دوپٹے سے چہرہ پونچھ رہی تھی۔ دروازوں سے شور اندر آ رہا تھا لیکن مدھم۔ بیرونی دروازے پر گیند اب بھی آ کر لگتی تھی لیکن اس کی آواز میں پہلی سی شدت نہ تھی۔ کچھ دیر بعد سوزن کی گہری سانسوں کی آواز سن کر ایرک نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ سوزن پر غنودگی طاری تھی۔ ایرک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

صبح چار بجے، جب بیٹنگ کرنے والے لڑکے جیتنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہے تھے اور ان کا شور پہلے سے کہیں زیادہ تھا، ایرک نے سوزن کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ ایرک کو ڈسکہ میں اپنا سکول یاد آیا۔ سکول کے گراؤنڈ میں ہارمونیم پر اپنی سریلی آواز میں گائے ہوئے گیت یاد آئے، چھوٹی چھوٹی نظمیں یاد آئیں۔ اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ صبح کا تارا عمارت کے پیچھے کہیں روپوش تھا۔ ایرک کے احساس میں کہیں پر بھی کوئی چمک نہ تھی۔ اسے ڈسکہ میں اپنے آبائی گھر کی چھت یاد آئی۔ کھیتوں سے آتے ہوئے خنک ہوا کے جھونکے یاد آئے جن میں دھان کی خوشبو رچی ہوا کرتی تھی۔

''جاگ نہ لدھی آ...''

ایرک نے پنجابی زبان کے صوفی شاعر مادھو لال حسین کی کافی کے بول اپنی کمزور سی آواز

Scanned with CamScanner

میں گنگنانے شروع کر دیے۔

''جاگ نہ لدھی آ[3]

سن جندے میریے

ہنیو وِہانی رات''

(شعور کی بیداری تو تجھے مل نہ پائی... اے میری زندگی سن... پھر بھی مجھے سسکیوں کے ساتھ ہی سہی، تیری اس تاریک رات کو گزارنا تو ہوگا۔)

ایرک بار بار کافی کے بول دہرا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کی آواز اکھڑ گئی۔ وہ زور سے کھانسا۔ سوزن نے کروٹ لی۔ ایرک کو دل کے قریب درد کی ٹیس محسوس ہوئی، اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوے۔ پھر اس کا سانس پھول گیا۔ وہ ایک بار پھر زور سے کھانسا۔ سوزن کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایرک زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے پورے بدن میں تشنج سا ابھرا، گھٹنے اوپر کو اٹھ گئے، کندھے گدّے پر دب گئے۔ سوزن اسے ہانپتا دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھی، مٹی کے گھڑے کی طرف دوڑی۔ مٹی ہی کے پیالے میں پانی بھر کے وہ اتنی تیزی سے اٹھی کہ پیالے کا آدھا پانی چھلک گیا۔ ایرک کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز تھی کہ قریب آنے پر سوزن کو دھک دھک کی آواز سنائی دی۔

''ایرک... ایرک...'' وہ چیخی۔

ایرک کی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے سوزن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھیانک خوف تھا۔ اس نے تکیے سے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کا بایاں ہاتھ دل کے قریب زور سے دبا ہوا تھا اور دایاں ہاتھ سوزن کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ سوزن نے پانی والا پیالہ دائیں ہاتھ میں پکڑ کر بائیں بازو کو ایرک کی گردن کے پیچھے لے جانے کی کوشش کی لیکن ایرک تھوڑا سا اٹھ کر پھر چیخ کر بستر پر گرا، اس کا سر تکیے پر دب گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے نرخرے سے خرر کی آواز

---

[3] پنجابی زبان میں لفظ جاگ کے دو مفہوم ہیں۔ ایک اثر پذیری اور دوئم جاگرتی یعنی شعور کی بیداری۔ پہلا مفہوم عومی ہے۔ جیسے عورتیں رات کے وقت دودھ میں تھوڑا سا دہی ڈال کر صبح دہی بلوتی ہیں۔ دوسرا مفہوم معنویت رکھتا ہے اور اس کا تعلق داخلیت سے ہے۔

Scanned with CamScanner

ابھری جیسے بلغم اس کے حلق میں پھنس گئی ہو، اور دوسرے ہی لمحے اس کا سر ایک سمت ڈھلک گیا۔

سوزن کے ہاتھ سے پیالہ گر گیا۔

وہ کچھ لمحے اسے بے حس و حرکت دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے ایرک کے نتھنوں پر سانس کا اندازہ لگایا، پھر سینے پر ہاتھ رکھا، پھر نبض دیکھی۔ ایرک کی نبض اس کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی طرح ختم ہو چکی تھی۔

سوزن پر سکتہ طاری تھا۔

ساڑھے پانچ بجے سوزن کے رونے کی آواز سن کر ہمسائی نے چھت سے نیچے جھانکا اور پھر تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر، گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر سوزن کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سوزن کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر جیتنے والی ٹیم کے لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ہمسائی نے ایرک کے مرجانے کی خبر پر چند رسمی تعزیتی جملے کہے اور پھر ہمدردی کے طور پر ایرک کے بیٹے پیٹر کا فون نمبر مانگا۔ سوزن کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے سیموئیل کا نمبر دے دیا۔ ہمسائے سے دو مردوں نے آ کر ایرک کی چارپائی اٹھائی اور کمرے میں لا کر ایرک کو کندھے اور پیروں سے پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا۔ چارپائی دوبارہ صحن میں چلی گئی۔ ہمسائی کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ پنکھا چلا گئی۔

سات بجے کے قریب، جب سوزن دوپٹے سے سر باندھے، پلنگ کی پائینتی کمرے کے فرش پر بیٹھی تھی، زور سے بیرونی دروازہ کھلا۔ پیٹر بدحواسی کے عالم میں کمرے میں آیا۔ اس کے پیچھے سیموئیل، رانی اور مارگریٹ بھی تھی۔

"کیا ہوا... کیا ہوا بابا کو؟" پیٹر نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ سیموئیل، رانی اور مارگریٹ نے بھی تقلید کی۔

"مجھے فون کیوں نہیں کیا... ماں؟"

پیٹر پلنگ کی طرف قدم اٹھانے ہی لگا تھا کہ سوزن نے دایاں ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"رک جا!" سوزن نے قہر آلود نگاہوں سے پیٹر کو دیکھا۔ "یہ کسی لائن مین کے باپ کی میت

Scanned with CamScanner

نہیں ہے۔ یہ تو ایک غریب، بیمار، بوڑھے سکول ماسٹر کی لاش ہے جس نے برسوں تک خواب کا انتظار کیا ہے... اسے اب تو سونے دے۔"

❁❁

Scanned with CamScanner

٦٨

قیمت

٢٦٠ روپے

آج کی کتابیں

٣١٦ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ٧٤٤٠٠

Scanned with CamScanner